۱

اردو ادب

مکتبہ جدید

شفیق الرحمٰن



زندگی ایک تاریک گھٹا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس میں سنہرے رنگ بھی جھلکتے ہیں جو حساس انسان کیلئے مسرّت کا پیغام لاتے ہیں۔

شفیق الرحمٰن نے بھی تاریکی سے رنگ پیدا کئے ہیں۔ زندگی کے جاں گداز غم نے ان کے بلند تخلیقی جذبات کو مضمحل نہیں کیا۔

اگر آپ واقعی پھولوں کی مہک، ندیوں کی روانی، پرندوں کی چہک اور دن رات کے بدلتے ہوئے رنگوں کی پُرفسوں حقیقت کو سمجھتے ہیں۔ تو شفیق الرحمٰن کے ادب کی عظمت کو بھی محسوس کر سکیں گے جس میں زندگی ہے فلسفہ ہے اور رومان ہے لیکن لطیف مزاح کی سنہری لہر نے اسے عظیم تر بنا دیا ہے۔

کرنیں ۔ یہ افسانے ایک سہانے خواب کی مانند ہیں۔ جس میں پڑھنے والے زندگی کے پیارے اور ناقابلِ فراموش لمحوں کو جھلکتا پائیں گے۔

شگوفے ۔ اس کتاب کے ساتھ مصنّف کا "شیطان" نازل ہوا۔

لہریں ۔ مزاح کی لہریں آتی ہیں اور طنزِ لطیف کے سنگریزوں سے کھیل کر انہیں زندگی کی سنہری دھوپ میں چمکنے کے لئے چھوڑ جاتی ہیں۔

مدّوجزر ۔ رومان کے جھلملاتے نقاب کے پیچھے آپ موجودہ زندگی کی تلخیوں کو پوشید پائیں گے۔

پرواز ۔ اس مجموعے میں شگفتہ افسانے ہیں، پیروڈی ہے۔ اور شیطان کا ہمراز "بڈی" بھی۔

حماقتیں ۔ وہ جو اس قسم کی کتابوں کو پسند کرتے ہیں۔ اس کتاب کو بالکل ویسی ہی پائیں گے جیسی کتابوں کو وہ پسند کرتے ہیں۔

زیرِ طبع ۔ **منزل**

نئے اور خوش نما ایڈیشن ۔ سب کی ایک جیسی خوبصورت جلدیں

مکتبہ جدید لاہور

اردو ادب

(۱)

مرتب
سعادت حسن منٹو
محمد حسن عسکری

ناشر
مکتبہ جدید
کراچی ● لاہور

فہرست

مضامین

نظم

طنز و مزاح

دین محمدی پریس کراچی میں باہتمام
رشید احمد چودھری صاحب کے مطبوعہ
... کراچی
سے شائع ہوا



قلم قتلے

قائد اعظم محمد علی جناح

کراچی میں ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء بروز کرسمس پیدا ہوئے۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۷ء بروز ہفتہ کراچی میں وفات پائی ساری زندگی مسیحائی کرتے رہے ؎

چناں بزی کہ اگر مرگ ماست مرگ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

اختر شیرانی

۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کو بے ہوشی کے عالم میں میو ہسپتال میں وفات پائی ......آخری الفاظ ؎

ہو گئی بزم میکدہ خاموش — اب ؟

ڈاکٹر سعید اللہ

ایم - اے ، ایل ایل - بی ، پی ایچ - ڈی ، ڈی - ایس سی

عزیز احمد

تصور شیخ ؎ کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے !

فراق گورکھپوری

عشق و محبت کا گورکھ دھندا

کنھیا لال کپور

؎ دل ہی تو ہے نہ "سنگ و خشت" درد سے بھر نہ آئے کیوں

احمد ندیم قاسمی

نقوش لطیف، نقوش — اب نقش فریادی

غلام عباس

غلام عباس عرف "آنندی" - "پھول" سے نکلے "آھنگ" میں پہنچے ؎

گلوں سے خار بہتر ہیں کہ دامن تھام لیتے ہیں

میجر شفیق الرحمان

سیلوٹ! — بہت اچھا کیا جو شیطان پیدا کر دیا ؎

مزی اندر جہان کور ذوقے - کہ یزداں دارد و شیطاں نہ دارد

رائٹ ٹرن! — مگر وہ جبریل سے کب کہے گا -

میں کھٹکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح - تو فقط اللہ ھو، اللہ ھو، اللہ ھو

مختار صدیقی

شاعری کی ٹوڈی - ("ٹوڈی بچہ ھائے" نہیں)

قرۃ العین حیدر

بے حد رنجیدہ ہو کر اور بے حد بے تکلفی کے ساتھ تقریباً چلا کر کہنا پڑتا ہے کہ خود رو زرد پھولوں کے ڈھیر، پھدکتی ہوئی گلہریاں، نیلی نیلی جھیلیں، ہری ہری گھاس پر شکیل ٹڈے، چوکولیٹ، کیک، پریاں، جنگلی طوطے اور خرگوش دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں - دل ٹوٹ گیا ہے - لاکھوں کے بول سہے، ایک یہ بھی سہی -

کرتار سنگھ دگل

اس پار کے ساتھی!!

آفتاب احمد

چوکفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمانی

شوکت تھانوی

جیتے رہو - آفرین صد آفرین - اردو عبارت لکھنے کا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے - سنو دلی کے تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے - یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی سو ایک ظالم تھانے کا رہنے والا لوٹ لے گیا مگر میں نے بھی کہا اللہ برکت دے -

شائع ہونے سے پہلے ہی ''نیا ادب'' بمبئی نے شائع کر دیا ہے

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

ایک کتبہ

ساتِ مہینے تک کال کوٹھڑی میں قید رہنے سے ''اردو ادب'' تو جاں بحق نہ ہوا - لیکن افسوس ہے کہ ''اردو ادب'' کی چند نظمیں اشاعت کی صبر آزما تعویق کے باعث دوسرے پرچوں میں انتقال کر گئیں ہے انا للہ و انا الیہ راجعون -

عذر گناہ

''اردو ادب'' شائع ہونا تو دور رہا - ابھی پوری طرح مرتب بھی نہیں ہوا تھا کہ دنیائے ادب میں ایک افسانہ بن گیا - کسی کو خطرہ پیدا ہوا کہ رجعت پسندوں کا محاذ بن رہا ہے - کسی کو دھڑکا ہوا کہ یہ کوئی پیری مریدی کا سلسلہ ہے - کسی کو پتہ چلا کہ یہ رسالہ پاکستان کی حکومت کا ایجنٹ ہوگا۔ اسی رسالے کے دم سے اردو میں ایک نئی صنف ادب ''کھلے خط'' کا اضافہ ہوا - غرض لوگ طرح طرح سے کھلے - البتہ ان حضرات کی ایک بات تو سچی نکلی - کم سے کم پنجاب کی حکومت نے ضرور اس رسالے پر نظر عنایت فرمائی - خیر یہ تو ہمیں معلوم تھا کہ ''ساقی'' شائع کرنے کی اجازت حاصل کرنے کے لئے شاہد احمد صاحب کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے - مگر ہم نے ان کے تجربے سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا - اور یہی سمجھتے رہے کہ زیادہ سے زیادہ دیر ہوگی - اندھیر تو نہیں ہوگا - ہم نے کہیں جون ۴۸ء میں کام شروع کیا تھا - لیکن جب چھ مہینے ہونے کو آئے اور مرتب شدہ پرچے میں رکھے رکھے پھپھوندی لگ گئی - تو حکومت کے دفتر نے ''جلد'' اجازت دینے کا جو وعدہ کیا تھا وہ شرمندۂ تکمیل ہوتا نظر نہ آیا - تھک ہار کے ہم نے کراچی سے رجوع کیا - اور گھنٹے بھر کے اندر اندر اجازت حاصل کر لی - پنجاب کی حکومت کو یہ بے صبری اور بے اعتباری ناگوار گزری اور پرچے کا جو حصہ لاہور میں چھپ چکا تھا - اسے پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیا - اس کے بعد چھ مہینے اور گزر گئے - نہ تو ہمیں یہ بتایا گیا کہ آخر یہ کس گناہ کی پاداش ہے - نہ مقدمہ چلایا گیا - ہم مختلف ''سرکاروں'' میں عرضیاں گزرانتے پھرے - مگر وہ کان ہی

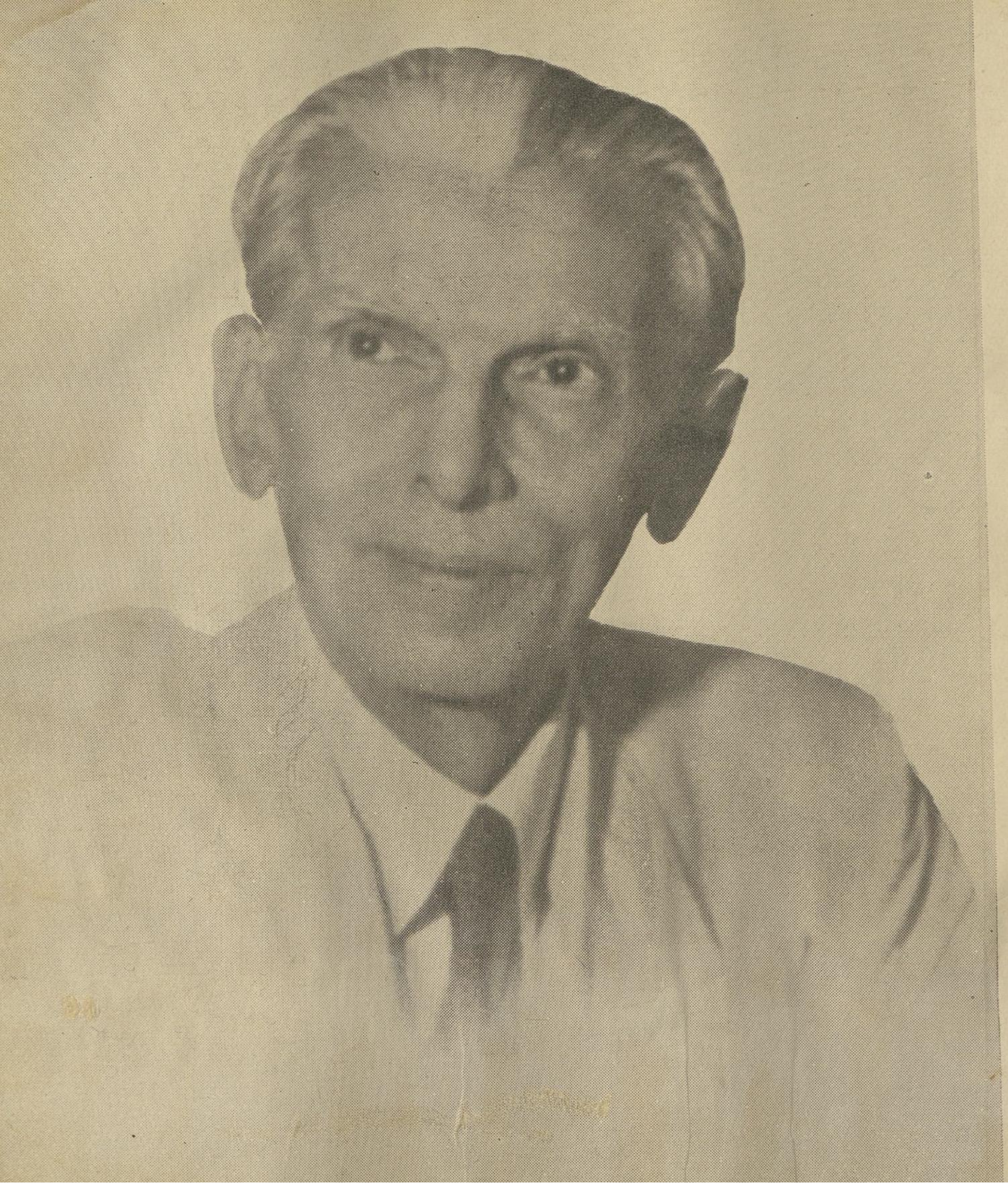
نہ نکلے جن پر "اردو ادب" کی جوئیں رینگ سکتیں خدا خدا کر کے عدالت میں مقدمہ پیش ہوا اور چالیس روپیہ جرمانہ بھرنے کے بعد ہمیں پتہ چلا کہ ہمارا جرم یہ تھا کہ ہم نے لاہور سے اجازت لئے بغیر پرچہ "شائع" کر دیا تھا - یہ ہم ابھی تک نہیں سمجھ سکے کہ "چھپوانا" اور "شائع" کرنا کب سے مترادف الفاظ ہو گئے ہیں - کوئی نیا اور سیکنڈ پبلشر ہوتا تو ایک بات بھی تھی - مگر جو پبلشر کئی سال سے کتابوں کا کاروبار کر رہا ہو - اور قاعدے قانون سے تھوڑی بہت بھی واقفیت رکھتا ہو وہ اجازت لئے بغیر رسالہ شائع کرنے کی جراءت کر ہی نہیں سکتا - بہر حال جو کچھ ہوا سو ہوا - ہمیں نہ تو شکایت ہے نہ رنج نہ غصہ - ادب کے راستے میں ایسے روڑے ہمیشہ آتے رہے ہیں - نہ اس چھوٹے سے واقع سے ہماری بنیادی پالیسی میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے - ہم رجعت پسند ہیں - یا سرمایہ داروں کے ایجنٹ ہیں - یا خود پرستی کے مبلغ ہیں - یا کیا ہیں - یہ سب ہمارا پرچہ بتائے گا -

اردو ادب کا عام نمبر

خاص باتیں کرنے کو اب جی نہیں چاہتا - طبیعت کھٹی ہوگئی ہے اس لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ دو ماہی "اردو ادب" کا دوسرا شمارہ "عام نمبر" ہو - ہم انتہائی کوشش کریں گے کہ اس میں کوئی بھی "خاص" چیز شائع نہ ہو - امید ہے آپ داد دیں گے -

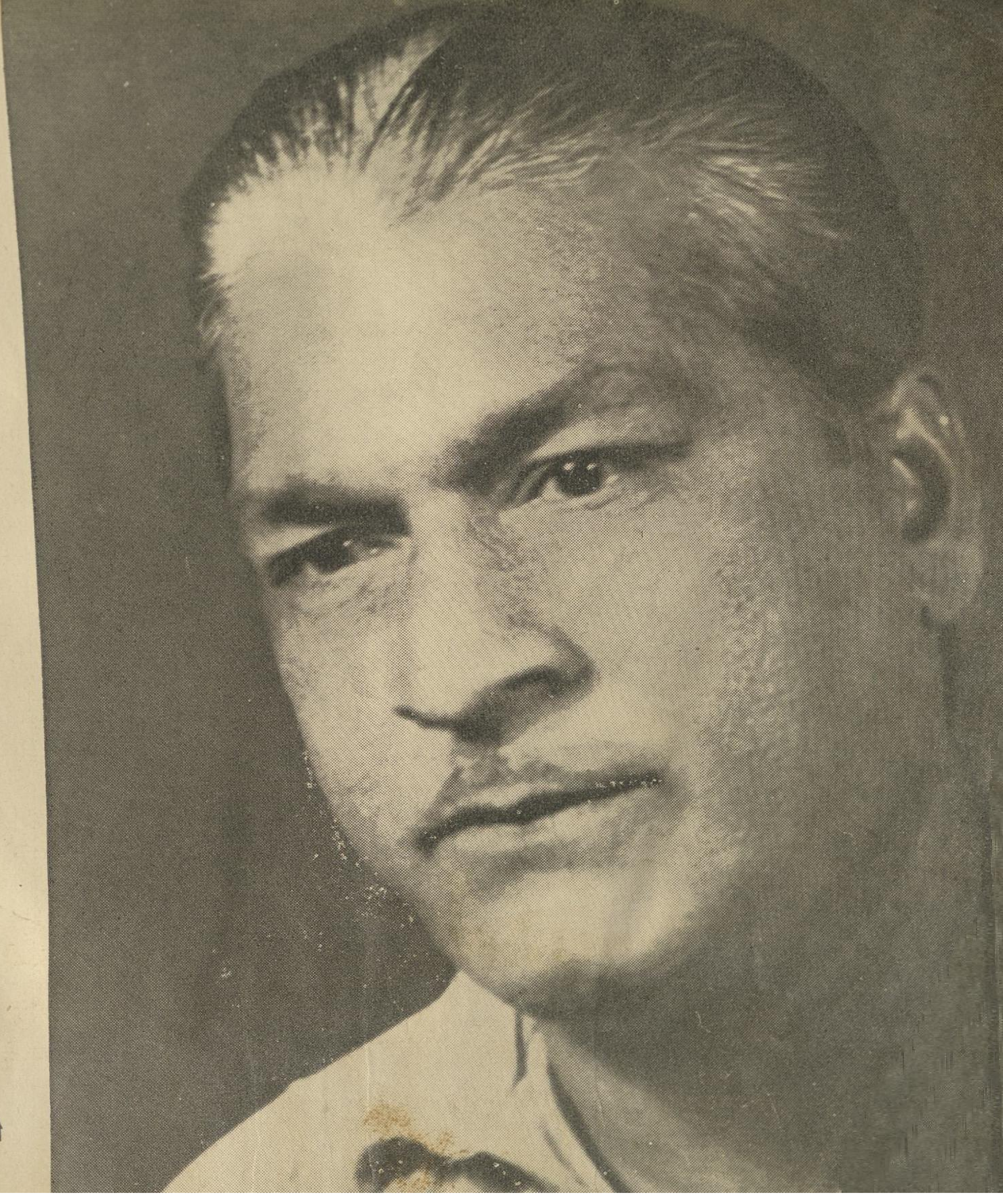
سعادت حسن منٹو

محمد حسن عسکری



قائد اعظم محمد علی جناح

اردو ادب نمبر ۱



اختر شیرانی

اردو ادب نمبر ا

قائدِ اعظم محمّد علی جناح

قائدِ اعظم ہمارے درمیان سے اٹھ گئے ہیں تو ہمیں اُن کے احسانات ایک ایک کر کے یاد آ رہے ہیں۔ جب ہم اپنے آپ کو بالکل بے یار و مددگار سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے آ کر ہمیں چمکارا، دلاسا دیا، ہماری منتشر قوتوں کو جمع کیا، ہمارے سامنے ایک مطمحِ نظر رکھا، ہمارے اندر اُس کی محبت اور اس کے لئے جدوجہد کرنے کا حوصلہ پیدا کیا، اور آخر ہمارے خوابوں کو حقیقت کر دکھایا۔ لیکن ان کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے احساسِ خودی کو جو بالکل مرنے کے قریب تھا (بلکہ قوم کے ایک چھوٹے سے طبقے میں تو مر بھی چکا تھا) از سرِ نو زندہ ... کیا، اور ہماری قومی شخصیت کو ایک نئی توانائی دی۔ در اصل جس دن ہم نے سمجھ لیا کہ ہم مسلمان ہیں، مسلمان ہونا کوئی شرم کی بات نہیں ہے اور مسلمان کی حیثیت سے ہمارے کچھ سیاسی معاشی اور تہذیبی حقوق بھی ہیں جن کیلئے ہم جائز طور پر لڑ سکتے ہیں اسی دن ہماری منزل آ گئی تھی۔ اسی دن پاکستان بن گیا تھا۔ جس دن ہم اپنے اوپر ایمان لے آئے اسی دن ہمارے خواب حقیقت سے زیادہ حقیقی بن گئے تھے۔

اور یہ سب اقبالؔ اور جناح کے طفیل ہے۔ اقبالؔ سے کہیں زیادہ جناح کے طفیل، کیونکہ اقبالؔ کا اثر ایک محدود طبقے تک تھا جس میں بذاتِ خود اپنے آدرش کے لئے جدوجہد کرنے اور قربانیاں دینے کی صلاحیت نہیں تھی۔ اس کے برخلاف جناح کا تخاطب براہِ راست عوام سے تھا، اور عوام تک ان کی پہنچ بھی تھی۔ متوسط طبقے کے بہت سے لوگ شاید جناح کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے کچھ دن ہچکچائے بھی ہوں، مگر مسلمان کسانوں اور مزدوروں نے شروع ہی سے انہیں اپنا قائد تسلیم کر لیا۔ کم سے کم اقلیتی صوبوں میں تو ۳۵ء ہی کے ضمنی انتخابات میں یہ منظر دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ گاؤں سے رائے دینے آئے ہیں، پھٹے کپڑے، چہرے پر گرد، ہڈیاں نکلی ہوئی۔ مخالفوں کی طرف سے آوازوں پہ آوازیں پڑ رہی ہیں کہ جناح تو تمہیں بس سبز باغ دکھاتے رہے گا، ادھر آؤ، یہاں تمہیں روٹی ملے گی۔ مگر یہ ہیں کہ ان کی طرف دیکھتے تک نہیں۔ ان لوگوں نے زیادہ زبردستی کی اور ہاتھ پکڑ کے اپنی طرف مخاطب کرنا چاہا تو صاف صاف کہہ دیا کہ ہمیں اس طرح روٹی چاہیئے ہی نہیں، قوم کی عزت بیچ کے روٹی نہیں لیں گے۔ اور یہ محض ڈینگ نہیں تھی۔ ایک دو دن نہیں پورے دس سال تک یہ لوگ جناح کے نامزد کئے ہوئے نمائندوں کی اسی حوصلے کے ساتھ حمایت کرتے رہے۔ دوسروں میں اتنی ہمت اور اتنا یقین پیدا کرنے کے لئے آدمی کے اندر خود بے پناہ یقین اور ایمان چاہیئے۔

اور یہ ایمان جناح کے اندر اس وقت پیدا ہوا جب مسلمانوں کی ظاہری حالت دیکھتے ہوئے اس کی گنجائش بہت کم تھی۔ ہزیمت خوردگی، مایوسی

اور بیچارگی بھی بہت بڑی قومی مصیبتیں ہیں، مگر ذرا اس قوم کی حالت پر غور کیجیے جس کے پاس کوئی آدرش رہا ہی نہ ہو ——— تعمیر کی حسرت ہو، شاید تعمیر کا حوصلہ اور تعمیر کی صلاحیت بھی ہو، مگر یہ پتہ نہ ہو کہ ہمیں عمارت کیا بنانی ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ اس سے بھی بڑا حادثہ یہ ہوا تھا کہ عوام میں اپنی شخصیت اور انفرادیت کا احساس، اسے برقرار رکھنے کی تمنا، ایک خاص قسم کی اجتماعی زندگی کا تصور، ماضی کی یاد اور مستقبل کا دھندلا سا خواب تو موجود تھا؛ مگر مسلمانوں کے اہل فکر طبقے کے بہت سے لوگ ان چیزوں سے بھی عاری ہو چکے تھے یا ہوتے جا رہے تھے۔

ایسے زمانے میں جناح نے اٹھ کر مسلمانوں کو یاد دلایا کہ تمہاری پشت پر تیرہ سو سال کی تاریخ ہے، روایت ہے، ایسا ماضی ہے جس سے نہ تمہارا حال دامن بچا سکتا ہے نہ مستقبل؛ تمہارے ماضی نے تمہیں ایک منفرد شخصیت، ایک مستقل تصورِ حیات دیا ہے جسے زندہ رہنے کا حق ہے، جسے زندہ رہنا چاہیئے، اور جو زندہ رہ سکتا ہے۔

یہ سب سے ضروری اور عظیم بات تھی جو جناح نے ہمیں سمجھائی ——— یہی کہ ہماری قومی شخصیت زندہ رہ سکتی ہے۔ اجتماعی شخصیت کا احساس تو اور سیاسی رہنماؤں کو بھی تھا، اسے برقرار رکھنے کی آرزو بھی تھی، مگر کوئی دوسرا آدمی اس کی اہلیتوں پر ایسا ایمان نہیں رکھتا تھا۔ جو کام جناح نے کیا ہے اس کے لیے خالی ذہانت، سیاست دانی، تدبر یا ہمت سے کام نہیں چلتا۔ کسی چیز کو بچانے کے لیے یہ سب باتیں لازمی تو ہیں، مگر سب سے پہلے اس یقین کی ضرورت ہے ——— اندھے یقین کی ضرورت ہے ——— کہ ہاں، یہ چیز بچائے جانے کے قابل ہے اور اپنے اندر بچنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جناح نے اس یقین کا مظاہرہ بار بار کیا، اور ایسے ایسے موقعوں پر کہ جب خود ان کے ساتھیوں کا دل ڈوب چکا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد جب قتل عام شروع ہوا، اور پناہ گزین لاکھوں کی تعداد میں آنے لگے، اُدھر یہ حال کہ اپنے پاس نہ روپیہ نہ سامان، اُوپر سے ہر وقت حملے کا دھڑکا۔ اچھے اچھوں کے اوسان خطا ہو گئے، اور ذمے دار سے ذمے دار آدمی کہنے لگے کہ بس اب پاکستان ختم ہوا۔ مگر ایک جناح تھا جو برابر یہی کہے جا رہا تھا کہ نہیں، جس چیز کی بنیاد عوام کی عقیدت اور محبت پر ہو وہ کیسے ختم ہو سکتی ہے۔ اس عالمگیر مایوسی اور بددلی کے وقت بھی انہیں خود ہماری بے یقینی پر شک تھا، اور وہ ہم سے پوچھ رہے تھے: "کیا ہم دل شکستہ ہیں؟ ہرگز نہیں ...... سات کروڑ کی ایک متحد قوم کو جس کی پشت پر ایک عظیم تہذیب اور تاریخ ہو، کسی چیز کا کیا ڈر ہو سکتا ہے۔"

قوم کے مستقبل پر ایسا یقین یا تو جناح کو تھا یا پھر عام مسلمان کو۔ یوں دیکھنے میں تو وہ عام آدمیوں سے بہت مختلف تھے، مگر ان کا ہاتھ عام آدمی کی نبض پر تھا، وہ اس کے دل کی دھڑکن اچھی طرح پہچانتے تھے۔ جب مسلمانوں کے اکثر سیاسی اور ذہنی رہنما پوری مسلمان قوم کو اتحاد و اتفاق سے بیگانہ، فکر و عمل کی صلاحیتوں سے عاری اور فی الجملہ از کار رفتہ سمجھ چکے تھے، انہوں نے خودی اور قومی شعور کی دبی ہوئی چنگاری کو دیکھ ہی نہیں لیا، بلکہ راکھ کے ڈھیروں کو ہٹا کر اُسے دہکایا اور آخر شعلہ جوالہ بنا کر چھوڑا، یہ درست ہے کہ وہ ہماری قومی شخصیت کی تفصیلات سے واقف

نہیں تھے، مگر انہیں اس کے علیحدہ اور مستقل وجود کا بڑا گہرا احساس تھا۔ غالباً وہ مسلمانوں کے ادب و شعر کے بارے میں مضمون نہیں لکھ سکتے تھے، مگر انہیں یہ معلوم تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی روح نے ایک خاص ادب کی شکل میں اپنے آپ کو ظاہر کیا ہے۔ غرض کہ انہیں مسلمان قوم کی پرکھ خوب تھی۔ اگر ہمیں اس موقع پر ایسا جوہری نہ مل جاتا تو ہمارے اجتماعی وجود کا زندہ بچنا محال تھا۔ بلکہ یہ ہماری قوم کی زندگی کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ ہم نے اپنے تاریک ترین دور میں اقبالؔ اور جناح جیسے یقین کے مجسمے پیدا کئے۔ دراصل اقبال اور جناح دونوں ایک دوسرے کا ضمیمہ ہیں۔ جو اقبالؔ نے سوچا وہ جناح نے کر دکھایا۔ اقبال کے تصورات کی تجسیم جناح کی شکل میں ہوئی۔ انہیں دونوں نے مل کر قوم کی خودی کو از سرِ نو تخلیق کیا۔

چونکہ جناح کا دل قوم کے دل کے ساتھ دھڑکتا تھا، اس لئے قوم نے ان کو اس طرح اپنا سمجھا کہ دنیا کی تاریخ میں بہت کم رہنماؤں کو ان کی قوم نے اس طرح اپنا سمجھا ہوگا۔ نہ تو وہ عوام کے سے کپڑے پہنتے تھے، نہ ان کے طور طریقے عوام کے سے تھے، وہ تو ٹھیک طرح اردو بھی نہیں بول سکتے تھے۔ مگر عام آدمیوں کی عقیدت کا یہ حال تھا کہ انہیں اپنا سب سے بڑا ہمدرد اور غم خوار سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ انہیں یہ محسوس ہوتا تھا جیسے قائدِ اعظم براہِ راست ان کے ذاتی معاملات سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ میں نے ایک پھیری والے کو دیکھا جسے پولیس والوں نے تنگ کیا تھا۔ وہ اپنی درخواست میں ان کی شکایتیں لکھوا رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا کہ خیر، یہاں تو درخواست دیئے دے رہا ہوں، مگر کسی طرح جناح صاحب کو پتہ چل جائے تو سب کام ٹھیک ہو جائے۔ اور یہ حال تو اس وقت تھا کہ جب جناح نے لفظ "عوام" کو جا و بیجا استعمال ہی نہیں کیا۔ مگر سوزِ دروں نے، دل کے درد نے فتح پائی، اور جناح کی روح نے ظواہر کی دیواریں توڑ کر براہِ راست عوام پر اثر کیا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ ہماری قوم نے بڑی مردم شناسی کا ثبوت دیا۔ قوم نے ہمیشہ جناح کے دل کو دیکھا، کپڑوں کو دیکھا ہی نہیں۔

قوم پر یقین اور ایمان کے علاوہ جناح میں ایک اور بات ایسی تھی جو اقبالؔ کے سوا ہمارے زمانے کے کسی اور شاعر یا ادیب کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔ یعنی ایک عظیم خیال پر پورا اعتقاد۔ "ہندوستان ٹائمز" نے تو ان کی وفات کے بعد شاید طنزاً لکھا ہے کہ ان میں ایسی قوتِ ارادی تھی جو حقیقتوں کو توڑ پھوڑ کر خوابوں کو حقیقت بنا سکتی تھی، مگر اس سے زیادہ جناح کی تعریف اور کیا ہو سکتی ہے۔ جب انہیں ایک مرتبہ یقین آ گیا کہ یہ ایک عظیم خیال ہے تو پھر وہ مادی رکاوٹوں کو خاطر ہی میں نہ لاتے تھے۔ جناح کا شمار یقیناً انسانی تاریخ کے عظیم تصور پرستوں میں ہوگا۔ محض ایک تصور کی بنیاد پر اپنے آپ کو تخلیق کے لئے آمادہ کرنا، ایک پوری قوم کے اندر تخلیقی جذبہ ابھارنا، نفی کو اثبات میں تبدیل کرنے کا خیال دل میں لانا ——— ان چیزوں کے لئے ایک بڑے شاعر کی شخصیت اور تخیل کی ضرورت پڑتی ہے۔ عام قسم کا آدمی تو ایسے تصور کے بوجھ ہی سے پس کے رہ جائے۔ جناح کی شخصیت اور اس کے کارنامے کو شاعر کے تخیل سے بھڑانا محض شاعری نہیں ہے۔ جناح واقعی اہلِ جذب اور اہلِ جنوں میں سے تھا، بس اتنا ہی تو ہے کہ وہ از خود رفتہ نہیں ہوا۔ اس نے درویش صفت باش و کلاہِ تتری دار کی سب شرائط پوری کر دیں۔ ویسے بھی دیکھئے

تو بہت سے لوگ جناح کے کارنامے پاکستان کو آج تک شاعری سمجھے جا رہے ہیں۔

عمر بھر لوگ جناح کو "وکیل" اور "سیاست داں" کہہ کر بدنام کرتے رہے۔ اُن کے دل کی لگن کسی نے نہ دیکھی۔ مگر اپنی تخلیق کی اصلیت کو سمجھا بھی خود اُنہیں نے، اور اس کی طرف اشارہ بھی کیا۔ پاکستان وجود میں آنے سے پہلے بھی اُن کے لئے ایک عظیم تصور تھا، اور وجود میں آنے کے بعد بھی ایک عظیم اور مقدس تصور رہا۔ پاکستان بننے کے بعد اُنہوں نے اس کی تعریف یوں پیش کی کہ پاکستان جغرافیائی حدود سے عبارت نہیں ہے، یہ تو چند انسانی تصورات کا نام ہے۔ کم سے کم اُن کی نظر میں پاکستان کی بنیاد تنگ دلی، تعصب اور خود پرستی پر نہیں تھی۔ اُنہوں نے اعلان کیا کہ پاکستان بننے سے انسانی روح ذات پات کی زنجیروں سے آزاد ہو گئی ہے، اور اس آزادی کا مقصد یہ ہے کہ اُس رُوح کی صلاحیتیں ترقی کی منزلیں طے کرنے میں صرف ہوں۔ یہ تھا اُن کے ذہن میں پاکستان کا تصور۔ اور وہ اسی کو عملی شکل دینے کے لئے آخری سانس تک کام کرتے رہے۔ پہلے انہوں نے ایک خواب دیکھا تھا، اُسے اپنی مسلسل جد وجہد سے زندہ حقیقت کر دکھایا۔ اب اُنہوں نے دوسرا خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر اُن کی نظروں کے سامنے نہ آ سکی۔ مگر وہ ہمیں بتا گئے کہ زندہ قوم کے عزائم کیا ہونے ہیں اور اُن کے لئے کس طرح کام کیا جاتا ہے۔

کیا ودانے نے موت پائی ہے!

اُن میں دُنیا سے، دنیا والوں کی رائے سے، دنیاوی علائق سے فن کاروں کی سی بے نیازی تھی، اور تخلیق کے لئے جس صبر و استقلال اور مسلسل کاوش کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی موجود تھی۔ ایک بڑے فن کار کی طرح انہیں معلوم تھا کہ تخلیق اور شخصیت میں کتنا فصل ہونا چاہئے۔ ذاتی زندگی میں اُنہوں نے اپنے اوپر جو تنہائی مسلط کر لی تھی اس کی مثال ادب اور فلسفے کی دنیا سے باہر مل ہی نہیں سکتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اُنہیں جینے کے لئے بس ایک عظیم تصوّر ہی کا سہارا کافی تھا۔ جب میں جناح کی ذاتی زندگی کا نقشہ ذہن میں جمانا چاہتا ہوں۔ تو ایسا نظر آتا ہے جیسے کوئی عظیم سنگ تراش ان گھڑ اور بے ڈول مادّے کو کانٹ چھانٹ کر ایک نئی اور بے مثال ہیئت تخلیق کرنے کی دُھن میں کھویا بیٹھا ہو۔ اُنہوں نے اپنی ذات کو اپنی تخلیقی جد وجہد سے اتنا علیحدہ رکھا تھا، بلکہ اُسے اپنے تخلیقی جذبے میں اس طرح حل ہو جانے دیا تھا کہ ان کا کارنامہ ہی اُن کی سوانحِ عمری بن گیا ہے۔ اُن کی زندگی میں ایسا ضبط و نظم، ایسا ٹھہراؤ، ایسا تسلسل، ایسی ہم آہنگی، ایسی نشو و نما، ایسا تدریجی عروج ہے کہ وہ بذاتِ خود ایک کلاسیکی نظم معلوم ہوتی ہے۔

جناح کا کارنامہ جناح سے الگ نہیں ہے۔ پاکستان زندہ ہے تو جناح زندہ ہے۔ مگر بشریت کا تقاضا ہے کہ ہمیں جسمانی حیثیت سے جناح کے نہ ہونے پر پھر بھی رنج ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اور بھی کہ جس رُوح کو جناح نے عوام کے ساتھ مل کر آزاد کرایا تھا اب اُس کی

تخلیقی جد وجہد پہلے سے ہزار گنا مشکل ہو جائے گی۔ جن انسانی تصورات کا نام پاکستان تھا اُن کا بہترین پاسبان جناح تھا۔ اُن اقدار کی حفاظت تو خیر اب ہم سب کو مل جل کر کرنی ہی پڑے گی، اور اپنی اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے جناح کا کام آپس میں بانٹنا پڑے گا۔ مگر جناح کے سے آہنی عزم اور ایمان کے بغیر ہم کتنی کمزوری محسوس کریں گے۔ بہر حال جناح کو ہم پر یقین تھا۔ اور جناح کا یہ یقین ہی ہمیں ہمیشہ تقویت پہنچاتا رہے گا۔

ہماری تقویت کے لئے اس سے بھی ایک بڑی چیز موجود ہے جسے جناح نے ہمیں بار بار یاد دلایا ہے — ہماری تاریخ اور ہماری روایت۔ جب قائد اعظم کے سوگ میں ریڈیو پاکستان سے قرآن کی تلاوت ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے جناح کی موت تیرہ سو سال کی تاریخ سے ملا دی گئی ہے۔ اس واقعے کو سمجھانے کے لئے ایک پورا پس منظر پیش کر دیا گیا ہے، بلکہ اس ایک موت کو حیات و ممات کے کائنات گیر مسئلوں سے متعلق کر دیا گیا ہے۔ اسی ایک بات سے مسلمان قوم کی انفرادیت اور شخصیت نمایاں ہے۔ مسلمان کا سوگ بھی دوسروں کے سوگ سے مختلف ہے۔ ریڈیو پاکستان سوگ منا رہا تھا — حافظِ قرآن کی آواز ہمیں بتا رہی تھی کہ موت کیا ہے، زندگی کیا ہے، زندگی کے مسائل کیا ہیں۔ زندگی کس طرح بڑھتی اور پھیلتی ہے۔ اچھی زندگی کیا ہوتی ہے اور بُری زندگی کیا ہوتی ہے۔ انسان کو زندگی کس لئے عطا ہوئی ہے اور اسے کس طرح استعمال کرنا چاہئے۔ جناح کے انتقال کے پس منظر میں یہ آواز ہمیں اپنی تاریخ کے غم اور خوشیاں، حادثے اور کامرانیاں یاد دلا رہی تھی۔ مسلمان قوم اتنا کچھ دیکھ چکی ہے، اتنا کچھ اس پر گزر چکا ہے، مگر ابھی تک زندہ ہے — نہ صرف زندہ ہے بلکہ عزت اور شان کے ساتھ زندہ رہنے کا جذبہ اس کے سینے میں بیدار ہو چکا ہے۔ یہ جذبہ جناح نے بیدار کیا ہے، مگر اب قوم کو اس جذبے کی قدر و قیمت کا شدید احساس ہے۔ اب یہ جذبہ آسانی سے مر نہیں سکتا۔ جناح نے ہمیں یہ آرزو دی، اسے پورا کرنے کا سامان بھی دیا، کیونکہ وہ ہمیں اس کا اہل سمجھتا تھا۔ ہم اُس کی مہربانیوں سے زیادہ اُس کے اعتماد کے احسان مند ہیں۔ کیونکہ جناح کے اعتماد نے ہمیں اپنے اوپر اعتماد کرنا سکھایا۔ اب ہم اپنی تیرہ سو سالہ تاریخ کی رہنمائی میں، جناح کی رُوح کی رہنمائی میں خود آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اب جناح کا باقی کام قوم خود کرے گی۔ قوم کی متحدہ کوشش سے وہ انسانی تصورات زندہ رہیں گے جن کی بقا کے لئے ہم نے بڑی سے بڑی قربانیوں سے بھی دریغ نہیں کیا۔ پاکستان زندہ رہے گا، اور اُس کے ساتھ جناح بھی زندہ رہے گا۔

مختار صدیقی

رسوائے حکایت

جس موت کی خواہش انہیں زندگی بھر رہی، وہ انہیں نہیں مل سکی —— اپنی زندگی کے تلخ لمحوں میں جب وہ مستی شراب کی بے پناہ مقدار سے بیخودی حاصل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے، یا جب اس خرابے میں رہتے ہوئے ایسی دنیاؤں کے تانے بانے بُنتے تھے جن میں طلسماتی باغات تھے، زمرّدیں سبزے تھے، نازک اندام ہوائیں، ہر لحظہ کبھی کلیوں اور کبھی ریشمی آنچلوں کی متوالی خوشبوئیں لاتی تھیں، اور فضائیں چاندنی راتوں اور ستاروں اور مرمریں نازنینوں سے عبارت ہوتی تھیں۔ ہر لحظہ انہیں یہی خواہش رہی کہ ادھ کھلی کلیوں کی گود میں دم توڑیں یا اس وقت دم دیں جب سنگیت کی لہریں اجوار پر ہوں یا اس لمحے زندگی کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیں، جب انہوں نے اپنی سلمیٰ کی تصویر سینے سے لگا رکھی ہو۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو جب وطن کی سرزمین، شہیدوں کے لہو سے گلنار ہو رہی ہو اور باحمیت نوجوان وطن کی حفاظت کے لئے سر بکف ہوں، وہ زخم کھا کر مسکراتے مسکراتے جان دے دیں۔

لوگوں کے نزدیک یہ صرف شاعری ہی شاعری تھی، اختر کہتے تھے موت کے یہ آثار شاعرانہ نہیں، دلبرانہ ہیں۔ میں حسن کے ان گنت اور لازوال مظاہر کا ازلی پرستار ہوں۔ موت کیا میرے لئے حسن کا ایک مظہر نہیں بن سکتی؟ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے کلاسیکی مطالعے کے بل پر، عربی، ہسپانوی اور فارسی فنکاروں کے آخری لمحات کی مثالیں دے کر، بڑی شد و مد سے اپنا نقطہ نظر واضح کرتے تھے۔ اس بحث میں اُن کا اندازِ بیان سادہ ہوتا، کوئی اچھوتی ترکیب، تو کیا ہلکا سا شاعرانہ لفظ بھی اس خطابت میں بار نہ پاتا، اور لوگ، اس منطق کو بھی شاعری سمجھتے تھے!!

نہ جانے کن نسلی یادوں اور کون سی ذہنی اپج نے انہیں توبۃ بن الحمیر، جمیل شبینہ اور لارڈ بائرن جیسی شعلہ آشام شاعرانہ شخصیتوں سے وابستہ کیا تھا۔ ان لوگوں نے غیر معمولی زندگی بسر کی، اچکتے ہوئے جسموں والی، مگر شعلہ خو لڑکیوں سے غیر معمولی محبتیں کیں، جنگ کے میدانوں میں غیر معمولی بہادری کے جوہر دکھائے اور جب وقت آیا، تو اپنے آپ کو غیر معمولی موت کے حوالے کیا —— اختر نے صرف غیر معمولی محبت یا شاید محبتیں؟ ہی کیں اور اس سے اپنی شاعری میں غیر معمولی فضائیں اور نرالی نغمگی کی تخلیق کی۔ اس کے سوا ان کے جینے مرنے میں کوئی غیر معمولی بات پیدا نہ

ہو سکی۔ ان کی زندگی کو محبت یا شاید محبتوں کی ناکامی اور اس کے بعد میں مادی ناکامیوں نے ایک عام بلکہ پیش پا افتادہ سی چیز بنا دیا تھا، ان ناکامیوں کو انہوں نے مئے ناب میں جس طرح غرق کیا اس سے ان کی زندگی اور بھی عامیانہ سطح پر آگئی تھی —— چنانچہ ان کے قلبی تعلقات اور جذباتیت کو آوارگی سے تعبیر کرنا لوگوں کے لیے مشکل نہ تھا۔ شراب اس سلسلے میں "شاہد عادل" بن جاتی تھی۔ علم دوست ثقہ بزرگوں (جن میں ان کے والد پروفیسر شیرانی بھی تھے!) کا تو ذکر ہی کیا۔ شعر و سخن سے اچھی خصوصیت رکھنے والے لوگوں کے نزدیک بھی ان کی شاعری ان کی آوارہ منشی کی رنگین داستان تھی۔ فارسی میں جامی کی یوسف زلیخا کے خاص حصوں اور گلستان کے باب پنجم، اور اردو میں داغ کی تمام شاعری سے لطف اٹھانے والے لوگ بھی ان سے ناراض تھے۔ کیونکہ انہوں نے "شریف زادیوں" کے نام اپنی نظموں میں خوب خوب اچھالے تھے —— غرض اس طور بھی ان کا ایک عام، آوارہ منش، بگڑا ہوا نوجوان ہونا ثابت تھا۔ وہ نوجوان، جو پروفیسر شیرانی جیسے زبردست فاضل اور محقق کی اکلوتی اولاد تھا۔ جسے نہ جانے کیا کچھ بن کر، غیر معمولی آدمی بن جانا چاہیئے تھا!

پھر، دل کی انوکھی جلن، اور دماغ میں جلتی ہوئی جوت کے سوا، ان کا حال ایک عام شرابی کا سا ہو چکا تھا، ان کا لباس، ان کا حلیہ۔ ہر کے پائجامے پر پان کے دھبے، میلی اور عام طور پر خستہ حال شیروانی، ان کا چہرہ، جس پر بلانوشی کی وجہ سے مستقل سوجن رہتی تھی، اور آنکھوں کے نیچے، اور کلوں کے آس پاس کا لٹکا ہوا گوشت، یہ سب باتیں، آپ بوتل کے کسی رسیا میں دیکھ سکتے ہیں۔ اور اگر ان باتوں کو آپ غیر معمولی کہہ سکتے ہیں تو ان معنوں میں، یعنی، معکوس استدلال کے بل پر، ان کی زندگی بھی عامیانہ نہ تھی۔ بلکہ غیر معمولی ہی تھی۔ اور ان کی زندگی میں بھی ایک امتیاز تھا۔ چاہے میرے نزدیک، ایسی عظیم الشان شخصیت کے سلسلے میں یہ امتیاز، معکوس اور غلط بلکہ مہمل ہی کیوں نہ ہو —— مگر ان کی حقیقی زندگی کے اس معمولی پن ہی نے، ان کے پرستاروں کو بڑے بڑے جاں گسل صدمے پہنچائے۔ اور پہلی بار انہیں ان حالوں دیکھ کر تو نہ جانے، شوکتؔ تھانوی کی طرح کس کس کا دل خون ہوا ہوگا۔[1]

—— رہی موت، تو اس کا غیر معمولی ہونا، اپنے اختیار کی بات ہی کیا ہے، انسان چاہے فن کار ہو یا پیغمبر، آخر انسان ہے، اور انسانی موت، بہت ہی معمولی اور پیش پا افتادہ، بلکہ عامیانہ اور مبتذل سی چیز ہے۔ قحط، زلزلوں اور جنگوں کو چھوڑ کر، کروڑوں انسانوں کے مرنے کا ڈھنگ ایک ہی سا ہوتا ہے۔ صحت بگڑی یا بڑھاپے نے بگاڑ دی، بیمار ہوئے، تیمارداروں کا طبیبوں کا تانتا بندھا، کوئی افاقہ نہ ہوا، اور آخر، موت کی گود میں جا سوئے —— قائدِ اعظم جیسی عہد آفرین شخصیت کو اپنی انقلاب انگیزی کے باوجود، اسی ڈھنگ کی پابندی کرنی پڑی، اردو شاعروں میں اختر

---

[1] بحوالہ شوکت تھانوی "شیش محل"

انعام اللہ خاں یقین کو اُن کے باپ نے قتل کر کے، غیر معمولی موت بخشی اور اُن کے اُستاد حضرت میرزا مظہر جانجاناں کو اُن کے ایک مخالف نے شہید کیا۔ ورنہ میر سے لیکر غالب اور غالب سے اقبالؔ تک، بڑے بڑے آفاقی فنکار اسی طرح جہان سے گئے، یہ الگ بات ہے کہ ان لوگوں کو برائے بیت، محبت میں جان دینے کی خواہش ہو تو ہو۔ ورنہ غیر معمولی موت کی خواہش ہرگز نہ تھی۔ اور ادھر ان کا حال یہ تھا کہ شیخ سعدیؒ کے لفظوں میں (جن کا اخترؔ اکثر حوالہ دیا کرتے تھے) در عنفوانِ جوانی، چنانکہ افتد...... کہ اُنہیں عین سرخوشی میں جان دینے کی تمنا کروٹ کروٹ بے چین رکھتی تھی۔ اولین دور میں شائد، یہ ایک نادان جوان کا وفورِ عشق تھا جو سلمیٰ کی تصویر کی رونمائی کے بدلے میں جان پیش کرنا چاہتا تھا۔ مگر جب محبت تلخیوں سے آشنا ہوئی، اور اس میں زمانے کے عناد اور محبوب کے تغافل (اور بعد میں کو دی بیوفائی) نے اپنا بس گھولا، تو پھر یہ فرار کا ایک مستقل بہانہ بن گیا —— کبھی یہ خیال رہتا تھا کہ اب تو کلیاں کھلی ہیں، اور موتیوں جیسی چاندنی چھٹکی ہے۔ نغمے ہیں، اور آنچلوں کی دھیمی، نرم سرسراہٹیں ہیں۔ اس وقت مر جاؤں، تو اس خوفناک ردِ عمل سے بچ سکوں گا، جو حقیقت کی دُنیا میں واپس جانے پر مقدر ہو چکا ہے۔ کبھی یہ احساس کھائے جاتے تھے کہ یہ دنیا جہاں سوائے مکر و ریا اور کچھ نہیں، جہاں بیداد اور حیوانیت، امتیازی باتیں سمجھی جاتی ہیں۔ کب تک مجھے اپنا اسیر رکھے گی۔ یہ خلش، بڑھ کر فریادوں اور دلدوز پکاروں میں تبدیل ہوتی تھی، اور وہ کسی دوسری دنیا میں جانا چاہتے تھے۔ جس کی تفصیل بنانے کے لئے انہوں نے "اے عشق کہیں لے چل"۔ اور "ایک آرزو" اور "شاعرہ" اور "سرزمینِ عشق" اور "جوگن" اور شاید ہر ایک نظم لکھی۔

بیان کردہ دونوں ادوار کی حدبندی ذرا وضاحت طلب ہے۔

پہلا دور بہت مختصر تھا، ایک بہت ہی حساس اور طبعاً حسن پرست مگر نادان جوان کے دل میں ایکا ایکی کسی کی طوفانی محبت جاگ اٹھی، آناً فاناً اس کی روح اس شیریں مگر جابر جذبے کے بے پناہ بوجھ تلے دب گئی۔ اور جب وہ پہلے پہل اُسے آکر ملی تو اس نے اپنی تمام پچھلی زندگی کو رائیگاں جانا پھر اُس کا فرہ نے جو چاند کی کرنوں سے گھبرا اس کی آغوش میں چھپ گئی تھی، اس نادان جوان سے پیمانِ وفا باندھا، اور اس کی زندگی کا وہ نہایت مختصر اور طوفانی دور شروع ہوا جس کی یادیں زندگی بھر اس کے مصرع مصرع میں سسکتی رہیں۔ وہ فطرتاً حسن کا پجاری تھا، ممکن ہے اس سے پہلے اُسے دمکتے ہوئے چہروں اور نشیلی آنکھوں نے اپنی دلچسپیوں کا مرکز بنایا ہو، مگر اس کافرہ کی آنکھوں میں انوکھی جاذبیت تھی۔ اور اس کے چہرے میں نرالی دلربائی اور نئی نفاست تھی۔ اس کی نگاہوں میں ایسا دُلار تھا جو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور اُس نے اس انوکھے پن، اس نویلی جاذبیت کو پہچانا، اور اسؔ پہچان نے زندگی بھر کی لذتیں، اس کے ایک ایک لمحے میں بھر دیں، یہ "پہچان" لفظوں میں بار پائی، تو ایک تصویر دیکھ کر عورت، سلمیٰ اور عذرا جیسے سانیٹ

لہ "ہرجائی"۔

لکھے گئے اور "ارواح معصوم" "ایک بار دیکھا..." "آج کی رات" "جمال سلمیٰ" "ایک حادثہ" (چند لمحے عذرا کے ساتھ) جیسی نظمیں تحریر ہوئیں۔ نئی نئی ترکیبیں وجود میں آئیں۔ ایک اچھوتا اسلوبِ بیان تخلیق ہوا۔ الفاظ کو نئے معنے اور نئے محل عطا ہوئے۔ اور محبوب واضح طور پر اور پوری بیباکی سے (اردو شاعری میں پہلی دفعہ) ایک ایسی عورت کے پردے میں جلوہ گر ہوا جس میں چاہے جانے کے ساتھ چاہنے کی بھی صلاحیت تھی۔

اور جو کچھ محبت کی اس اولین مخموری اور غیر معمولی کامرانی نے لکھوایا، اس میں کیا کچھ تھا اور کیا کچھ نہ تھا۔ اس میں محبت کی پُراسرار خاموشیاں تھیں، وہ گویائی تھی جسے آنکھیں ہی سن سکتی ہیں اور دل کی دھڑکنیں ہی پیدا کر سکتی ہیں، وہ احساسات تھے جو زبان ادا نہیں کر سکتی، جسے قدیم ہندستان کے موسیقیانہ تصوّر کی زائیدہ راتوں میں "جوگن" کی جھبی، آسمانی موسیقی ہی ادا کر سکتی ہے۔ اس میں وہ موسیقی تھی، جسے محبّت زندہ کرتی ہے۔ اور نگاہیں جی بھر بھر کے ایک دوسرے کو سناتی ہیں۔ ان منظومات میں عہدِ ہارون کی راتیں تھیں، جو نکیلے اور طرار ستاروں سے بھرپور تھیں، ان میں شفق اندام عورتیں تھیں، حریر و پرنیاں کے جسم والی عورتیں، جن کی شعلہ خوئی اُن کی محبّت کی پائندگی کی ضامن تھی، ان میں بہاریں تھیں، زمزمے تھیں، خوشبوئیں اور مستیاں تھیں، شباب و شعر کے عالم تھے، ہر طرف لطافتیں اور نغمے تھے، پریاں اور شہزادیاں تھیں۔

پھر یہ دور، اور اس کی رنگینی، پھڑپھڑاتی ہوئی کسی اور عالم کو پرواز کر گئی، اور محبت میں تغافل، بے مہری اور کٹھور پن کی تلخیاں گھل گئیں — الفاظ اور اسلوب اب بھی وہی تھا۔ اُن میں رنگینی اور جوشِ تخیل اب بھی موجیں مارتے تھے۔ مگر اب اُن میں معصومیت کی بجائے سوز اور بے چینیوں کی لگاوٹیں تھیں — یہ مرحلہ بھی جلد طے ہوا، اور اب واضح طور پر کسی کی کج ادائی نے سرد مہری کا چولا بدل لیا — اور اختر کی بہار آفریں جوانی ایک دلدوز پکار ہو کر رہ گئی۔ اب "گذری ہوئی راتوں" کی یادوں سے دل بہلایا جاتا تھا۔ "شکوہ" رقم ہوتا تھا۔ "وقت کی قدر" کے پردے میں جاں گسل منتیں کی جاتی تھیں۔ "رومانی لمحات کی یاد" سے رونے رُلانے کے سامان ہوتے تھے۔ "اُن سے" براہ راست، اپنی ناکامیوں کے نوحے پڑھے جاتے تھے۔ "تلخ اعتراف" (ذرا مقابلہ کیجئے پہلے صرف اعترافِ محبت تھا) دنیا کو سنائے جاتے تھے۔ "دل کی ویرانی" کے مرثیے لکھے جاتے تھے — اس دور میں منتیں، وقت کی باتیں، اور موسم کے تقاضے ایک سانس میں بیان ہوتے تھے۔ یادوں سے دل کے داغوں کی شمعیں روشن کی جاتی تھیں۔ بعض دفعہ "خیر مقدم" کی نوبت بھی آتی تھی، اور یہ خبریں بھی آتی تھیں کہ سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں — غرضکہ یہ سوز و ساز کا بھرپور زمانہ تھا۔

پھر، وقت کی ایک بیرحم کروٹ نے اس میں زہر گھول دیا، وہ کسی کی ہو گئی، اور (بقول اختر) وہ "بے طلب مہر سامانیاں" جو صرف اُن کے لئے تھیں، اب ان کا مرجع کوئی اور بن گیا۔ اور اختر نے "ہرجائی" جیسی تلخ نظموں میں اپنے دل کی مسموم مایوسیوں کو لفظوں کا جامہ پہنانا شروع کیا۔ لوگ کہتے ہیں یہ مایوسی نہ تھی بلکہ ان کی آنکھیں کھل گئی تھیں اور اُنہوں نے حقیقت کے چہرے پر خود ہی جو رنگین پردے ڈالے تھے نوچ کر پھینک دیئے۔ اور اس لئے حقیقت اُن کے لئے بڑی گھناؤنی بن گئی۔ دنیا والوں سے انہیں نفرت پہلے ہی تھی، اس مایوسی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ "لوگوں"

کی بیدادگری نے ان پر خاص اثر کیا، چنانچہ کبھی "معصومیت" جیسی طویل مگر زوردار نظموں میں اُنہوں نے قنوطیت کے سہارے اخلاقی جذبات کے نقش بنائے۔ اور کبھی نظم در نظم گناہ کے خلاف جہاد کیا ——— اور اِس احساسِ گناہ اور اس سے شدید نفرت، بلکہ اس سے ان کی اپنی خوفزدگی کا باعث صرف یہ تھا کہ جس عورت نے ان سے پیمان کیا، وہ باوفا ثابت نہ ہوئی، بلکہ "ایسا ساغر بن نکلی جسے ہر ایک کے ہونٹ چھو سکتے تھے"۔

وہ اس وقت تک اپنی اکثر نظمیں لکھ چکے تھے۔ رقص، تیتری، اے دیس سے آنیوالے بتا، اے عشق کہیں لے چل اور ریحانہ رہتی تھی ——— (نہ جانے ان کی طوالت میں کیا رمز رکھی گئی تھی) غرض بہت کچھ ان کے قلم سے نکل چکا تھا۔

مجھے ان نظموں کی تاریخی ترتیب یا اُن کے فن کے تدریجی ارتقا سے کچھ علاقہ نہیں۔ نہ ان کی تقدیم و تاخیر کے متعلق میرے پاس معلومات ہیں، مگر یہ امر یقینی ہے کہ جو نظمیں اُنہیں زندہ رکھیں گی، اور جو سانیٹ، مستزاد اور ترنمات ان کا طرۂ امتیاز رہیں گے، وہ لوگوں کے سامنے آ گئے تھے۔ ان کا افغانی خون (اور عرب شعرا اور لارڈ بائرن سے ہم آہنگی) اور اُن کی فارسی دانی اُن سے فارسی ترانے اور عاشقانہ موت مرنا ہے تو چل قندھار چل بھی تحریر کرا چکی تھی۔ اور اختر اختر بن چکے تھے۔

میں نہیں جانتا کہ اپنی ناکامی کے کس مرحلے پر اُنہوں نے اپنے دل میں اٹھنے والے طوفانوں کو ساغر میں ڈبونا شروع کیا ——— یہ بھی معلوم نہیں کہ غم غلط کرنے کے اس سہل نسخے کا مشورہ اُنہیں کس نے دیا۔ اُنہیں قریب سے دیکھنے والوں نے، مرحوم آغا حشر اور جناب جگر کو، الگ الگ اس نسخے کا اصلاح کار بتایا ہے۔ اور دونوں کے سلسلے میں ایک سے قابل قبول ثبوت پیش کئے ہیں۔ مگر یہ بات بذاتِ خود اتنی اہم نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اُنہوں نے شراب کو اپنی جملہ علتوں کا طبیب سمجھ لیا ——— اور پھر وہ رفتہ رفتہ اپنے آپ کو ہر قیمت پر شراب کے ایک ایک قطرے میں کھو دینے کے لئے دن رات کوشاں ہو گئے ——— ویسے ان دنوں بھی یہ نظمیں لکھتے تھے، اُن میں وہی رنگینی اور بانکپن اور غنائی حسن ہوتا تھا۔ مگر ہر بات اب کسی نہ کسی یاد کا بہانہ بن گئی تھی۔ اور ہر مصرعہ، اس یاد کا کوئی نہ کوئی پہلو، کوئی گزشتہ لمحہ، کسی نہ کسی طور زندہ کر دینے کے لئے رقم ہوتا تھا۔ کبھی ان یادوں کو یورہ ہائی نس سے خطاب کر کے ظاہر کر کے، کبھی لارڈ بائرن آف راجستھان بن کر، بھید کی بات شہرۂ آفاق ہوتی۔ کبھی گجرات کی سرزمین نغموں کا موضوع بنتی، تو کبھی نئے نئے نام۔ ایک ہی نام کے ساتھ ان کی وابستگی کی جوتیں جگاتے۔

ویسے یہ زمانہ اُن کو دیکھنے والوں اور خود ان کے لئے بڑا صبر آزما تھا۔ جس نشے کو بیخودی لانے اور سب کچھ بھلانے کے لئے اُنہوں نے غلام سمجھ کر اپنایا تھا، وہ آہستہ آہستہ ان کا مالک بن چکا تھا۔ مادی وسائل، اس آفاقی نذر نیاز کے لئے بے حد ناکافی تھے۔ گھر کے لوگ، اور خصوصاً اُن کے نامور باپ اُن سے ہمیشہ کے لئے برگشتہ ہو چکے تھے۔ دوست احباب اس کٹھن سفر پہ بن پڑتا تو تھوڑی دور تک ساتھ دیتے۔ ورنہ طعن و تشنیع، یا بہت ہوا تو پند و نصیحت کے دفتر سنا کر، کنی کترا کے الگ ہو جاتے۔ وہ زمانہ ویسے بھی دنیا کے لئے بڑا نازک تھا۔ ایک اک

ملک اقتصادی بدحالی اور بیروزگاری کے چنگل میں زندگی کی سانسیں گن رہا تھا۔ تعلیم بے حقیقت تھی، ہنر بے مایہ تھے، اور روپیہ نایاب ہو رہا تھا۔ مگر انہوں نے اس کا سطحی ردِ عمل یعنی دنیا سے بیزاری اور تشائم، اور یاس پسندی، اپنی شاعری سے ثابت نہ کیا۔ راشد لکھتے ہیں وہ طبعاً یاس پرست شاعر نہیں تھے۔ کیونکہ وہ مسرت کے خوابوں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ جوانی اور شباب آفرینی ان کا فطری جوہر تھا۔ اور اسے رونے رلانے سے یا مستقل "گریہ نویسی" سے علاقہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہ انسان تھے۔ ایسے انسان جن نے غیر معمولی محبت کی تھی اور اس لئے اُن کے آنسو کئی جگہ ان کی تینوں چاروں کتابوں میں بکھرے ہوئے مل جاتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کی افغانی سخت جوئی اور ان کی فطری حسن بخشی نے ان آنسوؤں کو کبھی دمکتے تارے، کبھی ترشے ترشائے یاقوت، اور کبھی شبنم کے موتی بنا دیا۔ خالص انسانی آنسو (جن میں جمالیاتی پہلو بالکل نہیں ہو سکتا) اُن کی روزمرہ کی زندگی تک محدود رہے۔ میں نے پہلی بار انہیں اسی انسانی روپ، (بلکہ محدود معنوں میں) ایک مجبور آدمی کے روپ ہی میں دیکھا، اور وہ نقش آج تک دل پہ ہے۔

اس زمانے کے نوجوانوں میں اختر کے ایک محبوب پرستار (اور شاید شاگرد بھی) حضرت تابش صدیقی تھے۔ آج اُن کی بے ریا دوستی میرے لئے سرمایۂ فخر ہے۔ ان دنوں وہ ہمارے لئے دوست اور بزرگ (علی گڑھ کی اصطلاح میں "سینئر") دونوں تھے۔ اور وہی مجھے اُس شخصیت کے حضور میں لے گئے۔ جسے ملک کے نوجوان لڑکے لڑکیوں کے عقیدت مند خیالوں نے اپنا کعبۂ مقصود بنا رکھا تھا۔ اور جس کی محبتوں کے افسانے سرگوشیوں میں ڈھلتے تھے۔ میں ملاقاتوں سے آج تک بہت گھبراتا ہوں۔ اُن دنوں کی حساس خاموشی نے اس ملاقات، بلکہ باریابی کا احساس ہی دوبھر کر دیا۔ اور جب پیش کیا گیا، تو سخت گرمیوں میں بھی ٹھنڈے پسینے آئے۔ لیکن اختر (حسب عادت) بڑی مہربانی سے پیش آئے۔ تابش سے دو ایک باتیں خصوصیت سے کیں اور بس ـــــ ایک نوجوان جو پہلے سے موجود تھا اس سے سلسلۂ کلام پھر شروع کر دیا اور کہا ـــــ تم بہت شریر ہو، کھاؤ چپت ـــــ اور جب یہ مرحلہ طے ہوا تو اس نوجوان نے ان دنوں کی مشہور نظم "گذری ہوئی راتیں" بڑی خوبصورت آواز میں کچھ گاتے ہوئے کچھ پڑھتے ہوئے سنانی شروع کر دی :-

نہ بھولے گا ترا راتوں کو تڑپاتے ہوئے آنا
رسیلی انکھڑیوں سے نیند برساتے ہوئے آنا
رُخ روشن کے جلوؤں سے سحر کا نور بن بن کر
اندھیری رات کے پردوں کو سرکاتے ہوئے آنا
روپہلی چاندنی میں اپنی مستانہ خرامی سے
بہار خواب کے نغمے سے برساتے ہوئے آنا

لہ مضمون - ن م راشد جو اختر ستان کا مقدمہ بنا دیا گیا ہے۔

ترے ابریشمی ملبوس کا سرسر کے جھونکوں سے — سحاب رنگ و بو کی طرح لہراتے ہوئے آنا

یہاں تک پہنچتے پہنچتے اختر پلنگ کے نیچے سے لال رنگ کی بوتل نکال چکے تھے اور تابش سے کہہ چکے تھے، "تابش بیٹے امید ہے تمہارے دوست بُرا نہ مانیں گے"۔ یکایک انہوں نے ایک آہ کی، مصرعہ دہرایا، "سحاب رنگ و بو کی طرح لہراتے ہوئے آنا"۔ اور ان کی سُرخ آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔

پھر نہ جانے کتنی مدت بعد، یہی رنگ مگر اس سے کہیں بدتر ماحول میں دیکھا۔ ان کی حالت پہلے سے بہت گر چکی تھی۔ ان کا آخری سہارا "رومان" بند ہو گیا تھا۔ گھر سے وہ بے تعلق ہو چکے تھے۔ محبت کی ناکامی نے ان کے گرد جو ہالہ بنا رکھا تھا وہ خم بہ خم لنڈھائی جانے والی شراب نے ملیا میٹ کر دیا تھا۔ وہ ایک بجھتے ہوئے شاعر اور نشے کے غلام انسان ہی نظر آنے لگے تھے —— اس وقت پی رہے تھے۔ اس لئے بہت خوش تھے۔ یکایک بوتل رکھ دی اور کہنے لگے "کوئی مجھے سنا سکتا ہے" پھر وہی نکہتِ مستانہ کدھر سے آئی" —— اور ایک صاحب نے سنانا شروع کر دیا

[1] پھر وہی نکہتِ مستانہ کدھر سے آئی — محرمِ گیسوئے جانانہ کدھر سے آئی
ایک دن جس سے مہکتا تھا حریمِ سلمیٰ — وہ ہی خوشبوئے دلِ دیوانہ کدھر سے آئی

حاضرین جھوم رہے تھے۔ اس نظم کے حسین سوز نے دلوں میں عجیب آنچیں پیدا کر دی تھیں۔ اور ان آنچوں کا خالق رو رہا تھا۔ ماتھا کوٹ کوٹ کر کہتا تھا "ہائے، ہائے مرحوم اختر——"

اور یہ سچ بھی ہے۔ وہ ان حالوں پہنچتے پہنچتے ذہنی اور فنی لحاظ سے پہلے تو نیم جان رہے، پھر واقعی مرحوم ہو گئے!! سچ جانیے، قدرت کی نظروں میں وہ اپنا کام، یعنی اردو شاعری میں جدید تر دور، اور موضوع اور ہیئت میں نئی باتوں کا کھوج ختم کر چکے تھے، یا یہ کہ اب اُن کے پاس کہنے (اور شاید سوچنے) کی باتیں ہی نہ رہی تھیں۔ یا یہ کہ جو احساسات، جو غنا، جو ترنگ، اور سرمستی نظم کے موضوع اور اظہار میں وہ لانا چاہتے تھے، وہ انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ اور اس کے نازک تانے بانے میں مزید لچک ہی نہیں رہی تھی۔ بہر کیف اختر اب جاتے رہے تھے اور ان کے فانی جسم کی مخموریاں ہی باقی رہ گئی تھیں۔ کبھی ان میں کام کرنے اور محنت سے لکھنے پڑھنے کی بے پایاں طاقت تھی۔ وہ رات رات بھر اور دن دن بھر پڑھتے لکھتے اور اپنے مختلف پرچے مرتب کرتے تھے۔ اب ان کا وقت بیخودی کے چھلاوے کے تعاقب میں گزرتا تھا۔ اور جب "

---

[1] افسوس ہے یہ نظم ان کی کتابوں میں نہیں ہے۔

اس چھلاوے کے قریب تر ہوتے تھے تو کبھی کبھار لکھتے بھی تھے اور شاید پڑھتے بھی تھے۔ لیکن "وہ بات" جاتی رہی تھی۔ وہ لکھتے ضرور تھے۔ کلام کے زور اور روانیٔ افکار میں کمی نہ تھی۔ ان کی فطری حسِ غناب بھی ہاتھ باندھے ساتھ رہتی تھی۔ بحر کے تناسب کا نایاب ادراک اب بھی اُن کے دماغ اور دل میں اسی طرح موجود تھا جس طرح اُن کے برگزیدہ اور فنِ عروض میں مستند والد نے جاگزیں کیا تھا۔ اُن کے جگت اُستاد باپ نے اُنہیں بڑی محنت سے فارسی علم و ادب کی تعلیم دی تھی۔ اور وہ تعلیم اب بھی اُن کے ذہن کا صیقل تھی اور وقت پر مناسب اور عمدہ الفاظ، چست تراکیب اور نئی بندشیں حاضر کرتی رہتی تھی۔ انہی کے بل بوتے پر اب بھی وہ اچھی خاصی نظمیں مثلاً "اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا" یا اختتامِ جنگ پر ساقیہ سے خطاب قسم کی نظمیں لکھتے تھے۔ مگر اختر، اختر نہیں رہے تھے۔ ویسے بھی ان کی شاعری کی خصوصیت "شباب شعر و سرود" اور خالص تغزل نئے اور جوان اور بہت ہی سُرخ خون کی مرہونِ منت تھیں۔ اور اب ان میں نیا اور جوان اور بہت ہی سُرخ خون نہیں رہا تھا۔ خون کا نیا پن، زمانہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس کی حدت اور جوانی اسی زمانے کی ناسازگاری نے اتنی ٹھنڈی کر دی تھی کہ اب اس کی گرمی ساغر و مینا کی کرامات سے بھی واپس نہ آتی تھی، اور خون کی سرخی میں انہوں نے خود آنسوؤں کا شور ملا کر اُسے سودا بنا دیا تھا۔۔۔۔

پھر بھی اُنہوں نے تغزل کی شرح برقرار رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ اور اس مقصد کے لئے اُنہوں نے براہِ راست ہیئتِ غزل کا سہارا لیا۔ پہلے بھی اُنہوں نے بہت سی چیزیں ایسی لکھی تھیں جو قوافی کی زبردست پابندی اور موضوع میں زیادہ ربط نہ ہونے کی بنا پر نظم کی بہ نسبت غزلِ مسلسل سے قریب تر تھیں۔ اب انہوں نے زیادہ تر غزلیں ہی کہنی شروع کر دیں۔ ان میں اُنہیں آسانی بھی تھی۔ بیان و اسلوب پر اُنہیں بہت قدرت حاصل ہو چکی تھی۔ کلاسیکی شاعری کا مطالعہ بہت اچھا تھا اور ایسے خیالوں اور جذبوں کی کمی نہ تھی، جنہیں اپنے خاص انداز میں نظم میں ڈھالنے کے لیے محنت اور یکسوئی درکار تھی۔ مگر غزل کے شعروں میں اُن کا اظہار زیادہ کوہ کنی کا طالب نہ تھا۔

اور پھر یہ انداز مدتوں چلتا رہا۔ اور آنے والی ہر بہار و خزاں کے ساتھ وہ پنجاب اور ہندوستان کی نئی شعری تحریک میں ایک زندہ قوت کی بجائے ایک یادگار بنتے چلے گئے۔۔۔۔ پنجاب میں احسان دانش آ چکے تھے۔ ۱۹۳۸ء کے بعد راشد اور فیض کو سال بہ سال مستند حیثیت حاصل ہوتی گئی۔ میراجی کا طلوع ہوا۔ ان کے ساتھ ہی ساتھ قیوم نظر، احمد ندیم قاسمی اور یوسف ظفر سامنے آئے۔ ہندوستان میں میں پہلے جوش کی بہت زیادہ شہرت ہوئی۔ پھر نوجوان شعرا مثلاً مجاز، جذبی، اختر الایمان، سلام اور ایک پرانے شاعر یعنی شاد عارفی رامپوری بہت ہی نئے روپ میں شہرت پا گئے۔ ان کے ساتھ یو۔پی اور پنجاب میں نئی پود کے شعرا کا ایک گروہ پیدا ہو گیا۔ اور وہ جس نے اردو نظم کو ایک نیا انداز اور نئی نہج پہ چلنے اور ترقی کرنے کا ڈھنگ سکھایا تھا۔۔۔ برسوں بعد موضوع اور ہیئت میں نئے نئے اور (بعض اوقات) عجیب و غریب تجربے کرنے والوں کے لڑکپن اور ابتدائے جوانی کو اپنی باتوں سے جس طرح مسحور کیا تھا، اور شعر اور محبت اور شہرت کے کیا کیا سپنے

دکھاتے تھے، ان تمام تبدیلیوں اور ترقیوں اور کئی باتوں میں زوال پذیریوں کو دیکھتی آنکھوں دیکھتا رہا، اور —— اور عام طور پر غزلیں اور شاذ و نادر نظمیں بھی لکھتا رہا۔ جن میں سلمیٰ بھی تھی۔ اس کی یادیں بھی تھیں، رنگین باتیں بھی تھیں، مگر وہ بات نہ تھی، جو کبھی تھی —— اور شاید وہ کبھی نہیں آسکتی تھی۔

اس دوران میں وہ اس خطے سے بھی چلے گئے تھے، جہاں انہوں نے اپنی جوانی اور اپنی محبتوں کی دھومیں مچائی تھیں۔ اپنے اور دوسروں کے کئی رسالوں میں چھپنے والی نظموں سے شفق زاروں کی وادیاں ستاروں کے سمندر اور ماہتابوں کے جزیرے بنائے تھے۔ اور پنجاب کے زندہ دل نوجوانوں اور صحت مند لڑکیوں کے دلوں پر رومان اور محبت کی طلسمی تحریریں نقش کی تھیں۔ پروفیسر شیرانی پنجاب یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ اور شاید وہ یہیں رہتے مگر سنتے ہیں کہ ٹونک میں ان کی جائداد وغیرہ واگزار ہو گئی۔ اور انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ اب ریاست جا کر اپنے وطنِ مالوف میں بقیہ دن گزاریں۔ تمام کنبہ گیا تو اختر بھی چلے گئے۔

پھر پچھلے برس کے خونیں ہنگاموں میں جب موت کی ارزانیوں نے ہر زندہ کو مردہ کر دیا، ان کے متعلق یہ خبر اڑی کہ مشرقی پنجاب میں کسی جگہ انہیں بھی خاک و خون کی گود میں سلا دیا گیا ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ زندہ ہیں۔ اور انہوں نے اخباروں میں چھپوایا کہ میں "ابھی تک" زندہ ہوں۔ اب خیال آتا ہے ان دنوں غیر معمولی موت بھی مرگِ انبوہ بن کر اتنی عام سی چیز ہو گئی تھی کہ جشن بھی نہیں بن سکی تھی، اور انہیں ایک برس بعد ہسپتال میں عام آدمی کی طرح دنوں بیمار رہ کر معالجوں اور تیمارداروں کو مایوس کر کے دنیا سے اُٹھنا تھا۔

★ ★ ★

لو آؤ کہ رازِ پنہاں کو رسوائے حکایت کرتا ہوں

دامانِ زبانِ خامشی کو لبریزِ شکایت کرتا ہوں

گھبرا کے ہجومِ غم سے آج افشائے حقیقت کرتا ہوں

اظہار کی جرأت کرتا ہوں

میں تم سے محبت کرتا ہوں

(اختر)

آفتاب احمد خاں

شاعری میں کفر

مسلمانوں نے دنیا کے کلچرل سرمایہ میں جو بیش بہا اضافے کئے ہیں اور اُن کی صدہا سالہ تاریخ میں آرٹ کو جو عظمت حاصل رہی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں تعمیر اور شاعری کم از کم یہ دو فن تو ایسے ہیں جن سے مسلمانوں کو ہمیشہ خاص لگاؤ رہا ہے۔ اور انہوں نے ان میں غیر فانی اور عظیم الشان روایات چھوڑی ہیں، فنِ تعمیر نے تو اپنی خاص نوعیت کے باعث تاج و تخت کی سرپرستی ہی میں پرورش پائی، مگر شاعری وہ فن ہے جس کو مسلمان عوام نے ہمیشہ دل سے چاہا اور زندہ رکھا ہے، مسلمانوں کی تاریخ نے بڑے بڑے رنگ دیکھے ہیں، لیکن عروج کا زمانہ ہو یا زوال کا، علم کا دور دورہ ہو یا جہالت کا، شاعری کا چرچا مسلمانوں میں ہمیشہ سے رہا ہے اور یہ بھی یاد رہے کہ ترقی پسندوں کے نظریوں کے باوجود مجھے اصرار ہے کہ ہماری شاعری شاہی درباروں سے زیادہ عوام کی محفلوں میں پھلی پھولی ہے، اس تمام عرصے میں مسلمانوں نے عمل کے بڑے بڑے معرکے مارے ہیں، دنیا میں بہت کچھ "کام" کیا ہے، اس کے باوجود اس فنِ لطیف کی محبت اور عزت ان کے دلوں سے کبھی محو نہیں ہوئی۔ اور وہ ہمیشہ اسے خاص اہمیت دیتے رہے ہیں۔

مسلمان شعراء کی شاعری کو اسلام نے کس طرح متاثر کیا ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ اسلام نے شعراء کے احساس و شعور کی تربیت میں کیا حصہ لیا ہے، یہ بذاتِ خود بڑا دلچسپ موضوع ہے مگر سردست میں اس کی نسبت کچھ کہنے سے قاصر ہوں، شاعری میں فکری اثرات بڑے عجیب و غریب اور پُراسرار طریقوں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ یوں دیکھا جائے تو شاعری کی دنیا میں ہمارے شعراء کا مذہب اسلام نہیں کفر ہے، انہوں نے زاہد اور محراب و منبر سے جو بیباکیاں کی ہیں اور جس طرح برملا کفر کا کلمہ پڑھا ہے۔ وہ ایسی باتیں نہیں جنہیں بار بار یاد دلانے کی ضرورت محسوس ہو، ذاتی زندگی میں وہ اسلام کے سختی سے قائل تھے۔ مگر شاعری میں ان کے تخیل نے ایک بالکل مختلف قسم کی دنیا آباد کر رکھی تھی۔ منطق کی سطح پر رکھ کر پرکھا جائے تو یہ تضاد بڑا پریشان کن ثابت ہو سکتا ہے مگر شاعر کے احساس و شعور کی وسعت میں زندگی کے بظاہر متضاد اور متصادم عناصر آپس میں ٹکراتے نہیں بلکہ ایک سکون بخش توازن اور ہم آہنگی پا لیتے ہیں، مزاج کی اس کیفیت کے ضمن میں سعدی نے کیا نکتہ آفریں شعر کہا ہے ؎

درکفے جامِ شریعت، درکفے سندانِ عشق　　ہر ہوسناکے نہ داند جام و سنداں باختن

مسلمان عوام اسی کافرانہ شاعری کو صدیوں سے قبول کرتے آئے ہیں۔ اسی کو پوجتے آئے ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہماری شاعری کی روایات ان کے ذہن میں

اس طرح رس بس گئی ہیں کہ ان میں بھی "جام و سنداں باختن" کی سی ہم آہنگی اور توازن پیدا ہو گیا ہے۔ شاعری انسانی فطرت کی بڑی گہری رگوں کو چھوتی ہے اس کا جادو بڑا خاموش مگر بڑا سخت گیر ہوتا ہے اور بہت دیر پا بھی، اس کے اثر کو زائل کرنا اور دلوں سے بھلا دینا آسان کام نہیں ہے۔

مگر سمجھنے کی چیز یہ ہے کہ اس کفر کی نوعیت اور ماہیت کیا ہے؟ یہ کس روح کا ترجمان ہے؟ یہ مضمون اس روح کو پانے کی ایک کوشش ہے۔ یہ کفر شاعرانہ تمثیل ہے۔ شاعر ہم تک اپنی بات پہنچاتا ہے تو عموماً علامتوں اور تمثیلوں کا سہارا لے کر بالخصوص اردو فارسی شاعر، یہی تو اس کی دو دھاری تلواریں ہیں، ہمارے شاعری کی اس خصوصیت کی وجہ یہ ہے کہ وہ اکثر و بیشتر خیال کا شاعر رہا ہے۔ اس خیال کا جو جذبہ کی سطح پر محسوس کیا گیا ہو، اس خیال کو شعر بنانے کے لئے اسے کوئی نہ کوئی خارجی تصویر ڈھونڈنی پڑتی ہے، تو گویا یہ کفر اور اس کے متعلقات ایسی ہی تصویریں ہیں جن کے ذریعے شاعر اپنی روح کا اظہار کرتا ہے، ہاں یہ مجھے تسلیم ہے کہ جب ایسی علامتیں اور تمثیلیں عام ہو جاتی ہیں۔ تو معمولی شاعر انہی سے کھیلنے اور انہی میں "ناز و کرشمہ" دکھانے کو کمالِ شاعری سمجھنے لگتے ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ ہمارے شعراء نے کفر کی تمثیلات کا انتخاب کیوں کیا؟ شاید اس لئے کہ ان میں چونکا دینے کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت موجود ہے۔

یہ کفر جس انتہائی نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتا ہے اس کی بحث بعد میں آئے گی، مگر اس کا زیادہ عام پسند اور بدنام پہلو اس کی منفیت ہے اس کی ابتدا زاہدیت پر بے پناہ حملوں سے شروع ہوتی ہے۔ اسے میں نے منفیت کہا ہے، مگر یہ بڑی معنی خیز چیز ہے۔ اس لئے کہ در اصل یہ شاعر کی ان روحانی اقدار کا احتجاج ہے جو اس کے ہاں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، زاہدیت کے خلاف شاعری میں جو کچھ کہا گیا ہے۔ اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے شاعر کے اس منصب کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے جو وہ فطرتاً ادا کرنے پر مجبور ہے، اس حقانیت کے اظہار و تکمیل کی خاطر، جسے وہ اپنے وجدان کے ذریعے حاصل کرتا ہے، بات یہ ہے کہ شاعر محض ظاہر کی باتوں سے مطمئن نہیں ہوتا، وہ سطح کے پرے ہر چیز کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے، محراب و منبر اور جبہ و دستار کی فضیلت بجا، مگر اسے شکوہ ہے تو یہ کہ

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند　　چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند

اور یہ سادہ پرکار اندازِ گفتگو تو سوائے شاعر کے اور کسی کے بس کی بات ہی نہیں۔

مشکلے دارم ز دانشمندِ مجلس باز پرس　　توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

خود اپنے متعلق اس کا فیصلہ یہ ہے ؎

ایں تقوی ام بس است کہ چوں واعظانِ شہر　　ناز و کرشمہ بر سرِ منبر نمی کنم

ہماری شاعری میں زاہدیت کو جس طرح "ریا" اور فریب سے یہ بتایا گیا ہے۔ کفر کی پرستش میں جو گیت گائے گئے ہیں اور رندی و مے خواری اور جنونِ عشق کو جس طرح مثالی زندگی کی اقدار کے طور پر پیش کیا گیا ہے ان کا تفصیلی ذکر تحصیلِ حاصل ہوگا۔ صرف یاد دہانی کے لئے چند شعر پیش کرتا ہوں ؎

کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست　　ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست　　خسرو

بر من کہ صبوحی زدہ ام خرقہ حرام است	اے مجلسیان راہ خرابات کدام است	سعدی
شراب لعل کش و روئے مہ جبیناں بیں	خلاف مذہب آناں جمالِ ایناں بیں	حافظ

ایک مشہور قطعہ اور سنتے چلیے:

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار — ساقی و شرابے و مغنی و سرودے
زنہار ازاں قوم نہ باشی کہ فریبند — حق را بسجودے و نبی را بدرودے

ان اشعار میں جو نقطۂ نظر ملتا ہے وہ معمولی لوگوں کا نہیں ہے، نہ ان لوگوں کا جنہیں محض زاہد کی پگڑی اچھالنے میں یا شیخ کی داڑھی پر بات ڈالنے میں کوئی مزہ مل سکتا تھا۔ یہ سب باتیں آپ اور مجھ سے زیادہ راسخ العقیدہ مسلمان شاعروں نے کہی ہیں۔ اتنے ذی مرتبہ لوگ ہیں جو حافظ و سعدی اور امیر خسرو کے مذہبی عقاید کو شک کی نظر سے دیکھنے یا ان کی کفر پرستی کے باوجود انہیں کافر کہنے پر تیار ہوں گے؟ — آج تک تو مسلمان انہیں اولیا کا رتبہ دیتے آئے ہیں۔ اور مقبولیت تو انہیں شاید اولیا سے بھی زیادہ حاصل رہی ہے۔

تو گویا زاہدیت پر شاعر کا یہ عتاب اس لیے ہے کہ زاہدیت بے روح ہے۔ وہ ظاہر پرستی اور نمائش سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس کا سارا تار و پود رسمیات سے مل کر بنا ہے، اس کے وعظ و تدریس اس وجدانی ولولہ اور درد سے خالی ہیں جس کی شاعر کو تلاش رہتی ہے کہ وجدان کے ایسے ہی چھلکتے ہوئے لمحے شاعری کی متاع عزیز ہیں، اور انہی کو الفاظ کی گرفت میں لانے کا نام شاعری ہے۔ مذہب کے چشمے بھی وجدان ہی سے پھوٹتے ہیں، اور وجدان ہی کو آبیار کرتے ہیں۔ اسی لیے تو شاعری کو پیغمبری کا جزو مانا گیا ہے۔ اس حالت کے شاعر پیغمبر کا بروز ہوا۔ سچا مذہب جہاں باطنی صدق و صفا اور اخلاص و اتقا حاصل کرنے کا ذریعہ بنتا ہے اور خالق و مخلوق میں حائل پردے اٹھا دیتا ہے، وہاں وہ روح کو جذب و کیف کی ایک سرمدی لذت سے سرشار بھی کرتا ہے، مگر زاہدیت ان سب کیفیات سے عاری ہے۔ اسے خرقہ پشمینہ اور دستار و تسبیح کی زیادہ فکر رہتی ہے۔

مگر زاہدیت کے خلاف شاعر کی بغاوت کی وجہ ایک اور بھی ہے۔ زاہدیت کی فضا اتنی تنگ و تاریک ہے کہ اس میں زندگی سکڑ کے رہ جاتی ہے۔ اس کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ انسانی شعور و شخصیت کے پر کاٹ کر رکھ دیے جائیں۔ مگر شاعر طبعاً آزاد اور کھلی فضا میں سانس لینے کا عادی ہے۔ اس کو پابندیاں نہیں بھاتیں۔ ہاں مگر وہ جو اس کی فطرت اپنے لیے پسند کر لے۔ اس کی ذات سے الگ کوئی چیز اس کی روح پر پہرے نہیں بٹھا سکتی۔ کبھی کبھی شاعری کی بے راہ روی کو راہ پر لانے کے لیے عقل نے بڑی عیاری سے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا ہے، اس کو کسی نظریے یا عقیدے کی کوشش کی ہے، خود ہمارے زمانے میں ترقی پسندی جس میں زاہدیت اور نام نہاد عقلیت دونوں کے بہت سے عناصر پائے جاتے ہیں، شاعر کو ایسی ہی قید میں الجھانا چاہتی ہے۔ اتنا ضرور ترقی پسندی کا نظریہ کچھ اس قسم کے اشتہار سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا کہ "ضرورت مند شاعروں کو مادی جدلیت کا فلسفہ مہیا کیا جاتا ہے"۔

مختصر یہ کہ زاہدیت کے خلاف شاعر کی بغاوت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اس کی گھسی پٹی رسمیت کے عوض اپنی روحانی آزادی کو بیچ دینے پر رضامند نہیں ہوا۔ شاعر کے نظامِ اقدار میں سب سے بڑی قدر اپنی آزادی کو برقرار رکھنا ہے، اپنی روح اور احساس کو بندشوں سے آزاد رکھنے اور اپنے وجدانی جذب و کیف میں مست رہنے کو ہماری شاعری میں کبھی کفر کہا گیا ہے اور کبھی جنون یہ کفر شاعر کی تمثیل ہے، اس میں بڑی وسعت ہے اور بڑی لچک بھی، کیونکہ یہ انسانی فطرت کی ایک کیفیت کا نام ہے، اس کفر سے کسی کے مذہبی عقائد میں کوئی خلل نہیں پڑتا، یوں نہ ہوتا تو بھلا امیر خسرو جیسا ولی باصفا کیسے پکار اٹھتا ع

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست

جب ایک دفعہ کفر کی تمثیل شاعری میں آگئی، رفتہ رفتہ اس کے دوسرے لوازمات بھی عام ہونے لگے۔ بتخانہ و دیر کے ساتھ ساتھ قشقہ و زنار نے دل چرایا، مے خانے کی بساط بچھی تو ساغر و مینا کھنکے اور خرامِ ساقی و صدائے چنگ کے درمیان رندوں کی ہاؤ ہو کے نعرے گونجے جنون کا ذکر ہوا تو دشت و صحرا، چاک گریباں اور زنجیر پا یاد آئے۔ غرض شاعر نے اپنے تخیل کی مدد سے ایک پورا نگار خانہ آباد کر دیا۔

ہاں تو ذکر ہو رہا تھا شاعر کی کفر پرستی کا، اس کے بارے میں دو چار شعر سنئے ؂

کفر کچھ چاہئے اسلام کی رونق کے لئے   حسن زنار ہے تسبیح سلیمانی کا، میرؔ

اداسیاں تھیں مری خانقہ میں قابلِ سیر   صنم کدے میں تو ٹک آ کے دل لگا بھی ہے میرؔ

دیکھا جو حرم کو تو نہیں دیر کی وسعت   اس گھر کی فضا کر گیا معمار فراموش سوداؔ

اور اس کے ساتھ یہ دعویٰ بھی ملاحظہ ہو ؂

تب بھی پھونکے ناقوس صنم خانۂ دل شیخ   کعبہ کا ترے وجد میں دیوار و در آوے سوداؔ

مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میں اس قسم کے یہی چار شعر پیش کر سکا ہوں ورنہ یہ تو وہ مضمون ہے جہاں فارسی، اردو شعرا کھل کھیلے ہیں۔ لیکن اگر آپ ان چار شعروں ہی پر غور کریں تو آپ کو اس مزاج و رنگِ طبیعت کا تھوڑا بہت اندازہ ہو جائے گا جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے، خانقہ کی تنہائی میں رونق ہے نہ وسعت، تبھی تو وہ روحی اداس رہتا ہے۔ —— یہ بڑی بے انصافی کی بات ہو گی اگر ہم ان نوادر اشعار کی رمزیت کو سمجھے بغیر میرؔ اور سوداؔ کو نرے تماش بین اور دھوم دھڑکے کے شوقین تبانے لگیں۔ شاعری لفظوں کے لغوی معنوں سے نہیں، ان کے فضائی معنوں سے پیدا ہوتی ہے، اور اس کا مطلب، شعر کے مطلب سے اور اہم ہوتا ہے، ورنہ الفاظ کا پردہ اٹھا کر اس مزاج کی نبض پر ہاتھ رکھیے جو ان اشعار کی پشت پناہ ہے۔ کفر اور زاہدیت کا جواب ہے اس لئے کہ اس کی کھلی فضا میں شاعر کی آزاد روح اپنے آپ کو پاتی ہے اور اپنے پیر پھیلا پھیلا کر فضا کے نغمہ و نور اور ہوائے سرود کو اپنے اندر جذب کرتی ہے، یوں کہئے کہ اس کفر کے ذریعہ شاعر بھرپور زندگی گذارنے کی اپنی تمنا کا اظہار کرتا ہے اس لئے یہ کفر کوئی معمولی چیز نہیں۔ شاعر کی روح کا آدرش ہے اور بہت قابلِ احترام ہے اس کی منزل کٹھن ”کڑی“ ناہل

آدمی کا کام نہیں۔ میر نے کیا شعر کہا ہے ؎

کچھ عزت کفر آخر اے دیر کے باشندو — مجھ سہل کو تم کیوں زنار بندھاتے ہو

یہ وہ خرابات کی دنیا جو شاعر نے تعمیر کی ہے محض ناکردہ گناہوں کی حسرت کا نتیجہ نہیں، وہ دل فریب تو ہے ہی مگر بڑی گہری معنویت بھی اپنے اندر رکھتی ہے، یہاں شاعر اپنی تمام روحانی اقدار کو سمیٹے پھرتے دیکھتا ہے، یہیں کی خاک چھانتا چھانتا وہ کبھی عرفان کی منزل تک بھی پہنچ جاتا ہے اور پھر کس یقین اور رندی سے کہتا ہے ؎

ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم — اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما
ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما — حافظ

در خرابات مغاں نور خدا می بینم — ویں عجب بیں کہ چہ نورے ز کجا می بینم
جلوہ بر من مفروش اے ملک الحاج کہ تو — خانہ می بینی و من خانہ خدا می بینم — حافظ

زاہدیت تنگ نظر ہے اور بے درد ہے اس لیے شاعر نے اس کا چولا پہننے سے انکار کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے خرد کی غلامی بھی قبول نہیں کی۔ چنانچہ ہماری شاعری میں جگہ جگہ خرد کا دامن تار تار کیا گیا ہے آخر خرد سے شاعری کی نبھے کیسے، روح کی سرشاری منطق میں تو ڈھلنے سے رہی وہ تو صرف رقص و حالت میں ظاہر ہونا جانتی ہے۔ حافظ کی شاعری ایک مسلسل رقص و حالت کے سوا کیا ہے، اپنے تجربات کے اعتبار سے بھی اور اپنی لے اور لہجے کے اعتبار سے بھی، خرد کا دائرہ تنگ ہے، اس میں اتنی وسعت نہیں کہ شاعر کے وجدان کی پہنائیوں کو جگہ دے سکے، وہ تو بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ چلتی ہے، مقررہ رستوں سے ذرا ادھر ادھر نہیں ہٹتی اور بڑا پھونک پھونک کے قدم رکھتی ہے، یہ انداز بھلا شاعر کو کب راس آئے، اسی لئے تو وہ دشت و صحرا کا رخ کرتا ہے۔ اس کا جنون ازل سے آوارہ و سرگرداں ہے، اس کی کوئی رہ گزر نہیں، کوئی منزل نہیں۔

اس جنون و کفر کے پلے ہوئے مزاج کی ایک خصوصیت عشق کرنا بھی ہے، یہی عشق جس میں چشم و گوش کی لذتوں کے ساتھ دل کا خلوص و نیاز اور سپردگی کے جذبے پائے جاتے ہیں اردو، فارسی شعراء کا عشق ہمیشہ سے بڑی بدنام چیز چلا آیا ہے، کہنے والوں نے اس پر کیا کیا پھبتیاں نہیں کہیں مگر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ عام طور پر نظریں علامتوں اور دوسری تفصیلات میں الجھ کر رہ گئی ہیں، اردو کی عشقیہ شاعری کو آج تک صرف ایک نقاد ملا ہے، میری مراد ہے حضرت فراق گورکھپوری سے فراق کی حساس تنقید پڑھئے تو اردو شاعری کیا سے کیا معلوم ہونے لگتی ہے، فراق نے ہمیں بتایا ہے کہ عشق کس طرح شاعر کے مزاج کی تربیت کر سکتا ہے۔ اور یہ تو حقیقت ہے کہ اس عشق نے کہیں ہیں تو ہماری شاعری میں وہ نرمی اور لچک، وہ شیفتگی اور نکھار، وہ دردمندی، وہ برداشت اور حوصلہ، وہ تسلیم و رضا مختصر یہ کہ وہ دل آویزی پیدا کر دی ہے جسے روحانی کلچر کی معراج کہنا چاہیے۔ یہ عشق بڑی رچی ہوئی انسانیت کی درس گاہ ہے، یہ زندگی کے درد کا دارو ہے۔ یہ آپ کو جینا سکھاتا ہے، اس دنیا میں رہنا سکھاتا ہے۔ لیکن ہاں عشق کا یہ مزاج اردو فارسی شعراء میں عام نہیں ملتا۔ اسے اپنی پوری بلندی پر دیکھنا ہو تو میر کے ہاں دیکھیے، میر بقول فراق ہندوستان ہی کا نہیں شاید

ایشیا کا سب سے بڑا شاعر ہے، کہ ہے کم ایران تو اتنی شاندار روایات کے باوجود میر کے پایہ کا شاعر پیدا نہیں کر سکا۔ اب اس رائے کے ثبوت میں میر کے چند ایک شعر سنئے ؎

تمنائے دل کیلئے جان دی — سلیقہ ہمارا تو مشہور ہے

تنگ مت ہو ابتدائے عاشقی میں اس قدر — خیریت ہے میر صاحب دل سلامت چاہئے

بڑے سلیقے سے میری نبھی محبت میں — تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

اور پھر جب میر اپنی عشق میں ڈھلی ہوئی شخصیت پر غور کرتا ہے۔ تو گویا قیامت ڈھاتا ہے ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ — افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

دنیا کی سیر میر کی صحبت میں ہو گئی — قسمت سے مجھ کو آج یہ بے دست و پا ملا

اس بے دست و پا کا جواب کہاں ملے گا ؎

ہر چند میر بستی کے لوگوں سے ہے نفور — پر ہائے آدمی ہے وہ خانہ خراب کیا

دوسرا مصرع تو بس نہ دیدہ نہ شنیدہ

دیکھا آپ نے اس "کفر جنون و عشق" کے سلسلے میں ہمارے ہاں کس دل و دماغ کے لوگ پیدا ہوئے ہیں، اور اس کے سہارے ہماری شاعری کن کن رفعتوں کو چھو آئی ہے مگر اس مزاج کی پرورش بڑے جان جوکھوں کا کام ہے، اس راہ میں کالے کوس پڑتے ہیں خود شاعر یہاں کھیت ہو گئے ہیں، آخر کتنے ہیں جو صحیح سلامت منزل تک پہنچے ہیں یہ روحانی ریاضت ہے جس میں زاہد تو کیا فلسفی خون تھوک جائے۔ مگر اس وادی میں قدم رکھنا اسے کہاں نصیب؟

ہماری شاعری نے کفر پرستی کے ذریعہ رچی ہوئی انسانیت کا "پیغام" دیا ہے، بھرپور زندگی کا "پیغام" دیا ہے ان تمام صدیوں میں شاعر نے ظاہر پرستی کے بت توڑے ہیں۔ اور تن تنہا دور کی جنگ لڑی ہے اپنے وجدان کے آدرشوں اور اعلیٰ انسانی اقدار کی جنگ لڑی ہے، اس لئے مخالف ہواؤں میں بھی اپنی شمع روشن کی ہے روشن رکھی ہے۔۔۔ شاعر اور اس کی دنیا باقی ہے تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، رشید وطواط نے شاید یہی سوچ کر کہا تھا ؎

از صد سخن پیرم یک نکتہ مرا یاد است — عالم نہ شود ویراں تا میکدہ آباد است

اب آخر میں مجھے ایک معذرت پیش کرنی ہے شاعری میں کفر کی بحث میں نے چھیڑ تو دی مگر مجھے اعتراف ہے کہ میں اسے پورے طور پر نبھا نہیں سکا اور یہ بہت تشنہ رہ گئی ہے۔ اصل میں میں نے یہ مضمون کچھ رواروی میں لکھا ہے، مثالیں بھی صرف وہی دے سکا ہوں جو لکھتے لکھتے یاد آتی رہیں، مجھے یقین ہے کہ تلاش کے بعد ان سے بہتر اور زیادہ تعداد میں مثالیں دستیاب ہو جائیں گی۔ آپ اسے مضمون نہیں چند اشارے سمجھئے، شاید اسی صورت میں یہ قابل برداشت ثابت ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر سعید اللہ

ہم جنسیت پر ایک اجمالی نظر

ہمجنسیّت عبارت ہے اس جنسی رجحان سے جو بعض مردوں میں دوسرے مردوں کے لئے اور بعض عورتوں میں دوسری عورتوں کیلئے پایا جاتا ہے۔ ہمجنسیت کو خلاف وضع فطرت کا مترادف سمجھنا غلطی ہے۔ ہمجنسیّت دو قسم کی ہوتی ہے ایک پیدائشی اور دوسری اکتسابی۔

پیدائشی ہمجنسیّت | جس طرح مرد کی فطرت میں پیدائشی طور پر یہ رجحان موجود ہوتا ہے کہ اسے عورت سے جنسی محبت ہے۔ اسی طرح عورت میں بھی پیدائشی طور پر یہ رجحان ودیعت ہوتا ہے کہ مرد کی طرف اُسے جنسی کشش ہو مگر اس کلیئے کے مستثنیات بھی قدرت کی ستم ظریفی نے پیدا کر رکھے ہیں۔ اچھی خاصی تعداد ایسے مردوں کی ہمارے درمیان موجود ہے جن کی جسمانی ساخت اور جنسی اعضا تو مردوں کے سے ہیں مگر ان کے لئے عورت نہ صرف یہ کہ وہ کوئی جنسی کشش نہیں رکھتی۔ بلکہ اسے چھونا تک ان کے لئے ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ ایسے مرد فطرتاً اپنی نوع یعنی مردوں سے جنسی محبت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ایسے مرد یہ نہیں چاہتے کہ وہ بحیثیت مرد کے کسی عورت سے جنسی محبت کریں بلکہ ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کوئی مرد ان سے جنسی محبت کرے اس صورت حال کو پیدائشی ہمجنسیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور ایسے مردوں کو ہماری زبان میں مخنثے، زنخے یا زنانہ کہا جاتا ہے۔

یہ ہمجنسیت صرف مردوں تک ہی محدود نہیں۔ قدرت نے ایسی عورتیں بھی پیدا کی ہیں۔ جو جسمانی اور جنسی اعضا کے لحاظ سے تو عورت ہوتی ہیں مگر ان کے لئے مرد جنسی کشش نہیں رکھتا۔ ایسی عورتیں اپنی نوع یعنی عورتوں سے جنسی محبت کرنے کی خواہش مند ہوتی ہیں اور یہ نہیں چاہتیں کہ کوئی مرد ان سے جنسی محبت کرے بلکہ وہ اس بات کی خواہش مند ہوتی ہیں کہ وہ بطور مرد کے کسی عورت سے جنسی محبت کریں۔ ہمجنس مرد کے لئے تو ہماری زبان میں مخنثے۔ زنخے یا زنانہ کے الفاظ موجود ہیں۔ مگر غالباً ایسی عورت کے لئے ہماری زبان میں کوئی لفظ موجود نہیں۔

لغات | یہ بات واضح طور پر پیش نظر رہنی چاہئے کہ اس مقالہ میں لفظ جنس اور اس کے مشتقات ہمجنسیّت۔ اسم صفت اور ہمجنس۔ اسم فاعل وغیرہ میں جنس کے معنے نوع کے نہیں ہوں گے جیسے اس مصرعہ میں ہیں ع کند ہمجنس با ہمجنس پرواز جنسی محبت شہوانی محبت کے معنوں میں استعمال ہوگی اور جب ہم لفظ ہمجنسیّت استعمال کریں گے تو اس کے معنے ایک نوع یا قسم سے تعلق رکھنے کی صفت عبارت نہ ہوگی بلکہ ہمجنسیت سے ہماری مراد وہ شہوانی یا جنسی تعلق ہوگا جو دو مردوں یا دو عورتوں کے مابین ہو اور لفظ ہمجنس سے مراد ایسا مرد ہوگا۔ جو عورت

کے بجائے دوسرے مرد سے شہوانی محبت کرتا ہے یا ایسی عورت ہوگی جو مرد کے بدلے اپنی ہی نوع یعنی عورت سے جنسی محبت کرتی ہے۔

یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئیے کہ پیدائشی ہمجنسیت نہ تو کوئی مرض ہے اور نہ اُسے بداطواری کا نام دیا جا سکتا ہے۔ قدرت کی ستم ظریفی نے مرد اور عورت کے علاوہ یہ تیسری نوع بھی پیدا کر رکھی ہے جس کے لیے متخالف نوع کے بدلے اپنی ہی نوع جنسی کشش رکھتی ہے۔ اگر ایک مرد ایک عورت سے جنسی محبت کرتا ہے یا ایک عورت ایک مرد سے جنسی محبت کرتی ہے تو یہ اس وجہ سے ہے کہ قدرت نے اس کی فطرت میں یہی جذبہ ودیعت کیا ہے۔ اب اگر ایک ہمجنس مرد اپنی ہی نوع کے ایک فرد یعنی مرد سے جنسی محبت کرتا ہے تو وہ بھی اپنی فطرت کے تقاضے کو پورا کرتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک ہمجنس عورت ایک دوسری عورت سے جنسی محبت کرتی ہے۔ تو وہ بھی کسی بداطواری کی مرتکب نہیں ہوتی۔ بلکہ اپنی فطرت کے مطابق عمل کرتی ہے۔ یہ تیسری نوع تعزیر کے بجائے ہماری ہمدردی کی مستحق ہے

آج سے کچھ عرصہ پیشتر علم النفس کے ماہرین کا یہ خیال تھا کہ ہمجنسیت پیدائشی چیز نہیں۔ بلکہ ایک ایسی بداطواری ہے جو اکتسابی ہے اس لئے یہ سماج کے خلاف جرم کی حیثیت رکھتی ہے اور ملک کے تعزیراتی قانون کے ماتحت سزا کی مستحق ہے مگر اب یہ نظریہ مسترد کر دیا گیا ہے۔ فرائیڈ ہمجنسیت کو اکتسابی قرار دیتا ہے لیکن یہ قریباً متفقہ فیصلہ ہے کہ ہمجنسیت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو پیدائشی اور دوسری اکتسابی۔ اگر ہمجنسیت پیدائشی ہے تو یہ نہ تو کوئی مرض ہے اور نہ بداطواری بلکہ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ اس نے مرد اور عورت کے ساتھ ایک تیسری نوع پیدا کر دی۔ ہاں یہ بات ظاہر ہے کہ اگر کوئی پیدائشی ہمجنس اپنے جذبۂ ہمجنسی کے ماتحت کوئی ایسی حرکت کرتا ہے جو سماج کے مفاد کے خلاف ہے تو وہ مجرم قرار دیا جانا چاہئیے۔ مثلاً اگر کوئی ہمجنس بچوں یا نوعمر افراد کو ورغلاتا ہے یا کسی قسم کی زبردستی کا مرتکب ہوتا ہے تو ایسی حرکت قابل تعزیر ہونا چاہئیے۔

اکتسابی ہمجنسیت

پیدائشی ہمجنسیت کے علاوہ اکتسابی ہمجنسیت والے افراد بھی خاصی تعداد میں ہمارے درمیان موجود ہیں۔ اکتسابی ہمجنسیت سے مراد ہے کہ ایک مرد میں یہ جذبہ پیدائشی طور پر تو موجود نہیں ہوتا مگر وہ گویا اس کی عادت پیدا کر لیتا ہے۔ ہر چند کہ فطری طور پر عورت اس کے لئے جنسی کشش رکھتی ہے مگر اس کے لئے ایسی صورت حالات پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی فطرت سے منہ موڑ کر عورت کے بجائے نوعمر لڑکوں سے جنسی محبت کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح ایک عورت بھی جنسی تسکین کے لئے عورت سے رجوع کر سکتی ہے اور کرتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ پیدائشی ہمجنسیت کے برعکس اکتسابی ہمجنسیت بداطواری ہے اور تعزیراتی قانون کے تحت جرم کا درجہ رکھتی ہے۔ نوجوان فوجی اور وہ سب ایسے مرد جو اکٹھے رہنے پر مجبور ہوں مگر انہیں عورت میسر نہ آئے وہ بطور بدل ہمجنسی محبت کرنے کی بداطواری کے عادی ہو جاتے ہیں۔ سکولوں اور کالجوں کی اقامت گاہوں۔ فوجی بارکوں اور راہب خانوں میں اس بداطواری پر کثرت سے عمل ہوتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ اکتسابی ہمجنسیت کسی فطری جذبہ کے ماتحت پرورش نہیں پاتی۔ یہ ایسی بداطواری ہے جو گویا ارادتاً پیدا کی جاتی ہے اور جو سماج کے مفاد کے سراسر خلاف ہے اور اس لئے جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے برخلاف پیدائشی ہمجنسیت قدرت کی پیدا کردہ ایک ایسی صورت حال ہے جسے اکتسابی ہمجنسیت کی طرح بداطواری کے نام سے یاد کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ یہ دونوں قسمیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ایک قدرت کی ستم ظریفی دوسری انسان کی بے راہ روی۔

بولیس امرد پرستی جس کا ابھی ذکر ہوا۔ اکتسابی ہمجنسیت کی وہ صورت ہے جس میں ایک مرد اپنی ہی نوع کے افراد یعنی نوعمر لڑکوں سے جنسی محبت کرنے کی بد اطواری پیدا کر لیتا ہے۔ اس صورت حال میں ہمجنس مرد کا کردار فاعل کا ہوتا ہے۔ مگر بولیس یا علت مشائخ اکتسابی ہمجنسیت کی وہ شکل ہے جس میں ایک مرد کو خاص وجوہ مفعولیت کا عادی بنا دیتی ہیں۔ یہ پیدائشی رجحان نہیں ہوتا۔ ہماری زبان میں اسے علت مشائخ یا علتِ ابنہ یا بولیس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس نام کی وجہ یہ ہے کہ یہ علت سن رسیدہ افراد میں پیدا ہوتی ہے۔ لفظ بولیس اسم صفت ہے اور بولیسیا یا مبیسیا اسم فاعل ہے یعنی علت مشائخ والا۔

مادر زاد ہیجڑے مرد، عورت اور ہمجنس کے علاوہ قدرت نے ایک چوتھی نوع بھی پیدا کی ہے۔ یہ مادر زاد ہیجڑے ہیں۔ یہ نوع ایسے مردوں اور عورتوں سے عبارت ہے کہ جن کے جنسی اعضا بچپن کی سی ابتدائی حالت میں رہ جاتے ہیں اور ان کی نشوونما نہیں ہوتی۔

خواجہ سرا ان مادر زاد ہیجڑوں کے علاوہ خود ساختہ یا مصنوعی ہیجڑے بھی ہیں۔ خواجہ سرا ایسے مرد ہوتے تھے جنہیں بادشاہوں کی حرم سراؤں کی خدمت بجا لانے کی خاطر جزوی یا کلی طور پر جنسی اعضا سے سبکدوش کر دیا جاتا تھا۔

پرانے زمانہ میں ترکستان میں زانی اور باغی کی یہ سزا تھی کہ اس کو عمل جراحی سے ہیجڑا بنا کر دربانی کی خدمت پر مقرر کر دیا جاتا تھا۔ یہ محلوں میں آتے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان لوگوں کا اتنا رسوخ بڑھا کہ بادشاہوں اور بیگمات کے مزاج میں دخیل ہو گئے یہاں تک کہ وزارت کے عہدے تک پہنچ گئے۔ جب امرا نے یہ کیفیت دیکھی تو مخبر اپنے بچوں کو ہیجڑا بنا کر بادشاہوں اور ان کے محلوں کے سپرد کرنے لگے اور یہ ایک بے عیب رسم مانی جانے لگی۔

ہمارے مغل بادشاہ جب ترکستان سے ہندستان آئے تو یہ رسم اپنے ساتھ لائے۔ محمد شاہ رنگیلے کے وقت سے اس فرقہ نے ترقی پکڑی کیونکہ بادشاہ مذکور نے غلامنیوں، اردا بیگنیوں اور ترکنوں کے بجائے ایسے لوگوں کو شاہی محلوں کی نگرانی سپرد کی اور انہیں ناظر اور خوجہ کے لقب سے ملقب کیا۔ ملک عنبر خواجہ سرا، ملک کافور خواجہ سرا کو جو مرتبہ حاصل ہوا وہ آپ جانتے ہیں۔ ناظر بسنت علی خان نے شاہ عالم اور دہلی کے آخری بادشاہ کے زمانہ میں نواب محبوب علی خاں نے اس زمانہ کے موافق اچھا درجہ پایا۔

ناچنے گانے والے ہیجڑے محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں جب خود ساختہ ہیجڑوں کی بہت کثرت ہو گئی اور انہوں نے دیکھا کہ رنگیلے کو راگ رنگ کا شوق ہے تو ان لوگوں نے ناچنا اور گانا اختیار کیا۔ اور اپنا علیحدہ فرقہ مقرر کیا اور میر گھوچی ایک خلیفے کو جسے میر جھجڑی کہنے لگے اپنا پیر قرار دیا۔ وہ گرو بنے اور مرید چیلے کہلائے اور پھر یہ گرو اور چیلے کا سلسلہ چل نکلا اور ان سب کا سردار بادشاہ کہلایا جس کی گدی یعنی تخت گاہ پہاڑ گنج واقع دہلی قائم ہوئی۔ شہر میں جہاں کہیں بچہ پیدا ہوتا ہے وہاں اس علاقہ یعنی برت کے ہیجڑے جا کر ناچتے گاتے ہیں اور بدھائی لیتے ہیں۔

ناچنے گانے والے ہیجڑوں میں بیشتر وہ پیدائشی ہمجنس شامل ہوتے ہیں۔ جو یا تو مع جنسی اعضا کے یا صد فیصدی عورت بننے کی خواہش کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے جزوی یا کلی طور پر جنسی اعضا سے سبکدوش ہو کر اور عورتوں کے کپڑے پہن کر ناچنے گانے کو اپنی روزی کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔

ہمجنسیت کی اہمیت جنسی تعلقات کی بے راہ روی میں ہم جنسیت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

۱- اوّل اس لئے کہ دوسری جنسی بے راہ رویوں کی بہ نسبت اس میں جنسی بھوک کی تسکین بہت زیادہ ہوتی ہے۔

۲- دوم اس لئے کہ اس کا احاطۂ عمل بہت وسیع ہے۔ ہمجنسیت نہ صرف انسانوں میں پائی جاتی ہے بلکہ ان جانوروں میں بھی موجود ہوتی ہے جو ارتقائی مدارج میں انسان کے قریب ترین ہیں۔ مثلاً بندر، بن مانس وغیرہ۔ ارسطو کے بیان کے مطابق بعض کبوتروں میں بھی یہ رجحان پایا جاتا ہے۔ وحشی اور غیر مہذب اقوام میں اسے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

۳- سوم اس وجہ سے کہ پرانی تہذیبوں میں ہمجنسیت کا احترام کیا جاتا تھا۔ نہ صرف جمالیاتی تعقلی بلکہ اخلاقی اور زوجی نقطۂ نگاہ سے اسے طبعی جنسی تعلق سے بہتر بادقار اور مردانہ رشتہ سمجھا جاتا تھا۔ چار ہزار برس گزرے مصر اور اسیریا میں اس کو بہت فروغ حاصل تھا۔ ان کے دیومالا میں ان کے دیوتا خلاف وضع فطرت عمل کرتے نظر آتے ہیں۔ مصر اور اسیریا کے علاوہ نارمنوں، سیتھیوں، ڈوری انوں کی تہذیب میں ہمجنسیت کا عام رواج تھا۔ اور اسے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ قدیم یونان والوں نے اس تعلق کو سب سے زیادہ فروغ دیا۔ افلاطون کو جب معلوم ہوا کہ سقراط اس کے حسن پر فریفتہ ہو گیا ہے تو اس نے اپنے استاد سقراط کو اپنے ہاں دعوت پر بلایا۔ کھانے کے بعد جب لیمپ گل کر دیئے گئے تو افلاطون اپنے استاد کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کے ساتھ جا لیٹا وغیرہ وغیرہ۔ افلاطون اس داستان کو مزے لے لے کر بیان کرتا ہے۔ اور اس پر یہ ستم ظریفی کہتا ہے اگر میں شراب کے نشے میں بہک نہ گیا ہوتا تو آپ یہ داستان میری زبان سے کبھی نہ سنتے۔

۴- چوتھی وجہ ہمجنسیت کی اہمیت یہ ہے کہ بہت سے مشہور عالم فنکار اور صاحب علم و فضل بزرگوں میں بھی یہ جنسی بے راہ روی موجود تھی۔ ریختی اور ریختہ گو شاعروں کے بارے ایک الگ مقالے کی ضرورت ہے۔

۵- ہمجنسیت کی اہمیت کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ ان عورتوں سے تو آپ واقف ہیں جو مردوں کے پاس اپنا جسم بیچتی ہیں۔ مگر ہمارے سماج میں ایسے مرد بھی ہیں جن کا پیشہ اوباش لڑکوں اور ہمجنسوں کی جنسی بھوک کی تسکین ہے۔ ہرش فیلڈ کا بیان ہے کہ جرمنی کے دارالسلطنت برلن میں تقریباً بیس ہزار مردوں کا یہی پیشہ ہے۔

پیدائشی ہمجنسیت اس مقالے کا موضوع پیدائشی ہمجنسیت ہے۔ اکتسابی ہمجنسیت اور ہیجڑوں کا تذکرہ اس لئے بیچ میں آ گیا کہ وہ پیدائشی ہمجنسیت سے کچھ اس طرح وابستہ ہے کہ ان کے ذکر کے بغیر پوری تصویر آنکھوں کے سامنے نہ آتی۔ اب ہم اپنے اصلی موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اب جو کچھ لکھا جائیگا وہ پیدائشی ہمجنسیت کے بارے میں ہوگا۔

تسکین ہمجنسیت کا مفہوم بیان کر دینے کے بعد قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عورتیں یا دو مرد جنسی ہیجان کی تسکین کے لئے کیا طریقہ اختیار کرتے ہیں تو اس کا جواب صاف طور پر یہی ہے کہ اس ایک فعل کے سوا جو صرف مرد اور عورت کے درمیان ظہور پذیر ہو سکتا ہے جنسی محبت کے دوسرے سب طریقے اور رسم و راہ استعمال ہوتے ہیں۔ خلاف وضع فطرت پر اس کثرت سے عمل نہیں ہوتا جس قدر کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ دو عورتوں یا دو مردوں میں جو جنسی تعلق ہوتا ہے۔ وہ ہیجان جذباتی شدت میں اس جنسی تعلق سے کس طرح کم نہیں ہوتا جو مرد اور

عورت کے درمیان ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمجنسی محبت میں یہ جذبہ ایسی گرمجوشی اور والہانہ پن پیدا کر دیتی ہے کہ مرد اور عورت کے تعلقات میں بھی اُسے ویسا درجہ اور ویسی تیزی و تندی حاصل نہیں ہوتا۔

متعلقہ جذبے مرد اور عورت کی جنسی محبت سے جو متعلقہ جذبے وابستہ ہیں وہ ہمجنسی محبت میں بھی موجود ہوتے ہیں بلکہ نسبتاً شدید شکل میں۔ ہمجنس مرد اپنے محبوب مرد سے اسی طرح شرماتا اور لجاتا ہے جس طرح ایک عورت مرد سے۔ اس کے علاوہ رشک، حسد، رقابت، کڑھنا وغیرہ سب شدت سے موجود ہوتے ہیں۔ ان متعلقہ جذبات کی موجودگی سے یہ بات صاف طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ جذبے کے لحاظ سے ہمجنسی محبت طبعی محبت سے کوئی الگ چیز نہیں۔ جنسی جذبہ تو وہی ہوتا ہے فرق اتنا ہوتا ہے کہ متخالف نوع کے بجائے خود اپنی ہی نوع کے فرد سے محبت کا تعلق ہوتا ہے۔

ہرجائی پن ہمجنس کا جنسی تعلق بطور استثنا کے دیرپا ہو تو ہو ورنہ ہمجنس عام طور پر ہرجائی ہوتے ہیں اور کسی ایک کے نہیں ہو رہتے۔ یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ ایسے تعلق دیرپا ہو بھی کیسے سکتے ہیں۔ ہمجنس ایسا مرد کہاں سے لائے جو اُس سے عورت کے سے دیرپا تعلق قائم رکھ سکے۔ یہی حال ہمجنس عورتوں کا ہے۔

جنسی اعضا اور ثانوی جنسی امتیازات ہمجنسوں کے جنسی اعضا میں تو بطور استثنا کوئی امتیازی بات ہو تو ہو۔ ورنہ اُن کے جنسی اعضا ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے طبعی مرد اور عورت کے۔ ہاں ذہنی اور جسمانی ثانوی امتیازی نشانات میں ہمجنس اپنے ہم نوع افراد سے نمایاں طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ ایک ہمجنس مرد کا بیان ہے کہ "میں نام تو مرد مگر میری روح عورت کی ہے"۔ ہمجنس مرد کام کاج، بناؤ سنگھار، بول چال، حرکات و سکنات، جذباتی مظاہر اور ذوق میں بالکل عورت ہوتا ہے۔ ہمجنس عورت کی کیفیت اس کے برعکس خیال فرمایئے۔

جہاں تک جسمانی ساخت کا تعلق ہے ہمجنس مرد کے ڈاڑھی بہت کم، آواز باریک، اور کولھے چوڑے ہوتے ہیں جو عورت کی جسمانی ساخت کی یاد دلاتے ہیں۔ بعض مرد ہمجنس سیٹی نہیں بجا سکتے۔ یہ بات ضرور ہے کہ جس قدر واضح فرق نفسیاتی امتیازات میں ایک عام مرد اور ہمجنس مرد میں ہوتا ہے ایسا نمایاں فرق دونوں کی جسمانی ساخت میں نہیں ہوتا۔ بعض ہمجنس مرد ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں مردانہ پن موجود ہوتا ہے۔ مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔

سو فیصدی "عورت" بننے کے لیے ہمجنس مردوں میں یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ وہ عورتوں جیسے کپڑے پہنیں۔ ظاہر ہے کہ یہ خواہش چھپ چھپا کر ہی پوری کی جا سکتی ہے۔ اکثر شہروں میں ہمجنس مردوں کے اپنے کلب ہوتے ہیں۔ جہاں وہ دل کے ارمان بہ اطمینان خاطر نکال سکتے ہیں۔

ہمجنسیت کے امتیازی نشان بچپن کے پہلے تین برسوں کے اندر اندر ظاہر ہو جاتے ہیں مگر ایسے ہمجنس بھی ہوتے ہیں جو سن بلوغ کو پہنچنے تک اپنی ہمجنسیت کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہوتے۔ سن بلوغ کو پہنچ کر کوئی ایسا واقعہ پیش آتا ہے جس سے اُن پر یہ راز آشکار ہوتا ہے کہ عورت کو چھونا تک ان کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ ہمجنس لڑکا لڑکیوں کے کھیل پسند کرتا ہے۔ انہیں کے ساتھ کھیلتا ہے۔ ماں سے ہر دم چپکا رہتا ہے۔ اس کے برعکس ہمجنس لڑکیاں لڑکوں کے گروہ میں جا شامل ہوتی ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہمجنسوں میں جنسی ارتقا نسبتاً تیز رفتاری سے چلتا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عام راہ سے ہٹ کر کوئی دوسرا قصہ ہے۔

اخلاقی حس

ہمجنسوں کی اخلاقی حس بھی عوام سے علیحدہ پہچانی جاتی ہے اس میں شک نہیں کہ نہایت شریف اور معزز ہمجنسوں کی بھی کمی نہیں مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ بہت سے ہمجنس اخلاقی طور پر کم درجہ کے ہوتے ہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ ہمجنس شدت سے جھوٹ بولتے ہیں غالباً اس کج دار و مریز والی صورت حال کی پیداوار ہوتی ہے جس میں قدرت کی ستم ظریفی نے انہیں لا ڈالا ہے۔ ذہنی اعتبار سے بھی ہمجنسوں کے مختلف مدارج ہیں اور اعصاب زدوں کی طرح ان میں مختلف قسم کی غیر طبعی باتیں پائی جاتی ہیں۔ اکثر ہمجنس کسی نہ کسی شکل میں اعصاب زدہ ہوتے ہیں اور انہیں یہ چیز ورثہ میں ملی ہوتی ہے۔

کیا ہمجنسیت مصیبت ہے؟

یہ سوال قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے کیا ہمجنس اس صورت حال کو جس میں قدرت کی ستم ظریفی نے انہیں لا ڈالا ہے اپنے لئے مصیبت سمجھتے ہیں؟ نہیں۔ ان کی اکثریت اس صورت حال کو اپنے لئے مصیبت نہیں سمجھتی۔ ایک عورت اگر عورت ہونے کو اور مرد مرد ہونے کو مصیبت نہیں سمجھتا تو ہمجنس ہمجنس ہونے کو کیوں مصیبت سمجھے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہمجنسیت کی تسکین ذرا مشکل کام ہے مگر بڑی حد تک یہی مشکل طبعی مرد اور عورت کے بھی درپیش ہوتی ہے۔ بہرحال واقعہ یہ ہے کہ سب تو نہیں مگر کثیر تعداد قدرت کی اس ستم ظریفی کی شاکی نہیں ہوتی۔ ہاں ان میں ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جن کا ضمیر ہمجنسیت کو ان کے لئے مصیبت بنا دیتا ہے مگر ان کی تعداد بہت ہی کم ہے۔

ہمجنسیت کے مدارج

یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ ہمجنسیت کے صفر سے سو فیصدی تک مسلسل مدارج ہیں۔ ایک لکیر کھینچئے۔ ایک سرے پر وہ شدید ہمجنس سمجھئے جن کے لئے عورت سے جنسی تعلق ناقابل برداشت ہے گویا جن کی فطرت میں اپنی ہی نوع یعنی مرد کی جنسی کشش سو فیصدی ہوگی اور عورت کی صفر۔ دوسرے انتہائی سرے پر وہ طبعی مرد ہوگا جو عورت سے تو سو فیصدی جنسی محبت کرتا ہے اور جس کے لئے اپنی نوع یعنی مرد کی جنسی کشش صفر کے برابر ہوتی ہے۔ ان دو انتہائی سروں کے عین وسط میں وہ مرد جگہ پائیں گے جن میں پچاس فیصدی ہمجنسیت موجود ہوگی اور اس کے ساتھ ہی عورت سے جنسی تعلق پیدا کرنے کا جذبہ بھی پچاس فیصدی ہوگا۔ اگر "سو فیصدی ہمجنس" اور "سو فیصدی طبعی مرد" کو ہم یک جنس کہیں تو ان کو "دو جنس" کہہ سکتے ہیں۔ ہم نے دو انتہائی سروں پر اور ایک عین وسط میں جو حد قائم کی ہے ان تین حدوں کے درمیان ہمجنسیت کے مسلسل مدارج خیال فرمائیے مثلاً اسی فیصدی ہمجنسی کشش اور بیس فیصدی صنف مقابل کی جنسی کشش وغیرہ وغیرہ۔

ہمجنسیت کے مسلسل مدارج کی طرح مختلف ذہنی اعمال (قوت حافظہ، قوت ارادی، تخیل، تعقل وغیرہ) کے بھی مختلف مدارج ہیں۔ لکیر کے ایک سرے پر سو فیصدی قوت ارادی والا فرد اور دوسرے سرے پر صفر فیصدی والا اور ان کے درمیان ایک سے ننانوے تک مختلف مدارج۔

ہمجنسیت کی تشخیص

ہمجنسیت کی تشخیص بالکل آسان بات ہے کیونکہ اس کے امتیازی نشانات دوسروں کی طرح ظاہر ہوتے ہیں۔ ہاں اس بات کی احتیاط ضروری

ہے کہ اگر کسی فرد سے گاہے بگاہے ہمجنسیت کے سے اعمال سرزد ہوں تو اُسے ہمجنسیت نہ سمجھ لیا جائے اور یہ احتیاط بھی ضروری ہے کہ دو جنسوں کو خاص ہمجنس یا خالص طبعی فرد قرار نہ دے لیا جائے۔

علاج جہاں تک علاج کا سوال ہے اس کے متعلق یہ بیان کرنا ہے کہ پیدائشی ہمجنسیت کی انتہائی صورت میں تو کچھ ہو نہیں سکتا۔ ڈاکٹر کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ ہمجنس کو واضح طور پر یہ بات سمجھا دے کہ ہمجنسیت کوئی مرض نہیں جس کا علاج ہو سکے۔ یہ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ تمہیں ہمجنس بنا دیا اس تقدیر پر تمہیں شاکر رہنا چاہیے۔ بہت سے ہمجنسوں کو جب یہ بات معلوم ہو جاتی ہے تو وہ عورت سے جنسی محبت کرنے کی سعی لاحاصل سے سبکدوش ہو کر اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔

اس خدمت کے علاوہ ڈاکٹر دوسری خدمت بھی انجام دے سکتا ہے جیسا کہ ظاہر ہے ہمجنس کی جنسی تسکین ذرا مشکل ہے اس لیے اگر تجرد لمبے عرصے تک چلے تو اکثر حالتوں میں اس کا نتیجہ اعصاب پر بہت ہی برا ہوتا ہے۔ اس گتھی کو سلجھانے میں ڈاکٹر خاصی مدد کر سکتا ہے اس کے علاوہ ہمجنس کے لیے مناسب ہے کہ وہ اپنی زندگی کا کوئی مقصد پیدا کرے تا کہ اس کی زندگی میں خلا نہ پیدا ہونے پائے اور اس کی توجہ مقصد کے حصول میں لگی رہے۔ ورزش، کھیلیں، فنون لطیفہ اور فلسفہ خاصی کارآمد چیزیں ہیں ان کے ذریعے سے اعصاب زدوں کو فائدہ پہنچتا ہے یہ ظاہر ہے کہ ہمجنس کو تجرد کی زندگی بسر کرنے پر راضی کرنا مشکل کام ہے کیونکہ طبعی افراد کی بہ نسبت ان میں جنسی ہیجان کی تندی و شدت زیادہ ہوتی ہے اور ان کے نظام عصبی کا ردعمل بھی تیز و تند ہوتا ہے۔ کئی ہمجنس اپنی جنسی ہیجان کی تندی و شدت سے تنگ آ کر عمل جراحی کرا لیتے ہیں اور جب یہ طوفان تھم جاتا ہے تو اطمینان کا سانس لیتے ہیں مگر کثیر تعداد ایسے ہمجنسوں کی ہے جو جنسی محبت سے دست بردار ہونے پر کسی طرح راضی نہیں ہوتے کیونکہ وہ اسے زندگی کا سب سے بڑا عیش تصور کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو جنسی تقاضے کی تسکین کے لیے ایسی راہیں اختیار کرنا پڑتی ہیں جہاں ملک کے تعزیراتی قانون کی زد میں آ جانے کا خطرہ نہ ہو۔ مگر جن افراد کا ضمیر ان مخدوش راہوں پر چلنے کی اجازت نہیں دیتا وہ جنسی ہیجان کو دباتے رہتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اکثر اعصاب کی بیماریوں اور دوسری الجھنوں میں پھنس جاتے ہیں۔ غرض "در گونہ عذاب است جان مجنوں را"۔ یہ تو ان ہمجنسوں کا قصہ تھا جو گویا سو فیصدی ہمجنس ہوں مگر ان ہمجنسوں کی کیفیت دوسری ہے جو ہمجنسیت کے درمیانی درجوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کو تجزیہ نفسی اور ہپناٹزم کے ذریعے سے اس حد تک راہ پر لایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی نوع کے افراد سے جنسی محبت کرنا ترک کر دیں اور صرف عورت سے محبت کریں۔ ان میں شادی کرنے اور بیوی کے ساتھ آرام و سکون کی زندگی بسر کرنے کی صلاحیت پیدا کی جا سکتی ہے مگر جہاں یہ نفسیاتی علاج ناکام ثابت ہو وہاں صبر و شکر کے بغیر چارہ نہیں یہی تلقین ڈاکٹر کو مناسب طریق پر کرنا پڑتی ہے۔

دوست محمد طاہر

"ہیر سیال" — وارث شاہ کا ایک ترقی پسند کردار

ترقی پسندی اس سرگشتگیٔ خمارِ رسوم و قیود سے، جس میں کوہکن تیشے ایسے عام اور مبتذل ہتھیار کو استعمال کئے بغیر نہیں مر سکتا، ہٹ کر کچھ کرنے کا نام ہے۔ جب بھی کسی ادیب نے اپنے دور وقت، ریت، رسم اور کہنہ دستوروں کا پابند نہ رہتے ہوئے پرانی اور بوسیدہ روشیں چھوڑ کر چمنستانِ زندگی میں نئی نئی راہیں پیدا کیں تو وہ ادیب اپنے ہم عصروں میں تو باغی کہلایا، مگر آنے والی پود نے اسے ترقی پسند ٹھہرایا۔ نئی روشیں کچھ عرصے کے بعد ایسی پامال ہوئیں کہ تنوع پسند طبیعتوں کو مبتذل سی معلوم ہونے لگیں اس وقت جو لوگ پرانی لکیروں کو پیٹتے رہے۔ رجعت پسند کہلائے۔ ترقی اور رجعت کے اس تعین کے بعد ہم وارث شاہ کے متعلق سوچتے ہیں کہ سرزمین پنجاب کا یہ باکمال شاعر کس لحاظ سے ترقی پسند تھا۔

دو سو سال پہلے وارث شاہ کے پنجاب کا تمدن ملاحظہ ہو، یہ تمدن ہو بہو وہی ہے جس کی تصویر شاہ نے ہیر کے کردار میں مرکوز کی ہے۔ عورت پر اپنے محبوب سے اظہارِ محبت کرنے کے معاملے میں متمدن سماج نے ایک عرصے سے پابندیاں عاید کر رکھی ہیں۔ تاہم عورت کو اپنے دل پسند شوہر کے ایجاب و قبول کا اختیار ہر زمانے میں داناؤں نے دیا اور ہر دفعہ "ناداناؤں" نے چھینا۔ سماج نے ایجاب و قبول کے حق کو ہمیشہ اپنی مرضی اور مفاد کے بھاری بوجھ تلے دبا یا۔ اسلام نے مرد عورت کے نکاح میں عورت کو ہاں، نہ کا پورا اختیار دیا مگر اسلام کے نام نہاد ٹھیکیداروں نے عورت کے اس جائز اختیار کو ہمیشہ اپنے حق میں محفوظ رکھا۔

دو سو سال پہلے کے پنجابی سماج میں عورت کو محبت پر کتنا اختیار تھا؟ — وارث شاہ کی ہیر ہمیں بتاتی ہے:۔

چرخ کج رفتار کو جب ملازم پیشہ رانجھے اور آہو چشم ہیر کا چوری چھپے باغوں میں ملنا ایک آنکھ نہ بھایا تو وہ ہاتھوں سے لگانے اور پیروں سے بجھانے والے کیدو کو لیجا کر اس نے وہ منظر دکھایا جہاں ہیر بیٹھی اپنی سیمیں انگلیوں سے چوری کے نوالے بنا بنا کر رانجھے کے منہ میں ڈال رہی تھی — کیدو نے یہ منظر دیکھ کر ہیر کی ماں ملکی سے شکایت کی:۔

.... دھی ویاہ ملکی! دھروئی رب دی من لے ڈائینے نی
لکے مار کے، وڈھ کے، کرس بیرے۔ اندر گھت کے کٹ سوسوائینے نی
دیکھ دھی دے لاڈ، کی ونڈ کڈھیں؟ انت جھور سیں وقت وہائیے نی
اکے بنھ کے بھورے دے وچہ سٹ، لنب وانگ بھڑولے دے آئیے نی
راز دھی تے زر، ایہ تن چیزاں رکھئے کج کے رن قصائینے نی
جنہاں ننگیاں رکھیاں وچہ وہیڑے انت کالڑے چور لے جانیئے نی

ملکی! خدا کے لئے تو جلد اپنی بیٹی کے بیاہ کی فکر کر یا اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے بیٹی کے لاڈ دیکھ دیکھ کر تو دانت کیوں نکالتی ہے؟ اسے باندھ کر بھورے میں ڈال دے اور اوپر سے گیلی مٹی کا لیپ کر دے۔ یاد رکھ راز بیٹی اور زر کو ہمیشہ چھپا کر رکھنا چاہیئے۔ ورنہ نادان عورت کسی دن کوئی کالا چور انہیں اٹھا کر لے جائے گا۔

ملکی دیور کی یہ رپورٹ سن کر غصے سے لال پیلی ہو جاتی ہے۔ اور کیدو کو حکم دیتی ہے:-

سدلیا نوں ہیر نوں ڈھونڈ کے تے، تینوں ماں سدیندی اے ڈائینے نی
خرذنبی اے، سوہنی اے، پاٹڑی اے نی مشٹنڈی اے چاک ولائینے نی

تو جا کر اس خرذات، سوہنی اور مشٹنڈی کو ڈھونڈ لا۔ چاکروں سے دل لگانے والی نابکار سے کہہ کہ تیری ماں تجھے بلاتی ہے۔

ہیر ہنستی ہوئی آ کر اندر جھانکتی ہے "جھا ...." کہہ کر ماں کو لاڈلے انداز میں "انبڑی" کہتی ہے۔ لیکن ماں جو غصے میں بھری بیٹھی ہے اس پہ برس پڑتی ہے:-

کوتل وانگ کھلی پھریں وچہ بیلے، آ ٹھہر لکند وچھیری اے نی
جوں جوں درجیا، توں توں سرے چڑھیں ہتھوں ہوئی ایں شوخ ددھیری اے نی
دھی جوان جے کسے دی بری ہووے، چپ کیتڑی چا بہیڑی اے نی
تینوں بڑا دماد ڑا جا گیا اے، تیرے واسطے منس سہیڑی اے نی

وڈھاسی ہو گئی، دہائی بادا! باغ باغیچوں میں کھلے بندوں لکند بچھیریوں کی طرح کدکڑے لگاتی پھرتی ہے۔ ادھر آ۔ جوں جوں تو بڑی ہوتی جا رہی ہے کسی کی سنتی ہی نہیں۔ اگر کسی کی جوان بیٹی بری نکل آئے تو ماں باپ کو چاہیئے کہ خاموشی کے ساتھ اس کا قصہ پاک

کردیں۔ اگر تجھے جوانی کی گرمی نے اتنا ہی بے تاب کیا ہے تو کہہ دے ہم تیرے لئے مرد کا بندوبست کردیں۔

ہیر ماں سے دبتی نہیں اور صاف کہہ دیتی ہے :۔

"بیلے جانے سے تو میں ہرگز نہیں ٹلواں گی" اور ہاتھوں سے سونے کے کڑے اتار کر ماں کے آگے پھینک دیتی ہے "لے پکڑ اپنی بخشش! تو لاکھ مجھے تختۂ دار پر لٹکانے کی دھمکیاں دے۔ میں چاکر رانجھے کو ہرگز نہیں چھوڑ سکتی"

ملکی بیٹی پر سارے جتن کر ہاری مگر وہ شوخ چشم لڑکی بالکل مرعوب نہ ہوئی۔ تنگ آکر ملکی نے ہیر کے باپ مہر چوچک سے کہا :۔

ہیر رلج سیالاں دی لاہ سٹی، ہیر نے چاک نوں یار کیتا
حال ہیں مت، دِتی، اگوں لڑن لگی، رلج لاہ کے چشاں نوں چار کیتا
کڈھ چاک نوں، کھوہ لے مجھیں سارا، اساں چاک توں جی بیزار کیتا

ہیر نے سیالوں کے خاندان کی عزت پر بٹہ لگا دیا ہے۔ تمہاری ہیر نے اپنے ملازم رانجھے کے ساتھ عشق بازی شروع کر دی ہے جب میں نے اسے نصیحت کی تو الٹا دیدے پھیر کر کے مجھ سے لڑنے لگی۔ تو اس ملازم کو گھر سے نکال باہر کر۔ اور اس سے بھینسوں کا ریوڑ چھین لے۔ ہم باز آئے ایسے ملازم سے۔

مہر چوچک نے یہ سن کر بڑے افسوس کے ساتھ کہا۔

ہم نے تو رانجھے کو غریب الوطن جان کر اس پر بھلا کیا تھا۔ مگر افسوس وہ ہمارے ساتھ بُرا پیش آیا۔ ہم نے اسے بھینسوں کے لئے رکھا تھا نہ کہ بیٹیوں کے لئے۔

ہزارے کے امیرزادے مگر سیالوں کے چاکر رانجھے کو بارہ برس بھینسیں چرانے کا صلہ ہیر کے کوچے سے بے آبرو ہو کر نکل جانے کی صورت میں ادا کیا گیا۔ وطن سے دھتکارا ہوا ایک بار اور روحانی صدمے سے دوچار ہوا اور چلدیا۔

ادھر رانجھے کے فراق میں ہیر کے چلن اچھے نہ دیکھ کر چوہدری چوچک نے بیٹی کو راہ راست پر لانے کے لئے قاضی کو گھر بلایا۔ اس خانگی عدالت میں ہیر مدعی باپ کو مخاطب کر کے کہتی ہے

. . . . بابلا! عملیاں تو عمل نہیں ہٹایا جاندا
واد یاں، عادتاں، جان نالیں، رانجھے چاک توں رہیا نہ جاندا
شینہ چترے رہن نہ ماس بناں جھٹ نالی ایہ رزق کمامیاں

داغ انب دی رسا والے ناہیں، داغ عشق والی نہ جالیاں

بابا! رنجوں سے مستی جدا نہیں کی جا سکتی۔ عادت جو طبیعت ہی بن جائے کیسے چھوٹ سکتی ہے۔ چاکر رانجھے کے بنا میں نہیں جی سکتی۔ شیر اور چیتے گوشت کے بغیر نہیں رہ سکتے اور جیسے سفید کپڑے پر سے آم کے رس کا داغ نہیں جاتا۔ اسی طرح میرے عشق کا داغ انمٹ ہے۔

مدعی ماں باپ ہار گئے اب قاضی کی باری آئی وہ اسے عشق کے ہولناک نتائج کا خوف دلاتا ہے:۔

نادان لڑکی! ابھی تجھے معلوم نہیں عشق کرنا کتنا برا ہے۔ سوہنی کا حال سن کہ وہ دریا میں ڈوب مری۔ بے درد عشق نے اس کے ساتھ کیسا برا سلوک کیا۔ سسی نق و دق صحراؤں میں آبلہ پا اور دیوانہ وار پنوں پنوں پکارتی ہوئی اس جہانِ فانی سے چل بسی۔ عشق بہت ظالم ہے اس سے باز آجا۔

ہیر سیدھی سیدھی کہتی ہے "میں تمہاری نصیحتیں نہیں سن سکتی۔ تم براہِ مہربانی یہ باتیں ان سے جا کہو جو سننے کے خواہشمند ہوں"

قاضی کی رگِ قضا پھڑک اٹھتی ہے۔ اب تو وہ خوف کا دوسرا ڈھنگ دکھاتا ہے۔

"سن اے لڑکی ہیر! باپ جب غصے میں آجاتے ہیں تو بیٹیوں کے سر تن سے جدا کر دیا کرتے ہیں۔ جو اولاد ماں باپ کے کہنے میں نہ ہو اس کا یہی علاج ہے۔ تو اگر اس بات سے باز نہیں آتی تو پھر ہمارے صرف کہنے کی دیر ہے۔ ابھی تیرا سر تن سے جدا کر دیں گے"

مگر معلوم ہوتا ہے ہیر دختر کشی کے متعلق اسلام کے احکام سے پوری طرح آگاہ تھی چنانچہ بے دھڑک قاضی کی بھبکی کا جواب یوں دیتی ہے:۔

پڑھے ہتیا، قوم اوہ نشٹ ہوئے دھیاں ماریاں قول گواہ قاضی
خدا گھات اولاد دے ناں کرنا لَا تَقْتُلُوْا حکم الٰہ قاضی
جنہاں بیٹیاں ماریاں، روز آخر سر تنہاں دے وڈا گناہ قاضی
جے کر خوشی جہان دی لوڑنے او، دیہو رانجھے نوں ہیر ویاہ قاضی

خدا کا عذاب نازل ہو اور وہ قوم تباہ ہو جائے جو بچیوں کو مار ڈالا کرے۔ خدا کا حکم صاف گواہی دیتا ہے۔ لَا تَقْتُلُوْا اَبْنَاءَكُمْ۔ اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔ بیٹیاں مارنے والوں کا حشر کے دن منہ کالا ہوگا۔ میں تم سے کہتی ہوں اگر تم لوگ دنیا میں کچھ خوشی دیکھنا چاہتے ہو تو رانجھے سے ہیر کو بیاہ دو۔

ہیر کا بھائی سلطان بھی آ پہنچتا ہے۔ باہر سے بہن کی رسوائی کا حال سن کر پہلے ہی بھرا ہوا ہے۔ آتے ہی ماں سے کہتا ہے۔

"ماں! اگر اب میں نے ہیر کو کبھی باہر جاتے ہوئے دیکھ لیا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ اگر تیرے کہنے پر گھر نہ بیٹھے تو میں تلوار سے اس کی گردن اتار دوں گا۔"

ہیر جانتی ہے کہ بھائی کو خاندان کی لاج بہت عزیز ہے۔ مگر مجبورِ محبت ہے۔ بڑے پیار سے اپنے ویر سے مخاطب ہوتی ہے۔

اکھیاں لگیاں مُڑن نہ ویر میرے! ایہا وار گھتی بلہاریاں وے
بری لکھی اے وچ نصیب میرے بھاویں وڈھ توں نال تلواریاں دے
اوّل روز دا لکھیا آن ملیا، ہیر گھول گھتی وار، واریاں وے
وہن پئے دریا دے نہ کدی مُڑدے ' وڈے لائیے زور زاریاں دے

میرے بھیا! میں تجھ پہ بلہاری، قربان!! تو نہیں جانتا لگی ہوئی آنکھیں کبھی الگ نہیں ہوتیں۔ میرے نصیبوں میں بُرا ہی لکھا ہے۔ چاہے تلوار سے تو میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ ہیر تجھ پر اپنی جان چھڑکتی ہے میرے بھیا! تو نہیں جانتا کہ دریا جو راستہ ایک دفعہ اختیار کر لیتا ہے لاکھ جتن کرنے پر بھی اُسے کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔

ماں باپ اور بھائی سب مہر بہ لب ہو جاتے ہیں۔ قاضی بھی آخری بار تنبیہہ کر کے ناامید ہو جاتا ہے۔ ہیر کا علاج یہی تجویز ہوتا ہے کہ اُسے کھیڑوں کے پلّے زبردستی باندھ دیا جائے — ہیر کی سسرال کو آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ جلد از جلد شادی کا سامان کر کے جھنگ آ پہنچے۔ شادی کا دن مقرر ہوا۔ قاضی جی نے پانچ ارکان کا بیان کر کے چھ کلمے پڑھے پھر کچھ عقد کے مسائل بتائے۔ آخر میں ہیر سے پوچھا "بی بی! تجھے کھیڑوں کا سید ا بعوض مبلغ دس ہزار روپیہ قبول ہے؟"

رانجھے چاک کی محبت کے "مہر" میں بکی ہوئی ہیر دس ہزار روپلیوں کے عوض میں فروخت ہونا کیسے قبول کرتی۔

میں تاں منگ رانجھیٹے دی ہو چکی ماں کفر تے غیب کیوں تولدی اے
اساں منگ درگاہ تھیں رانجھا لیا، صدق سچ زبان پئی بول دی اے
مکھن نذر رانجھیٹے دی کیتا، سُنجی ماں کیوں چھاچھ نوں رول دی اے
اساں جان رانجھیٹے دے پیش کیتی، راکھ کھیڑیاں نوں چا گھول دی اے

میری نسبت تو رانجھے سے پکی ہو چکی، لیکن میری ماں کیوں کفر تول رہی ہے۔ ہم نے اپنے لئے درگاہِ خداوندی سے رانجھا مانگ لیا۔ میری زبان سے جو کچھ نکل رہا ہے۔ عین سچ ہے۔ ہم نے تو اپنے شباب کا مکھن رانجھے کی نذر کر چکے۔ پھر میری ماں کیوں خالی چھاچھ بلو رہی ہے۔

—— اپنی جان تو ہم رانجھے کو پیش کر چکے۔ باقی راکھ ہے اس سے کھیلنے کا فائدہ ؟

قاضی کے نزدیک ہیر کی صاف گوئی سراسر بے شرمی پر مبنی تھی۔ چنانچہ اس نے کہا:۔

"کچھ شرم اور حیا کر اگر تجھے خوش رہنا ہے۔ حیا کی چادر سے اپنی ستر پوشی کر۔ حرامکاری (رانجھے کی محبت) کے چاک کو تجھے رفو کرنا ہی پڑیگا"

لیکن ہیر جواب دیتی ہے :۔

ایتھے سدا نہ رہیا مول کوئی، اوڑک جاؤنا چھڈ جہان میاں۔
رانجھا چھڈ کے نظر نہ غیر کرساں، بھاویں چل کے آوے جہان میاں

قاضی! اس فانی دنیا میں سدا کون رہا ہے؟ انجام کار ہر ایک کو جانا ہے۔ میں رانجھے کو چھوڑ کر اپنی نظر کسی غیر مرد پر ہرگز نہ ڈالونگی چاہے ایک عالم اکٹھا ہو کر ہی کیوں نہ چلا آئے۔

قاضی صاحب نے تلقین شروع کر دی:۔

تجھے اسلام کے راستے پر چلنا چاہیئے اور کفر کی جڑیں دل سے اکھاڑ پھینکنی چاہئیں۔ جو لوگ حلال کو ترک کر کے حرام کی طرف دیکھتے ہیں۔ یاد رکھ دوزخ کے سزاوار ٹھہرتے ہیں۔ اے اپنے حسن پر ناز کرنے والی الھڑ لڑکی! تو برادری کے بھائی بندوں کا کہا مان لے اور اپنے "حق حلال" شوہر کو قبول کرلے۔

ہیر جواباً کہتی ہے :۔

حکم رب دے تے عمل عاشقاں دے، نافرمانیاں قاضیاں ساہدیاں دے
جدوں کل جہان تے سوگ ہوے، تدوں قاضیاں دے گھر شادیاں وے
چوری پڑھن نکاح تے زبردستی، کدوں لکھیا ایہ حکم ہادیاں وے
شکل مومناں دی کم موذیاں دے، ایہ تاں اصل شیطان دیاں وادیاں دے

اسلام کے احکام پر اصل عمل کرنے والے تو ہم عاشق ہیں، تم قاضیوں نے تو نافرمانیاں اختیار کر رکھی ہیں جب ساری دنیا غم اور سوگ میں ہوتی ہے۔ اس وقت تم لوگوں کے گھر میں شادمانیاں ہوتی ہیں۔ مجھے یہ تو بتا! یہ چوری اور زبردستی کا نکاح پڑھنا کونسی آسمانی کتاب میں لکھا ہے شکل مومنوں کی سی ہے اور کام موذیوں کے سے ہیں۔ یہی تو اصل شیطان کی پہچان ہے۔

قاضی نے بھنا کر کہا:۔ جو لوگ شریعت کے راستوں پہ چلتے ہیں انہیں جھٹ سے جنت مل جاتی ہے۔ جہاں ماں باپ اور ہم قاضی

رضامند ہوں تجھے بھی اسی جگہ کی خواہش کرنی چاہیئے۔

ہیر رد دیتی ہے:۔

اک ویر دے قول توں پھیر پھرنا، کدوں ہویا ہی ایہہ فرمان قاضی
پہلا قول ہی قول کے بولنا سی، ہویا کس توں ایہہ نقصان قاضی
اک ماں تے باپ اجوڑ کردے، دوجا توہیں وچہ شیطان قاضی
رانجھے یار توں مکھ نہ مول موڑاں، جچر ہڈیاں وچہ ہے جان قاضی

قاضی! میں تجھ سے ایک اور بات پوچھتی ہوں، یہ جو تو شرع شرع کی رٹ لگا رہا ہے۔ بتا۔ تو شرع میں یہ کہاں آیا ہے کہ قول دے کر پھر جاؤ۔ ایک بار جب قول دیدیا تو اس سے پھرنا کہاں کا ایمان ہے ایک تو ماں باپ مجھے تنگ کر رہے ہیں۔ ایک تو شیطان ان کے ساتھ مل گیا ہے جب تک جان میں جان ہے۔ رانجھے یار سے میں کبھی منہ نہ موڑوں گی۔

قاضی آگ بگولا ہو جاتا ہے:۔

دُرّے شرع دے مار اُدھیڑ دیساں، کراں عمر خطاب دا نیاں ہیرے
گھت کھکھاں دے وچہ ساڑ سٹاں، تینوں ویکھسی پنڈ گراں ہیرے
جھیڑا کریں قبول جے خیر چاہیں، چھڈ رانجھیٹے دا ناں ہیرے
میرا آکھیا جے قبول کریں شالا ہو سیا وچہ جہان ہیرے

خبردار! اب جو زیادہ بولی، تو جانتی نہیں میں اگر عمرؓ ابن خطاب کے انصاف پر اتر آیا تو پھر دروں سے تیری کھال ادھیڑ دی جائے گی۔ تجھے خس و خاشاک کے ڈھیر میں بٹھا کر آگ دکھا دی جائے گی پھر اس تماشے سے تمام گاؤں عبرت حاصل کریگا۔ تو اگر اپنی خیر چاہتی ہے تو رانجھے کا نام لینا چھوڑ دے۔ میرا کہا مانے گی تو ساری دنیا تجھ پہ تحسین بھیجے گی۔

ہیر بڑے تحمل سے جواب دیتی ہے:۔

.... میاں قاضیا وے! کیوں چھیڑنا ایں شرک ہزاریاں نوں
اصل عشق دی واقفی نہیں تینوں، ملاکی خبر تینوں پارسیاریاں نوں
جس نوں لیوندے فی اس دی گل کر دے، رب مارے انہاں ہتھیاریاں نوں

میاں قاضی! تو کیوں شرک کے شراروں کو چھیڑتا ہے۔ دراصل تو عشق سے واقف ہی نہیں اور تجھ ملا کو اس کی خبر بھی کیا ہو سکتی ہے تم لوگ تو بس ایک بات جانتے ہو جس کا کھانا اسی کا گانا۔

مگر قاضی ہیر کی حدیثِ عشق کو غیر معتبر قرار دیتے ہوئے کہتا ہے: "جنہوں نے شرع کے قول کو رد کیا دوزخ کے نچلے طبقے میں ڈالے جائیں گے۔" دوزخ کی یہ طبقاتی تقسیم ہیر پہ کچھ اثر انداز نہیں ہوتی۔

ایس ضد دا کجھ سواد ناہیں، حق دا یک کیوں کھکنا ایں
تو تاں وڈھیاں کھا کے حق ردھیریں ہویوں تو چور اچکڑا راہ دا ایں

قاضی! تیری اس ہٹ دھرمی کا کچھ مزا نہیں آ رہا۔ کیوں بھر بھر خاک کی مٹھیاں پھانکتا ہے۔ تجھے تو رشوتیں کھا کر سچائی کو بہا دینے کی عادت ہے۔ تو تو اصل میں راہزن ہے۔

قاضی پینترہ بدلتا ہے اور بورژوائی ذہنیت اختیار کر کے ہیر کو رانجھے کی غربت کا احساس دلا کر بددل کرنا چاہتا ہے:

ہیرے تدھ نوں عقل نہ موت آوے کہیاں تدھ نے الٹیاں چاتیاں نی
سن سن کے تیرے کرتب ساریاں نیک بیبیاں شرم ماتیاں نی
کیہڑے ننگ دھڑنگ مکر پیتوں، جدھے پلڑے چار نہ پائیاں نی
نری ونجلی تے پئی توں مست ہوویں! اوہدے ہور کی پلے کمائیاں نی

ہیر کم بخت تجھے عقل آتی ہے نہ موت۔ تو نے کیسا غلط رستہ اختیار کیا ہے۔ تیرے کرتوت سن سن کر نیک اور شریف بیبیاں شرم سے پانی پانی ہوئی جاتی ہیں۔ نادان لڑکی! تو کس قلاش پہ جان دے رہی ہے۔ اس کے پلے تو چار کوڑیاں بھی نہیں۔ اس کی خالی خولی بنسری پہ تو کیا مست ہوئی جاتی ہے۔ مجھے بتا تو بنسری کے سوا اس کے پاس اور ہے بھی کیا؟

ہیر اپنے رانجھے کی توہین نہیں برداشت کر سکتی۔

تیری جان تے قہر نہانہ والا، اک دن پوے گا دیکھ بے دین قاضی
توں تاں ہو گیا ایں صاف مردار کافر، ہیرے رانجھے دی کر کے توہین قاضی
تینوں رانجھے دی شان معلوم ناہیں اوہ تاں ہے فخر العاشقین قاضی
رب کیتے محبتاں نال سوہنیاں، مکھ رانجھے دا ہی جمیل حسین قاضی

بے دین قاضی! یاد رکھ اک روز خدا کا قہر تجھ پر ضرور نازل ہوگا۔ میرے رانجھے یار کی توہین کرنے سے تو صاف کافر اور مردار ہو گیا ہے تجھے رانجھے کی شان معلوم ہی نہیں، وہ فخر العاشقین ہے۔ خدا خود حسینوں سے محبت کرتا ہے۔ اور اے قاضی رانجھا کا مکھڑا حسین و جمیل ہے

قاضی کی قاضیت ختم ہوئی تو وہ الٹے ہتھیاروں پر اتر آیا، اس نے چوچک ملکی اور سارے بھائی بندوں کو ہیر کا نکاح زبردستی کر دینے کا مشورہ دیا۔ ہیر نے اس وقت بڑے نفسیاتی انداز میں کہا:۔

دھی اپنی نوں پا دچہ ڈولی ہے کہ ترس تیہرے من آیا ای!

اے قاضی! اگر تیرے دل میں دین دنیا کا اتنا ہی ترس ہے تو میری بجائے ڈولی میں اپنی بیٹی کو ڈال دے۔

ہیر کی ایک نہ سنی گئی اور وہ عقد بالجبر کی تیاریاں ہونے لگیں، ہیر نے آخر میں صرف اتنا کہا:۔

.... قاضیا پا زیا وے دھکو دھکی نہ پڑھیں نکاح میرا

پہلے روز ہی عشق دے لڑ لگی، رب بخشیا کل گناہ میرا

پاجی قاضی! زبردستی میرا نکاح مت پڑھ۔ میں روزِ اوّل ہی سے عشق کے دامن کے ساتھ بندھ چکی ہوں۔ خدا نے میرے کل گناہ معاف کر دیئے ہیں۔

احساسِ شکست کے ساتھ ہیر کو یہ بھی بری طرح محسوس ہو رہا تھا کہ وہ آئینِ محبت کی خلاف ورزی کر رہی ہے۔ لیکن دل کو تسکین دینے کے لئے یہ احساس شاید کافی تھا کہ وادیٔ عشق میں پہلا قدم رکھتے ہی وہ جرم اور گناہ سے بے نیاز ہو چکی تھی۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا اس سے ہیر کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اپنا انجام آئینہ ایام میں وہ پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ قاضی کے ساتھ صاف صاف باتیں کرنے کے بعد اس کا جی ہلکا تھا۔ وہ بھڑاس جو عشق کے اس خاردار راستے پر چلنے والی ہیر کی دوسری بہنیں اپنے سینے میں قبر تک لے گئیں۔ ہیر کے دل میں نہ تھی۔

~~~~~~ • ~~~~~~

اہلِ ذوق کی مجلس طرب تنگ دلوں کے گوشۂ خاطر کی طرح تنگ نہیں ہوتی اس کی وسعت میں بڑی سمائی ہے۔ لیکن اتنی سمائی ہونے پر بھی اگر کسی چیز کی وہاں گنجائش نہ نکل سکی، تو وہ زاہدانِ خشک کے ضخیم اور گنبد نما عمامے تھے۔ ایک عمامہ بھی پہنچ جاتا ہے تو پوری مجلس تنگ ہو جاتی ہے۔

در مجلس ما زاہد تر نہ آ تکلف نیست البستہ تو می گنجی، عمامہ نمی گنجد

(ابو الکلام)
~~~~~~

محمد حسن عسکری

ہمارا ادبی شعور اور مسلمان

اس مضمون میں مجھے جو کچھ کہنا ہے اس کا سارا مفہوم یوں تو ایک جملے میں بھی آسکتا ہے۔ لیکن بعض دفعہ اختصار بڑا خطرناک ہوتا ہے، اور بات کا مطلب ہی بالکل بدل کے رکھ دیتا ہے۔ کہنا تو دراصل مجھے اتنا ہی ہے کہ غدر کے بعد سے مسلمان لکھنے والے اپنی قوم سے دور ہٹتے چلے گئے ہیں لیکن یہ سیدھا سادا سا بیان خالص ادبی حیثیت نہیں رکھتا، اس کے سیاسی اور عمرانی پہلو بھی ہیں۔ بلکہ "نئے ادب" کے متعلق یہ بات خاصتاً سیاسیات یا عمرانیات سے دلچسپی رکھنے والی بعض جماعتوں نے (بعض دفعہ خاص اغراض کے ماتحت) کہی بھی ہے۔ اس سیدھے سادے بیان سے ادب اور کلچر کی دشمن جماعتیں بھی فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ کوئی اس قسم کی بدگمانی پھیلانے کی کوشش نہ کرے تو بھی ایک عام مسلمان ایسے بیان سے دوچار ہوتے ہی چونک پڑے گا، اور تھوڑی دیر کے لئے اپنے ادب سے کھٹک ضرور جائے گا۔

مگر ادب کے سنجیدہ طالب علموں کی حیثیت سے نہ تو ہمیں کسی کو مطعون کرنا ہے نہ کسی کو الزام دینا ہے۔ ہمارا کام تو بس اتنا ہے کہ پچھلے سو سال کے اندر ادیبوں کے شعور میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں انہیں سمجھنے کی کوشش کریں، جو نئے میلانات نظر آئیں اُن کی نوعیت معلوم کریں، اور ہو سکے تو ساتھ ساتھ ان تبدیلیوں کے خارجی اور داخلی اسباب بھی دریافت کرتے چلیں۔ ہم نے اپنی جستجو کا دائرہ تو صرف چند عوامل تک محدود کر لیا ہے۔ مگر شروع میں ہی ایک کلیہ بیان کر دینے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم اسے قائم بالذات سمجھتے ہیں۔ کلیہ بیان کر دینے سے بس اتنا فائدہ ہوا ہے کہ ہمارا دائرہ عمل مقرر ہو گیا۔ اس بیان کے جھوٹ سچ کا فیصلہ نہیں ہوا۔ دوران تفتیش میں ممکن ہے کہ ہمیں ایسی باتیں ملیں جو اس کلیے کو غلط ثابت کرتی ہوں۔ پھر یہ ضروری نہیں ہے کہ جتنی باتیں ہم کہیں گے وہ سب سو فیصدی ٹھیک ہوں گی۔ غیر مرئی عوامل کے متعلق آپ جو بات بھی کہیں اُس میں اکثر تھوڑا سا مبالغہ ضرور ہو گا، مبالغے کے بغیر وہ عوامل الفاظ کی گرفت میں آ ہی نہیں سکتے۔ مبالغہ تو الگ رہا، ایسے عوامل کو سمجھنا ہو تو غلط بات کہنے سے بھی نہیں ڈرنا چاہیئے۔ جھوٹ کا پیچھا کرتے کرتے بعض دفعہ سچ سے مڈبھیڑ ہو جاتی ہے۔ سچ کا دشمن جھوٹ نہیں ہے بلکہ خود اطمینانی۔ غلط بات میں سے سچ بات پیدا ہو سکتی ہے، بشرطیکہ ہم غلطی کو صحیح طور سے سمجھ لیں۔

چنانچہ۔ یہاں بھی ہم غلط باتیں سوچنے سے نہیں ڈریں گے، بلکہ تعصب، تنگ نظری اور جلد بازی سے بھی نہیں شرمائیں گے۔ اصل چیز تو بات کہنا ہے۔ غلط یا صحیح، کسی نہ کسی قسم کا بیان سامنے ہو تو بحث کا کوئی نہ کوئی پہلو تو سامنے آ ہی جاتا ہے۔ پھر ہم اس بیان کو مختلف معیاروں سے پرکھ سکتے ہیں کہ یہ حقیقت سے مطابقت رکھتا بھی ہے یا نہیں۔ اس کے بعد ہم اس بیان کو قبول یا رد کر سکتے ہیں، اگر یہ بیان اطمینان بخش نہ ہو تو اسی قسم کے کسی نئے بیان کی تلاش بالکل نئے سرے سے کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم یہ بھی انتظار نہیں کریں گے کہ ہزار دو ہزار کتابیں پڑھ کے عالم بن لیں تو پھر کچھ سوچیں۔ اس کے بجائے ہم اپنی بے علمی سے بھی کام لیں گے، محض اپنی جہالت کے بوتے پر کوئی بات کہہ ماریں گے، غلط صحیح بعد میں دیکھیں گے۔ کوئی کتاب ہم نے پڑھی نہ ہوگی تب بھی اس کے بارے میں یوں ہی اٹکل پچو عقلی گدے لڑائیں گے کہ اچھا، اس میں یہ لکھا ہوگا۔ ممکن ہے اس میں کچھ اور ہی لکھا ہو۔ مگر یہ ہم بعد میں معلوم کر لیں گے، ورنہ اتنے اہل مدرسہ پھرتے ہیں، کوئی نہ کوئی راستے میں ٹھہرا کے ہمیں ٹوک ہی دیگا۔ غرض ہمیں کوئی نہ کوئی بات کہنی ضرور ہے۔ سوچ سمجھ کر یا بے سوچے سمجھے، اور کچھ نہیں تو کھیل ہی سہی۔ اکثر تخلیقی خیالات دل لگی ہی دل لگی میں پیدا ہوتے ہیں۔

سب سے پہلے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہم اپنے اس جائزے کی ابتدا غدر سے کیوں کرنا چاہتے ہیں۔ غدر تو ایک خارجی واقعہ تھا۔ یہ جس تبدیلی پر دلالت کرتا ہے اس کا عمل تو پہلے سے جاری تھا اور طبیعتیں اس سے متاثر ہونی شروع ہوگئی تھیں۔ یہ اعتراض اپنی جگہ بالکل بجا ہے۔ مغلیہ سلطنت دراصل غدر سے پہلے ہی ختم ہو چکی تھی، اور انگریزوں کا اقتدار قائم ہو چکا تھا۔ مگر انسان تو نشانیوں اور علامتوں کا محتاج ہے۔ بڑے سے بڑا انقلاب ہو جائے۔ مگر انسان کا شعور اسے اپنے اندر اس وقت تک جذب کرتا ہی نہیں جب تک کہ وہ ساری تبدیلیاں کسی علامت میں مجسم نہ ہو جائیں۔ جب تک لال قلعہ میں مغل بادشاہ بیٹھا تھا لوگ سمجھتے تھے کہ ابھی دنیا وہی ہے جو پہلے تھی۔ لال قلعہ کیا تھا حقیقت اور شعور کے درمیان اچھی خاصی دیوار تھی۔ لوگوں کو اصل صورت حال کا احساس دلانے کے لئے جانی بوجھی علامتوں کا غائب ہونا اور نئی علامتوں کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی اور روحانی زندگی میں غدر اسی قسم کی ایک علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ انگریزوں کی ترقی یا دوسرے عناصر کے ظہور میں آنے سے ہندوستان میں مسلمانوں کی قومی حیثیت کے لئے جو خطرات پیدا ہو گئے تھے ان سے مسلمان بالکل ہی بے خبر تھے۔ سید احمد بریلوی اور اسمٰعیل شہید کی پوری تحریک اس خیال کی تردید کرتی ہے۔ مسلمانوں کے ایک ذہین طبقے نے ان خطرات کی نوعیت کو صرف سمجھ ہی نہیں لیا تھا بلکہ عملی پیش بندیاں بھی شروع کر دی تھیں۔ عمل کی ضرورت کا احساس مولوی ملّاؤں تک ہی محدود نہیں تھا، بلکہ اس تحریک نے ہندوستان کے اس سرے سے لیکر اس سرے تک سب مسلمانوں کو براہِ راست پیغام دیا تھا۔ اور اس کے اثر سے ادب و شعر کے حلقے بھی اثر لئے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔ مومن کی "مثنوی جہاد"

اس بات کی بین شہادت ہے کہ شاعروں تک کو قوم کی صورتِ حال کا کیسا شدید احساس تھا۔ چنانچہ مسلمانوں پہ مکمل بے خبری کا الزام تو ہم نہیں لگا سکتے۔ البتہ مسلمانوں کا شعور اس بات کو تسلیم کرنے سے ضرور ہچکچا رہا تھا کہ ہم ایک غالب سیاسی قوت کی حیثیت سے ہندوستان میں ختم ہو چکے ہیں۔

مگر اتنا کافی سے کام کہاں چلتا ہے۔ غدر کے بعد تو اپنے آپ کو فریب دینے کی بھی گنجائش نہ رہی، اور مسلمانوں کو اپنی نئی حیثیت تسلیم کرنی پڑی۔ کچھ دن کے لئے مسلمان بالکل سُن ہو کے رہ گئے لیکن زندگی کی ضرورتیں سب کچھ کرا لیتی ہیں۔ آخر نئے حالات سے بھی سمجھوتا کرنا پڑا۔ سیاسی اعتبار سے تو خیر مسلمان مغلوب ہو ہی چکے تھے۔ اب مسلمانوں کے شعور میں ایک نئی جنگ کا آغاز ہوا۔ یعنی ہنداسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کے درمیان کشمکش۔ انگریز اُس قسم کے دشمن اور اُس قسم کے فاتح نہیں تھے جن سے اب تک مسلمانوں کو واسطہ پڑا تھا۔ اگر مرہٹے ہندوستان پر چھا جاتے تو اُن کے اور مسلمانوں کے درمیان آویزش کچھ اور ہی شکل اختیار کرتی۔ انگریزوں کی فتح کا سبب محض اتنا نہیں تھا کہ اُن کا کردار مسلمانوں سے بلند تھا، اُن میں ضبط و نظم زیادہ تھا، یکجہتی اور اتحاد تھا۔ یہ سب باتیں بھی ہیں، مگر بعض وقت ہمیں مارکسی تجزیہ بھی قبول کرنا ہی چاہئے انگریز اپنے ساتھ نئے علوم اور پیداوار کے نئے ذرائع لیکر آئے تھے۔ مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان محض کردار کی جنگ نہیں تھی، بلکہ اُس چیز کی جنگ تھی جس کے لئے بہترین لفظ "پراتیک" ہے ـــــ اس لفظ کے مفہوم میں سائنس کے علمی اور عملی دونوں پہلو آجاتے ہیں۔ انگریزوں کے ساتھ محض توپیں اور توپ خانے نہیں آئے تھے۔ بلکہ ریل گاڑی، تار اور نہ معلوم کیا کیا عجائبات اُن کے ساتھ ساتھ ہندوستان پہنچے تھے۔ اگر دو ایسی تہذیبوں میں ٹکر ہوتی جن کے اقتصادی اور سیاسی نظام کی بنیاد ایک ہی "پراتیک" پر ہوتی تو شاید ان میں سے کسی تہذیب کو بھی یہ ضرورت پیش نہ آتی کہ اپنے آپ کو خواہ مخواہ کمتر سمجھے ـــــ یعنی جس طرح ہندو اور مسلم تہذیبوں کے تصادم کے وقت ہوا تھا۔ لیکن انگریزوں کی تہذیب اپنے ساتھ ایسی حیرت ناک چیزیں لے کے آئی تھی جو ہمیں جن پریوں کی کہانیوں کی طرح ناقابلِ یقین معلوم ہوتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر خواہ مخواہ اپنی تہذیب اور اپنی اقدار کے کمتر ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ ان دونوں تہذیبوں کا تضاد محض غیر مرئی نہیں تھا۔ خارجی اعتبار سے بھی دونوں کی "اشیا" اتنی مختلف تھیں کہ یہ دونوں دو الگ دنیائیں معلوم ہوتی تھیں، اور اس اختلاف سے چشم پوشی کرنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔

اس اختلاف کے متعلق مسلمانوں میں دو قسم کا ردِعمل ہوا۔ مسلمان شکست تو ضرور کھا گئے تھے، مگر روحِ حیات بڑی سخت جان چیز ہے۔ وہ ایسی آسانی سے نہیں مرتی۔ چند سال کے تعطل کے بعد وہ بقا کے نئے طریقوں کی تلاش میں لگ گئی تھی۔ بقا کا ایک ہی طریقہ تھا کہ اپنے اندر کچھ ترمیم و تنسیخ اور ردّ و بدل کر کے نئے حالات سے مطابقت پیدا کی جائے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اپنی خودی کا احساس محض خارجی حالات کے دباؤ سے تبدیلیاں منظور کر لینے میں اپنی ہیٹی سمجھتا تھا۔ چنانچہ

مسلمانوں کے شعور میں تبدیلی اور جمود، بقا اور فنا کے درمیان جنگ جاری تھی۔ ایک طبقہ تو انگریزوں سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کو بنفسہٖ برا سمجھتا تھا، یہاں تک کہ انگریزوں کی ریل میں بیٹھنا بھی کافر ہو جانے کے برابر تھا۔ اس اندازِ نظر میں اپنی قومی شخصیت کا احترام، اسے قائم رکھنے کی آرزو، خودداری اور ہمت سے بلند جذبے جھلکتے ہیں۔ مگر آخر میں یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ فنا کا راستہ تھا۔ انگریزوں سے نہ سہی، "نئی" پراتیک سے سمجھوتہ کئے بغیر مسلمانوں کی اجتماعی بقا ناممکن تھی۔

دوسرا طبقہ ایسے لوگوں کا تھا جو تبدیلیوں کے لئے تیار تھے۔ ہم مانتے ہیں کہ یہ لوگ حقیقت پرست تھے، اور انہوں نے بقا کے راستے کو بالکل ٹھیک پہچانا تھا۔ ہمیں اُن کی عظمت تسلیم ہے۔ مگر بقا کے معنی یہ نہیں ہیں کہ نئے حالات میں اپنے آپ کو اس طرح بدلیں کہ اپنی اجتماعی شخصیت ہی باقی نہ رہے۔ اصلی بقا تو یہی ہے کہ قوم کی تخلیقی صلاحیتیں بھی نہ مریں اور اپنی انفرادی شخصیت بھی برقرار رہے۔ اس دوسرے طبقے کو قوم کی بقا کی بھی فکر تھی، اور قوم کی شخصیت سے بھی محبت تھی، مگر حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی فکر میں ان لوگوں سے بعض ایسی غلطیاں سرزد ہوئیں جن کا خمیازہ ہم کو اب تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔ ان لوگوں نے بالکل غیر شعوری طور پر چند ایسے رجحانات کا آغاز کیا جن کی وجہ سے مسلمانوں کی ذہنی، فکری اور کلچری نشو و نما ایسے جاندار طریقے سے نہیں ہو سکی جیسے کہ ہونی چاہئے تھی۔ بلکہ ہم نے اپنے کلچری ترکے میں سے بھی بہت کچھ کھو دیا۔

اس طبقے نے سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ اپنے اور انگریزوں کے درمیان جو سب سے بڑا فرق تھا اُسے مناسب طریقے سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ انگریزوں کی مادی ترقی کا اُن پر ایسا رعب پڑا کہ اپنا علم، اپنا ادب، اپنی تہذیب، اپنے طور طریقے سب کچھ ہلکے سے نظر آنے لگے۔ اُنیسویں صدی کے انگلستان کی بنیاد جس پراتیک پر تھی، اُسے تو انہوں نے گرفت میں لانے کی کوشش کی نہیں، اس پراتیک کی وجہ سے جو اقدار پیدا ہو رہی تھیں اُنہیں قبول کرنے کی فکر پہلے ہو گئی۔

اس زمانے میں خود یورپ والوں کا شعور ایک کشمکش میں مبتلا تھا۔ مگر ان لوگوں کو اس کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ انہوں نے انگلستان کے سیاسی اور معاشی نظام، ادب، کلچر سب کو بڑی سرسری نظر سے دیکھا تھا، اور اسی نظرے خوش گذرے میں دل بھی دے بیٹھے تھے۔ چنانچہ دونوں تہذیبوں کا گہرا اور تقابلی مطالعہ کئے بغیر وہ اس کوشش میں لگ گئے کہ اول تو اپنے یہاں کی ہر چیز کو مغربی معیاروں سے جانچ کر اُن میں وہ خوبیاں نکالی جائیں جو مغرب والوں کے نزدیک بھی خوبیاں ہوں، اور اگر کھینچ تان کے بھی خوبیاں نہ نکل سکیں تو پھر چار و ناچار اپنی چیز کو گھٹیا سمجھ لیا جائے۔ ایسی کوشش زندگی کے ہر شعبے میں ہوئی۔ چنانچہ سر سید نے قرآن اور سائنس کی مطابقت دکھانے کے لئے سینکڑوں صفحے لکھ ڈالے اسی طرح ادب میں "نیچرل" شاعری پیدا ہوئی، جسے اچھی شاعری تو کیا، اچھی نقل بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اگر مسلمانوں کو واقعی حالات سے ایسی مطابقت پیدا کرنی تھی کہ ایک دن خود مغرب سے ٹکر لینے کے قابل ہو جائیں تو انہیں سب سے پہلے مغرب کی پراتیک پر قبضہ جمانا چاہئے تھا۔ مگر اس زمانے میں مسلمانوں کو سب سے بڑی

تشویش یہ تھی کہ ہندو سرکاری ملازمتوں میں ہم سے آگے نکلے جا رہے ہیں۔ ہندوؤں کو دوڑ کے پکڑ لینے کی جلدی میں انہوں نے سائنس اور انجینئری جیسے علوم کی طرف توجہ نہیں کی، بلکہ انگریزی زبان اور انگریزی ادب پڑھتا ——— اور وہ بھی صرف اس حد تک، جہاں تک یہ چیزیں ملازمت دلانے میں کام آئیں۔ اس زمانے کے تمام اہلِ دماغ حضرات میں ایک اکبر الہ آبادی ایسا تھا جسے مسلمانوں کی پوری صورتِ حال کا گہرا اور سچا علم تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ مغرب کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے، صرف وہی ایک آدمی تھا جس نے انگریزوں کی لائی ہوئی چیزوں میں استعارے اور علامتیں دیکھیں، اور ان کے معنی اپنی قوم کو سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر اسے مسخرا یا پرانی لکیر کا فقیر سمجھ کر ٹال دیا گیا۔

غرض سرسید کی تحریک سے لے کر پہلی جنگِ عظیم تک ہمیں مسلمان اہلِ دماغ طبقے میں ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی نظر آتی ہے۔ جنہیں اپنے ذہنی عقیدوں کے باوجود ہند اسلامی تہذیب کی اقدار پر وہ یقین نہیں رہا جو ایک جیتی جاگتی قوم کے افراد کو ہونا چاہیئے۔ شبلی شرر اور ایسے دو چار مصنفین کی سرگرمیوں کے باوجود یہ لوگ اپنے ماضی اور اپنی روایات اور اپنے کلچری سرمائے سے گہری دلچسپی نہیں لے سکتے، ان سب چیزوں کو یہ لوگ ذرا شک کی یا بدیقینی کی نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔

پھر اسی زمانے میں ایک نیا سماجی مظہر نمودار ہوتا ہے جن لوگوں کو شہروں میں نوکریاں ملتی جاتی ہیں وہ اپنا آبائی وطن چھوڑ چھوڑ کر شہروں میں آتے جاتے ہیں۔ وطن میں اُن کے خاندان کا تعلق پُشتہا پُشت سے ایک نائی، ایک دھوبی، ایک بھنگی کے خاندان سے تھا۔ اور یہ سب خاندان ایک دوسرے کے معاملات سے انسانی دلچسپی لیتے تھے۔ مگر اب یہ تعلقات ٹوٹ گئے، اور شہر میں آکر ملازمت پیشہ لوگوں کا ملنا جلنا بس اپنے ہی جیسے لوگوں سے رہ گیا۔ چونکہ اہلِ دماغ طبقے اور عوام میں وہ پہلا سا ربط وضبط نہیں رہا۔ اس لئے ہمارے ادیبوں کی اپنی قوم سے بیگانگی روز بروز بڑھتی ہی گئی۔

مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس زمانے میں جو ادب پیدا ہوا وہ قوم کی زندگی سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے سرشار کی کتابیں، نذیر احمد کے ناول، سجاد حسین اور "اودھ پنچ" کے دوسرے لکھنے والوں کی تحریریں، یہ سب چیزیں براہِ راست قوم کی روزمرہ زندگی سے پیدا ہوتی ہیں۔ لاشعوری تعلقات کو ایک دم سے ختم کرنا ممکن نہیں ہوتا، ہم تو صرف یہ بتا رہے ہیں کہ اس قسم کے رجحانات اس وقت موجود تھے، یہ رجحانات رنگ بعد میں جا کر لائے۔

شاعری کی دنیا میں جو لوگ غزلیں لکھ رہے تھے انہیں تو خیر یہ کہہ کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ تو ایک روایت کو نبھا رہے ہیں۔ مگر لکھنؤ اسکول کی ماتمی شاعری میں یہ بات پہلی نظر میں دیکھی جا سکتی ہے کہ ان شاعروں کی زبان میں ایک ایسی "ادبیت" ہے جو میر، ذوق، آتش، امیر اور داغ کی زبان میں نہیں ہے۔ یہ بات صاف بتاتی ہے کہ اب شاعری اور شاعر عام زندگی کے دائرے سے دور ہٹ کر اپنی ایک دنیا الگ بناتے جا رہے ہیں۔ بیسویں صدی کے شروع میں، خصوصاً جب سے اقبال

نے شاعری شروع کی، نظم کی شاعری پہلے سے زیادہ فطری بن گئی اور وہ "نیچرل" شاعری کا سا تکلف اور تصنع کم ہوگیا۔ مگر ان نظموں کی زبان صاف طور سے روزمرّہ کی زبان سے بالکل الگ چیز ہے، اس میں فارسیت زیادہ ہے، ترکیبیں زیادہ ہیں۔ یہ بات بھی ہمارے ادبی شعور کا رُخ بتاتی ہے۔

اگر آپ کو مسلمان ادیب اور مسلمان قوم کی روز بروز بڑھتی ہوئی بیگانگی کا یقین نہ آیا ہو تو یہ بتائیے کہ اُردو ناول میں نذیر احمدؔ، سرشارؔ، سجاد حسین نے جس قسم کی نثر، جس قسم کی حقیقت نگاری اور جیسی روایت کا آغاز کیا تھا وہ اُنہیں کے ساتھ کیوں ختم ہوگئی، اور اُردو افسانہ کا یہ زرّیں دور شعلۂ مستعجل کیوں ہو کے رہ گیا؟ بات یہ ہے کہ ان مصنفوں کی ابتدائی نشو و نما ایسے ماحول میں ہوئی جب یہ نئے رجحانات پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اپنی قوم کی اجتماعی زندگی اُن کی نس نس میں رچ گئی تھی۔ اپنی قوم کو کم تر سمجھنے کے بعد بھی اُن کی محبت اور احترام میں کمی نہیں آسکتی تھی۔ اُن کی گرفت ہی صرف ایک قسم کی زندگی پر تھی۔ اس کے سوا وہ کسی اور زندگی کو سمجھ ہی نہ سکتے تھے۔ اس کے برخلاف اُردو کے نثر نگاروں کا جو اگلا گروہ ہمارے سامنے آتا ہے اس کی نشو و نما عام مسلمانوں کی روزمرہ زندگی سے بالکل الگ تھلگ نئے ماحول میں ہوئی۔ نہ تو عام مسلمانوں سے اُن کا وہ رشتہ تھا جو ان سے پہلے ہر آدمی کا ہوتا تھا، نہ مسلمانوں کی زندگی میں وہ ہم آہنگی اور کلچری وحدت باقی رہی تھی جو باغی سے باغی انسان کا سر اپنے آگے جھکا دیتی ہے۔ یہ لوگ نہ تو عام مسلمانوں کی زندگی کا اتنا احترام اور اُس سے اتنی محبت کرتے تھے کہ سرشارؔ یا نذیر احمدؔ کی طرح اُس کی عکاسی پر مجبور ہو جائیں، اور نہ دراصل انہیں اُس زندگی سے اتنی واقفیت ہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اُردو ادب میں کوئی ایسی بات بھی کرنا چاہتے تھے جو پہلے کبھی نہ ہوئی ہو، اور جو انگریزی ادب میں ہوتی رہی ہو۔ یہ لوگ جوان العمر تھے؛ اپنی سماجی روایتوں کو ناپسند کرتے تھے، اُن سے آزاد بھی ہونا چاہتے تھے، انگریزی ادب کی تقلید کی آرزو تھی مگر انگریزی کا مطالعہ بھی سرسری تھا بلکہ سرسری مطالعے کو بھی چھوڑ دیئے۔ سرشارؔ ہی کا مطالعہ کون سا بڑا وسیع تھا۔ مگر اس کے باوجود اُنہوں نے سروانٹیس اور ڈکنز سے اثر لیا۔ بات یہ ہے کہ ان کے تخیّل میں وہ تندرستی اور توانائی تھی جو اجتماعی زندگی میں شمولیت کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔ اس نسل کے لوگوں میں سماجی رشتوں کی کمی کے سبب وہ تخلیقی جان باقی ہی نہ رہی تھی۔ چنانچہ یہ لوگ کسی انگریزی مصنف سے متاثر بھی ہوئے تو کس سے، اوسکا وائلڈ سے۔ اُنہیں اپنا ہم جنس مل گیا۔ ایسے ادیبوں کے لئے اپنے ادب میں تھوڑی بہت دلچسپی پیدا کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہوتا ہے، اپنی شخصیت۔ پھر انہیں اپنی شخصیت کا بھی ایک تصور قائم کرنا پڑتا ہے۔ جسے یہ ہر وقت سامنے رکھتے ہیں۔ مگر اس راہ پر چلنا ہمارے ادیبوں کے لئے آسکر وائلڈ سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔ اُس کے پاس موسیقی تھی۔ مصوری تھی۔ اپنی شخصیت کو پہلودار بنانے کے اور بیس طریقے تھے۔ سجاد حیدر یلدرم، سجاد انصاری، نیاز فتحپوری کے پاس ایسی کونسی چیز تھی؟ اور ہاں، اس ضمن میں ابوالکلام آزاد کو بھی نہ بھولیئے۔ اُنہیں بھی تو اپنے اُوپر رنگین مزاجی

کا شبہ تھا ـــــ اس رویّے کا مکمل ترین اظہار انہوں نے "غبارِ خاطر" میں کیا ہے، اس سے پہلے کیا کرتے رہے، اس کا مجھے کوئی علم نہیں۔ کیونکہ میں آج تک آزاد صاحب کی تحریر کے دو صفحے بھی پڑھنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ غرضیکہ اس مدرسے سے متعلق ادیبوں کی خاص کاوش یہ ہوتی تھی کہ اپنے آپ کو ادیب ثابت کیا جائے۔ پھر اپنی ذہانت، جودت، حُسن پرستی اور "عورت" سے دلچسپی کا اشتہار دیا جائے۔ زبان ایسی استعمال کی جائے جو انسان کبھی بول ہی نہ سکیں، فارسی عربی الفاظ اور ترکیبوں کی بھرمار ہو تاکہ عام انسانوں کی زندگی، اُن کے طور طریقوں اور اُن کے اندازِ فکر اور اندازِ بیان سے مکمل بے تعلقی پُوری طرح واضح ہو جائے۔ ایک عجیب بات ہے کہ "نئے ادیب" اپنے عقیدوں اور اپنے ذہنی رجحانات کے لحاظ سے عام مسلمانوں سے بالکل الگ ہیں، مگر اُن کے یہاں عام مسلمانوں کی زندگی پھر بھی جھلک جاتی ہے۔ مذکورہ بالا ادیبوں میں سے بعض پکے مسلمان تھے یا کم سے کم سیاسی اعتبار سے عام مسلمانوں کے ساتھ تھے، مگر اُن کے یہاں مسلمانوں کی زندگی کا پرتو نظر ہی نہیں آتا۔ مگر اس گروہ کے ادیبوں کو فخر تھا کہ ہم عام لوگوں سے الگ ہیں۔ ایک معنی میں واقعی عام زندگی کے شور و شغب، مفادات اور دلچسپیوں سے علیحدگی ادیب کے لئے ضروری ہے ـــــ بلکہ پیغمبر کے لئے بھی۔ مگر یہ علیحدگی اس لئے ضروری ہے کہ چھوٹی چھوٹی ترغیبوں اور ہنگامی دلچسپیوں کی زد سے دُور ہٹ کر آدمی حیاتِ محض کو اپنے اندر جذب کر سکے۔ جو ادیب اس غرض سے عام زندگی سے الگ ہوتے ہیں اُنہیں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ لوگ ہمارے بارے میں کیا سوچتے ہیں کیا نہیں سوچتے۔ لیکن ہمارے "جمال پرست" ادیبوں کو اکثر اس کی بڑی تشویش رہتی تھی کہ لوگ اُن سے مرعوب بھی ہوں۔ ابوالکلام آزاد تو خیر سیاسی رہنما تھے ہی۔ اُن کے اندر بھی یہ عجیب تضاد ملتا ہے کہ ایک طرف تو وہ فخریہ دعوے کرتے ہیں کہ اگر اور لوگ مشرق کو جا رہے ہوں تو میں مغرب کی طرف جاتا ہوں، دوسری طرف اُنہیں یہ شکوہ ہے اُنہوں نے لوگوں کو صحیح راستے پر چلانے کے لئے بہتیرا زور مارا۔ مگر بدبختوں نے ایک سُن کے نہ دی اور آخر نتیجہ بھگتا۔ قوم سے علیحدگی پر فخر اور پھر رہنمائی کا دعویٰ، یہ اردو کے جعلی "جمال پرستوں" ہی سے ممکن تھا۔ "غبارِ خاطر" میں دو عبارتیں ایسی ملتی ہیں جو کم و بیش اس پورے گروہ کی نمائندگی کر دیتی ہیں۔ ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں: "بعض حالتوں میں گاڑی اسٹیشن پر رک بھی جاتی ہے، مگر عبداللہ کی صورت نظر نہیں آتی، جب نظر آتی ہے تو اس کی معذرتیں میری فکرِ کاوش آشنا کے لئے (فکرِ کاوش آشنا! کس خود اطمینانی کے ساتھ اپنی تعریف بھی ہو گئی ہے۔ اور پھر کاوش کے لئے مسئلہ بھی واقعی بڑا دقیق ہے) ایک دوسرا ہی مسئلہ پیدا کر دیتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ نسیمِ صبحگاہی کا ایک ہی عمل دو مختلف طبیعتوں کے لئے دو متضاد نتیجوں کا باعث ہو جاتا ہے۔ اس کی آمد مجھے بیدار کر دیتی ہے، عبداللہ کو اور زیادہ سلا دیتی ہے۔ الارم کی ٹائم پیس بھی اُس کے سرہانے لگی رہنے لگی، پھر بھی نتائج کا اوسط تقریباً یکساں ہی رہا۔ معلوم نہیں آپ اس اشکال کا حل کیا تجویز کریں گے۔ مگر مجھے شیخ شیراز

کا بتلایا ہوا حل مل گیا ہے، اور اس پر مطمئن ہو چکا ہوں۔

یاراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست

در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس"

انسانیت اور شریف طبعی تو دور کی بات ہے جس آدمی کے قلم سے ایسے جملے نکل سکتے ہیں میں تو اس کے اندر سچی خوش ذوقی بھی تصور نہیں کر سکتا۔ میں خود تو جمال پرستی کی صلاحیت نہیں رکھتا، لیکن بعض جمال پرستوں کی دو چار کتابیں میں نے خاصے شوق سے پڑھی ضرور ہیں۔ مگر یہ اکثر میں نے آج تک نہیں دیکھی —— دی موسے اور گوتیئے کا تو ذکر ہی کیا، شاید آسکر وائلڈ تک میں نہ ملے۔ ابوالکلام آزاد اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھتے ہیں: "شکر اور گڑ کی دنیائیں اس درجہ ایک دوسرے سے مختلف واقع ہوئی ہیں کہ آدمی ایک کا ہو کر پھر دوسرے کے قابل نہیں رہ سکتا۔ میں نے دیکھا ہے کہ جن لوگوں نے زندگی میں دو چار مرتبہ بھی گڑ کھا لیا، شکر کی لطافت کا احساس پھر ان میں باقی نہیں رہا۔" لطافت کا یہ سستا اور چھچھورا معیار شاید ہی کبھی جمال پرستی کے نام سے پیش کیا گیا ہو۔ جو آدمی "شکر کی دنیا" کا ہو جاتا ہے، اس کے پاس بس کلف دار سفید قمیص ہی رہ جاتی ہے، قمیص کے نیچے کچھ نہیں رہتا۔ افسوس تو یہ ہے کہ یہ آدرش صرف ایک فرد کا نہیں تھا، بلکہ کم و بیش مسلمانوں کے سارے تعلیم یافتہ طبقے نے اسے اختیار کر رکھا تھا۔ یہ طبقہ ظاہری نفاست کا ایسا دلدادہ ہوا تھا کہ قوت، عظمت، سب سے کنارہ کش ہو گیا تھا۔ "شکر" کی شوقینی کا جو نتیجہ ہوتا ہے وہی ہوا، اور مسلمان مشرقی پنجاب میں اپنے سات آٹھ لاکھ آدمی کٹوا آئے، اور پاکستان بننے کے بعد بھی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے مسئلے میں ہر ایک سے پوچھتے پھرتے ہیں کہ کدھر جائیں، کدھر نہ جائیں۔ ان سب کو شکر کے شہید کہنا چاہیئے۔

عوام سے بیگانہ ہو کر اس گروہ نے اردو ادب کو ایک اور سخت نقصان پہنچایا۔ میر امّن، غالب، سرشار، نذیر احمد، سجاد حسین، شرر وغیرہ کے زیر اثر اردو نثر نگاری اور انشا کی بڑی جاندار روایت پیدا ہو گئی تھی جس میں بڑی بڑی صلاحیتیں تھیں۔ ابوالکلام آزاد اور نیاز فتحپوری کے گروہ نے اس روایت کا گلا اس بری طرح گھونٹا کہ آج تک اردو نثر اس جھٹکے سے سنبھل نہیں سکی۔ مولانا عبدالحق کی رائے بالکل درست ہے کہ اردو نثر کو اس طرح مجروح کرنے کی ذمہ داری سب سے زیادہ ابوالکلام آزاد کے سر ہے۔ مگر اس زمانے میں جسے دیکھیئے اس بے روح اور بیمار نثر کا فریفتہ ہو گیا تھا۔ اس دور میں مجھے تو بس ایک آدمی نظر آتا ہے جس کی نثر میں علمی اور ادبی مضامین کے بیان کی اہلیت بھی تھی، اور وہ توانائی اور تازگی بھی جو عام لوگوں کی زندگی سے گہرا تعلق رکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ میرا مطلب مولانا محمدؐ علی کی نثر سے ہے، مگر یہ عجیب بات ہے کہ فراق صاحب کے علاوہ نہ تو کسی نے شاعری کے سلسلے میں ان کا ذکر کیا ہے، نہ نثر کے سلسلے میں۔ حالانکہ اپنے دور کے سب سے مقبول نثر نگار محمد علی ہی تھے۔ رہے ابوالکلام آزاد تو ان کی نثر کو تو میں نوجوانوں کے لیئے مہلک زہر سمجھتا ہوں۔ اس انداز کے دس بیس لکھنے والے ایک قوم کو ختم کر دینے کے لیئے

کافی ہیں۔

مگر اس کو کیا کیا جائے کہ سنہ ۱۹۲۰ء کے قریب یہی انداز چل پڑا۔ ہر آدمی اسی قسم کی عبارت لکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ چونکہ اس میں عربی فارسی کے کافی لفظ جاننے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لئے یہ انداز ہر آدمی کے بس کی بات نہیں تھا۔ چنانچہ اس کے زیر اثر ایک اور قسم کا انداز نکلا جو سنہ ۱۹۳۶ء تک رومانی افسانوں میں استعمال ہوا۔ اس میں نہ تو ابوالکلامی انداز کی شوں شاں، پھوں پھاں تھی، نہ عام زندگی سے رشتہ مضبوط رکھنے والی نثر کی قوت۔ اس نثر میں نہ تو علمیت کا زور تھا نہ "گرگٹ کی دنیا" کی وسعت اور گہرائی۔ ایک طرف تو عام زبان کے قریب آنے سے اجتناب کیا جاتا تھا، دوسری طرف ابوالکلام آزاد یا نیاز فتحپوری کی تھوڑی بہت شوخی اور تیکھاپن بھی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ اردو نثر میں بھی ایک مریل قسم کی "ادبیت" پیدا ہو گئی تھی جو عوامی زندگی سے حتی الامکان دامن بچاتی رہتی تھی۔ اسی طرح ان افسانوں کے موضوعات بھی زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتے تھے۔ ان افسانوں کے کرداروں کا نہ تو کوئی مذہب تھا، نہ قوم، نہ ذات، نہ طبقہ۔ جیسے ان کی روحیں ٹرٹراتی ہوئی تھیں۔ ویسے ہی ان کے خارجی مناسبات غیر معین شکل کے تھے۔ ان کرداروں کا دنیا میں اور کوئی کام ہی نہ تھا، بس پاک محبت کئے چلے جاتے تھے۔ اگر ان کی محبوبہ کو کبھی ان کی محبت کی پاکی پر شبہ ہوتا تھا تو وہ گلے میں سے باہیں نکال کر فوراً پوچھ لیتی تھی کہ اگر میں خوبصورت نہ ہوتی تو کیا تم مجھ سے ایسی ہی محبت کرتے؟ ..... بات یہ تھی کہ ان افسانوں کے لکھنے والے زیادہ تر متوسط طبقے کے ایسے نوجوان ہوتے تھے جو ڈپٹی کلکٹری کے خواب سے زندگی شروع کرتے تھے اور ختم ہوتے تھے کلرکی پر۔ مگر ان کا ذہن اس نتیجے کو کبھی قبول نہیں کرتا تھا۔ اس ذہنی مجبوری کی وجہ سے وہ اپنے کرداروں کی سماجی حیثیت اور ان کے گرد و پیش کی زندگی کو بالکل غیر معین رکھتے تھے۔ اس مجبوری کی وجہ سے وہ عام لوگوں کی زندگی سے بھی دلچسپی نہیں لے سکتے تھے۔ یہ درست ہے کہ اس دور میں بہت سے افسانے دیہات کے متعلق بھی لکھے گئے۔ لیکن دراصل ایسے لکھنے والوں کو بنیادی دلچسپی گاؤں کی زندگی سے نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ ان کی توجہ شہر سے بیزاری کے باعث تھی۔ گاؤں کو زندگی کی ایک اہم وحدت سمجھ کر نہیں لکھا جاتا تھا، بلکہ تفریح گاہ سمجھ کر۔

پھر اس زمانے میں مزاحیہ مضامین کی بھی بڑی ریل پیل رہی۔ مگر عموماً ان افسانوں کا موضوع زن مرید شوہر ہوتا تھا۔ ہمارے ادیبوں پر اس زمانے میں جو مجہولیت طاری ہو گی وہ اسی سے ظاہر ہے۔ چونکہ اردو نثر کی روایت ہی بیچ میں سے منقطع ہو گئی تھی۔ اس لئے وسیع اور ہمہ گیر قسم کا مزاح ہمارے یہاں سے اڑ ہی گیا۔ اب کوئی مچھو بیگ ستم ظریف یا تربھون ناتھ ہجر کی سی نثر لکھ ہی نہیں سکتا تھا جو زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعے سے مزاح اخذ کر سکے۔ لے دے کے وہی پھوہڑ قسم کا مزاح رہ گیا تھا۔ ہاں، البتہ ایک شوکت تھانوی کا مضمون "سودیشی ریل" ضرور ہے جس میں زندگی سے سنجیدہ اور وسیع دلچسپی کا نشان ملتا ہے۔ پطرس کے مضامین ابتذال سے تو ضرور خالی ہیں، مگر وہ بھی جلاوطنوں کا ادب ہیں۔ یہ مضامین بھی

قوم کی اجتماعی زندگی سے نہیں نکلے، محض چند افراد کی خوش طبعی کا نتیجہ ہیں۔

اس پورے دور میں (پریم چند کو چھوڑ کر) بس ایک عظیم بیگ چغتائی کے افسانے ہیں جن میں کچھ زندگی ہے۔ انہوں نے شعوری طور سے کوشش کی کہ نثر کو روزمرہ کی بول چال سے قریب لایا جائے، چنانچہ مدتوں بعد ہمیں اُردو نثر میں ایسی جیتی جاگتی شگفتگی اور تازگی نظر آتی ہے۔ پھر عظیم بیگ چغتائی اس دور کے واحد مصنف ہیں جنہیں ایک پورے طبقے کی نمائندگی (یعنی عکاسی) کا فخر حاصل ہے۔ پوری مسلمان قوم تو خیر ہمیں اُن کے صفحوں میں نہیں ملتی —— اُن معنوں میں بھی نہیں ملتی جن معنوں میں نذیر احمد کے یہاں ملتی ہے (یعنی قوم کے حساس ترین طبقے کی سنجیدہ ترین دلچسپیوں کی تصویر)۔ البتہ مسلمان متوسط طبقے کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں خود اعتمادی اور آزادی کا جو جذبہ پیدا ہو رہا تھا اس کی انہوں نے خوب نمائندگی کی ہے۔ چونکہ اس حد تک انہیں زندگی سے براہِ راست تعلق تھا، اس لئے اُن کے یہاں ایک ایسا اُبھار، ایک ایسا ولولہ نظر آتا ہے جو اس دور کے دوسرے مصنفوں میں بالکل مفقود ہے۔ بہرحال ایک محدود معنوں میں ہم عظیم بیگ کو مسلمانوں کا نمائندہ کہہ سکتے ہیں۔

مسلمان ادیبوں کا ادبی شعور اپنی قوم کی سنجیدہ ترین دلچسپیوں سے جیسا بے نیاز اور بے تعلق ہو گیا تھا اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ غدر کے بعد مسلمانوں کو جو سیاسی دشواریاں پیش آئی تھیں۔ اُن کی تصویر تو نذیر احمد نے "ابن الوقت" میں کھینچ دی، مگر خلافت جیسی تحریک کو اُردو افسانے میں کوئی نمائندگی نہیں ملی۔ زیادہ امکان اسی کا ہے کہ مسلمان ادیبوں کو اس تحریک سے پوری ذہنی ہمدردی ہوگی۔ مگر اس زمانے میں مسلمان ادیبوں کا سب سے بڑا ذہنی آدرش تو جمال پرستی تھا —— یا اپنے آپ کو جمال پرست ثابت کرنا —— انہیں قوم کی روحانی کاوشوں سے کیا محبت ہو سکتی تھی۔ اس کے برخلاف ہندی میں دیکھئے، ہندوؤں کی تحریکِ آزادی پر کتنے افسانے اور ناول ملیں گے۔ ہمارے ادیبوں نے نوجوان جان کے اپنی شخصیت کو کچلا، اور اسے اس قابل ہی نہ دکھا کہ ذاتی تسکین سے آگے کسی چیز میں اپنے آپ کو کھو سکے۔

ادیبوں کی طرف سے بھی ایک بات کہی جا سکتی ہے۔ اور وہ بڑی حد تک معقول ہے۔ ۲۳ء سے ۳۶ء تک مسلمانوں کی سیاست ہی کچھ عجیب گوں مگوں میں رہی، بلکہ مولانا محمد علی کی وفات کے بعد تو مسلمان من حیث القوم سیاست سے بالکل علیحدہ ہی ہو گئے۔ ایسی صورت میں ادیبوں پر مجہولیت طاری نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔ جب پوری قوم کی سنجیدہ دلچسپی بس اتنی رہ گئی تھی کہ دوسروں کا منہ تکتی رہے، تو ادیب ہی کیا تیر مار لیتے۔ وہ بھی زنانے بن گئے۔ وزیرے چنیں شہریارے چناں۔ یہ عذر مجھے تسلیم ہے۔ لیکن اگر مسلمان ادیبوں کو اپنی قوم کے ماضی، حال اور مستقبل سے شدید دلچسپی ہوتی تو ادیب اپنی قوم کی بے حسی کا تجزیہ ہی کر سکتے تھے، قوم کو طعنے تشنے ہی دے سکتے تھے۔ آخر اقبال کے رجائی پیغام کی نشوونما بھی تو اسی تعطل اور بے حسی کے زمانے میں ہوئی۔ قوم

جتنی جامد ہوتی گئی، اپنی قوم کی صلاحیتوں پر اقبالؔ کا ایمان بڑھتا گیا، اور آخر دنیا نے دیکھ لیا کہ اقبالؔ کا اعتماد غلط نہیں تھا — مسلمان قوم نے پاکستان کا مطالبہ منظور کرا لیا جو انسانی تاریخ کا ایک نادر واقعہ ہے۔ بات یہ ہے کہ اقبالؔ کی نظر مسلمان عوام پر گڑی ہوئی تھی، باقی مسلمان ادیب صرف اپنے آپ کو دیکھ رہے تھے۔

۳۰ء کے قریب مسلمان ادیبوں اور شاعروں کی اپنی قوم سے بے اطمینانی کی ایک نئی اور واضح علامت نظر آتی ہے، اب نظموں میں ہندی الفاظ کا استعمال بڑھ جاتا ہے، اور ہندو دیو مالا بھی شعوری طور پر اُردو شاعری میں داخل کی جاتی ہے مجھے اس پر قطعاً افسوس نہیں ہے، اُردو کے اندر جو کچھ بھی شامل ہوتا جائے گا اُردو کے خزانے میں اضافہ ہی ہوگا۔ میں تو محض معروضی طور پر ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں کہ اُردو نظم کے اسالیب میں یہ تبدیلی ہوئی۔ اور یہ تبدیلی ساتھ ہی ساتھ ہمارے ادبی شعور کی ایک حرکت کا پتہ بھی دیتی ہے۔ مگر یہ اضافے اپنی زبان کو وسعت دینے کے خیال سے یا ذہنی قوت کی زیادتی کی وجہ سے نہیں ہوئے۔ مسلمان ادیبوں نے ہندو فلسفے یا کلچر کا مطالعہ نہیں کیا، سنسکرت شاعری کے اہم عناصر سے واقفیت پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ بس آکاش، پریم وغیرہ، ذرا نرم قسم کے سو پچاس لفظ اور اوشا، لکشمی وغیرہ دیویوں کے نام لے لیئے، یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب کم از کم پڑھے لکھے مسلمان اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوئے شرمانے لگے تھے، اور ہندوؤں کی ہر چیز مسلمانوں سے اچھی نظر آنے لگی تھی۔ اگر یہ لوگ دونوں تہذیبوں کا سنجیدہ مطالعہ کرنے کے بعد ہندو کلچر کے حق میں فیصلہ کرتے تو کوئی شکایت کی بات نہیں تھی۔ اس سے اُردو میں ایک نئی خلاقی آتی۔ مگر ہمارے اکثر اہل قلم حضرات نے مسلمانوں کی سیاسی مشکلات کو سمجھے بغیر، مسلمانوں کی جنگ آزادی میں اوروں سے آگے رہنے کی ساری مثالوں کو بھول کر، یہ طے کر لیا تھا کہ مسلمانوں میں آزادی کی طلب ہے ہی نہیں، یہ قوم ہی ناکارہ ہے۔ چنانچہ جہاں تک ممکن ہو سکا ہمارے بعض ادیب اور شاعر اپنی بساط کے مطابق ہندو کلچر کی تقلید کرنے لگے۔ اگر یہ ادیب صرف اپنے آباؤ اجداد کا مذہب ترک کر دیتے تب بھی ادب کو کوئی ایسا سخت نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ مگر انہوں نے تو اس کلچری روایت سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی جو اُن کے خون میں شامل ہو چکی تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے، ایسے لوگوں کا ادب پھسپھس کے رہ گیا۔

۳۶ء میں ترقی پسندی یا نئے ادب کی تحریک شروع ہوتی ہے۔ مسلمان قوم اور مسلمان ادیبوں میں جو بیگانگی بڑھنی شروع ہوئی تھی وہ اب اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ مگر ایک بات ضرور ہے۔ ۳۰ء سے لے کر ۳۶ء تک نثر میں جو ادب پیدا ہوا تھا عام طور سے وہ کسی خاص اجتماعی گروہ سے متعلق تھا ہی نہیں یوں ہی ہوائی ادب تھا۔ نئے ادب کی بنیاد چونکہ حقیقت نگاری پر تھی۔ اس لیئے بعض افسانہ نگار مجبور ہو گئے کہ ایک خاص

جماعت کو اپنی نظروں کے سامنے رکھیں۔ چنانچہ اس مجبوری کے باعث مسلمانوں سے ذہنی بے تعلقی کے باوجود نئے ادب کی تحریک نے مسلمانوں کی زندگی کی جاندار تصویریں پیش کیں۔ مثلاً عصمت چغتائی کی ساری تصنیفات، احمد علی اور اختر اورینوی کے کچھ افسانے، بلکہ ایک آدھ افسانہ تو شاید ہر لکھنے والے نے اس قسم کا لکھ دیا ہوگا جس میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا عکس نظر آتا ہو۔ اس اعتبار سے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس دور میں اردو افسانہ پھر نذیر احمد کی افسانہ نگاری کی طرف لوٹ رہا تھا، اور اردو نثر میں ایک مرتبہ پھر جان پیدا ہو رہی تھی۔ مگر مسلمانوں کی اس تصویر کشی کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ مجموعی اعتبار سے مسلمان ادیب اپنے عقائد، اپنے تصورات، اور اپنے رجحانات میں مسلمان عوام سے بالکل الگ تھے۔ اب تک مسلمان ادیب اپنی قوم کی سیاست سے کم از کم ذہنی ہمدردی ضرور رکھتے تھے — تخلیقی دلچسپی نہیں تھی تو نہ سہی۔ مگر نئے ادیبوں کی غالب اکثریت کو مسلمانوں کے سیاسی عزائم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بہت سے ادیب تو مسلم لیگ کی سیاست کے سخت مخالف تھے، اور بہت سے ادیب بالکل بے تعلق اور بے نیاز تھے۔ اسی طرح یا تو ادیب پاکستان کے مطالبے کے خلاف تھے، یا پھر گو مگو کی حالت میں تھے اور سمجھتے تھے کہ پاکستان بن جائے تو ہمیں کیا نہ بنے تو ہمیں کیا۔ مذہب اور سیاست کا تعلق انہیں پسند تھا ہی نہیں۔ جن لوگوں کو اشتراکیت سے نظریاتی دلچسپی نہیں تھی، ان کا بھی یہی خیال تھا کہ سیاسی گتھیوں کا معاشی حل دوسرے سب حلوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ پھر یورپ کو تعریف کی نظروں سے دیکھنے کے لوگ ایسے عادی ہو چکے تھے کہ جو بات یورپ والوں کی عقل میں نہیں آسکتی تھی وہ ہمارے ادیبوں کی عقل میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ چنانچہ بیسویں صدی میں کسی جماعت کا مذہبی اختلاف کی بنا پر سیاسی حقوق مانگنا انہیں بالکل ناقابل یقین معلوم ہوتا تھا۔ مگر چونکہ مسلم لیگ کو عوام کی اتنی زبردست حمایت حاصل تھی، اس لئے وہ اس مطالبے کو جھٹلا بھی نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ ہمارے ادیبوں نے پاکستان کی نہ تو حمایت کی نہ کھل کے مخالفت ہی کی۔ اگر ادیب پوری سنجیدگی اور غور و فکر کے ساتھ پاکستان کے مطالبے کی پُرزور مخالفت ہی کرتے تب بھی قوم کو فائدہ ہی پہنچتا۔ اور مختلف مسئلوں کے بہت سے ایسے پہلو نظروں کے سامنے آجاتے جن کا پتہ پاکستان بننے کے بعد چلا۔ مگر ہمارے ادیب تو جیسے اپنے مستقبل کو قوم کے مستقبل سے وابستہ ہی نہیں سمجھتے تھے۔ غرضکہ اس دور میں ادیبوں نے اپنی حالت بھی عجیب معمے کی سی بنالی تھی۔ نہ تو اپنے آپ کو مسلمانوں سے بالکل الگ ہی کر سکتے تھے، نہ ان میں شامل ہی ہوتے تھے۔ چنانچہ اس اندرونی تضاد کی وجہ سے بعض مسلمان ادیب بڑی مضحکہ خیز قسم کی ذہنی الجھنوں میں پڑ گئے۔ کبھی کہا مسلم کلچر ہوتا ہے۔ کبھی کہا نہیں ہوتا۔ کبھی سوچا کہ اردو عوام کی زبان ہے، کبھی خیال آیا کہ نہیں، محض ایک طبقے کی زبان ہے۔ پھر ادیب سے یہ فکر دامن گیر رہنے لگی کہ ہمارے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جس سے فرقہ پرستی کی بو آتی ہو۔ آزاد خیالی کی ایسی دھن

اختر شیرانی (مرحوم)

چرواہا

شفق کی چھاؤں میں چرواہا جب بنسی بجاتا ہے
مرے افکار میں ماضی کا نقشہ کھینچ لاتا ہے
نظر میں ایک بھولا بسرا عالم لہلہاتا ہے

وہ بے پروائی جس سے ایک دن آباد تھا بچپن
وہ بے فکری کی باتیں جن سے اکدن شاد تھا بچپن
وہی نظارہ اس کے زمزموں میں مسکراتا ہے

وہ کھیتوں کی قطاریں اور وہ نظّارہ باغوں کا
وہ دریا کا کنارہ اور وہ گہوارہ باغوں کا
رسیلی بانسری کے ہمہموں میں جھلملاتا ہے

گیا بچپن، مٹا وہ سن، جوانی بیتنے آئی
سحر ہونے کو ہے رنگیں کہانی بیتنے آئی
یہ چرواہا مجھے کیوں یاد پھر اِنکی دلاتا ہے

مرے افکارِ طفلی کو ہے نسبت اُسکے نغموں سے
میں بچپن میں کیا کرتا تھا الفت اُسکے نغموں سے
جبھی بنسی کی لے میں عہدِ طفلی جھلملاتا ہے

نظر میں جھومتا ہے بن کے رنگیں خواب کا عالم
وہ صحرائی نظارے اور وہ مہتاب کا عالم
وہی افسانہ اس بنسی کے لب پر مسکراتا ہے

●

یہ مے چھلک کے بھی اُس حسن کو پہنچ نہ سکی
یہ پھول کھل کے بھی اُس کا شباب ہو نہ سکا
یوں تو ہر در پہ لٹکتے نظر آئے دامن
کھنچتے نازسے جس کو وہی اماں نہ ملا
نازِ گیسوئے سلمیٰ پہ بڑھے ہاتھ اختر
یوں گدایانہ تماشائے لبِ بام نہ کر

مختار صدیقی

نغمے سے آگے

لب پہ آجاتے ہیں سنگیت سہارے ساقی
ولولے دل کے اگر غم سے سنورنا سیکھیں
وہ "زباں" جو ہے شفق، پھول، ستارے ساقی
ہم بھی پا لیتے ہیں، گر زندگی کرنا سیکھیں

بات بن جاتی ہے ترکیب سُروں کی ساقی
ہر تأثر سے نئے روپ میں ڈھل جاتی ہے
پھر کوئی بات نہیں رہتی ہے باقی ساقی
اور ہر بات پہ ترکیب بدل جاتی ہے

ایسے جذبوں کی اٹھانیں بھی یہی ہیں ساقی
لفظ و معنی کے طلسمات سے جو ہیں آگے

ان خیالوں کی اُڑانیں بھی یہیں ہیں ساقی
یوں، کہی اَن کہی ہر بات سے جو ہیں آگے

نازک احساس کی رنجوریاں ساری ساقی
اور طنازِ تمنّا کے تقاضوں کی چبھن،
نئے ارمانوں کی وہ لاگ ہٹیلی ساقی
اور وہ سانجھ سویرے کی دعاؤں کا چلن

روز و شب روتے ہوئے دل کی پکاریں ساقی
رُت کے گہواروں میں پلتے ہوئے لاکھوں فتنے
اور یہ سجتی سنورتی ہوئی ناریں ساقی
جن کی سرمستی و رعنائی کے پہلو — اتنے!!

یہ سُریں رکھتی ہیں، ایسے کئی عالم ساقی
وہ بھی ہیں جو کسی تخلیق کی حد میں بھی نہیں
ہے وہ پہنائی لچکتی ہوئی سرگم ساقی
وسعتیں جس کی ازل کیا ہے ابد میں بھی نہیں

احمد ندیم قاسمی

کھری کھری

صبح کو جب سرِ کہسار شفق پھولتی ہے
لوگ کہتے ہیں کہ پل بھر میں سویرا ہوگا
کون جانے کہ یہ لالی ہے عناصر کا مذاق
اور سورج کا گھٹاؤں میں بسیرا ہوگا
عین ممکن ہے کہ اعلانِ سحر کے باوصف
دوپہر کو بھی اندھیرا ہی اندھیرا ہوگا
کون جانے کہ اگر دھند ہٹی، ابر چھٹا
ایک طوفان نے آفاق کو گھیرا ہوگا
عین ممکن ہے کہ طوفان کے دب جانے پر
ابر کا اک نئے انداز میں پھیرا ہوگا

کون جانے کہ ادھر ابر کھلے گا، تو اُدھر
رات کے ہاتھ میں ظلمت کا پھریرا ہوگا

میں نے ان دائروں میں گھوم کے دیکھا ہے کہ تم
مجھ میں غلطاں ہو مگر مجھ سے گریزاں بھی ہو
تم ستارہ ہو، شفق ہو، گلِ تازہ ہو، مگر
سنسناتا ہوا پُر ہول بیاباں بھی ہو
تم جو بستی ہو جوانی کے سمن زاروں میں
اپنی تنہائی کے احساس سے ویراں بھی ہو
تم جو کترا کے نکلتی ہو مری نظروں سے
کتنے قصّوں کا دمکتا ہوا عنواں بھی ہو
تم جو کہتی ہو کہ حوروں سے گراں ہے عورت
شبنم اور پھول کی مانند فراواں بھی ہو

تم نے لُوٹا ہے مجھے، تم نے بسایا ہے مجھے
میری رہزن بھی ہو، میرا سروسامان بھی ہو

ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے نہ بہلاؤ مجھے
ٹمٹاتے ہوئے تاروں کے چلن جانتا ہوں

سرخ ہونٹوں میں ہے پامال جوانی کی پکار
میں کہ فن کار ہوں، رنگینیٔ فن جانتا ہوں

اس اٹکتے ہوئے لہجے سے نہ کھاؤں گا فریب
میں تو انساں کا ہر اندازِ سخن جانتا ہوں

کیسے پندار کی میناؤں میں بال آتے ہیں
کیوں چھپاتی ہو کہ میں تشنہ دہن جانتا ہوں

کتنی راتوں کے اندھیروں سے شناسائی ہے
کالے بالوں کی میں ایک ایک شکن جانتا ہوں

ڈالیاں مجھ کو بلاتی ہیں گلوں سے لد کر
پھول روتے ہیں کہ میں رازِ چمن جانتا ہوں

ہر ستارہ نہیں پیغامبرِ نورِ سحر
میں بصارت کے فریبوں میں نہیں آؤں گا

اتنی شدت سے نہ اپناؤ کہ میں آخرِ کار
پاس رہ کر بھی بہت دُور چلا جاؤں گا

یہ محبت کہیں محرومیٔ جاوید نہ ہو
کھو گئیں تم تو خدا کو بھی نہیں پاؤں گا

اس تبسم میں کہیں طنز کے نشتر تو نہیں
اب امنگوں کو کھلونوں سے نہ بہلاؤں گا

اوس موتی بھی نہیں۔ اوس شرارہ بھی نہیں
عشق کو خام خیالی میں نہ الجھاؤں گا

جن کے دم سے مرا وجدان ہے ادراک آلود
ان شکستوں کی میں تاریخ نہ دہراؤں گا،

راجہ مہدی علی خاں

زینت محل

نظر آباد اب بھی آتا ہے

ہر تھکا ہارا شہر کا گھوسی
اپنی کھٹیا یہیں بچھاتا ہے
کہہ کے "زینت محل" ہر اک چوہا
اپنے گھر کا پتہ بتاتا ہے
آج نا کتخدا ہر اک جھینگر
اپنی سسرال اسے بتاتا ہے

زینت محل، بہادر شاہ کی بیگم زینت محل کی حویلی تھی جس کا دروازہ اب بھی باقی ہے، مکانات وغیرہ غدر کے بعد انگریزوں نے کھدوا دیئے تھے۔ آجکل وہاں مختلف قسم کی دکانیں ہیں۔

کوچہ پنڈت کا پہلواں بلّا
اپنی ہڈی یہیں چھپاتا ہے
دکھی مچھّر ہر ایک موری کا
کر کے ہجرت یہیں پہ آتا ہے
دُبلی بھنگن سے موٹا حلوائی
آنکھ دن بھر یہیں لڑاتا ہے
چھت پہ آ آ کے اس کی جمّن خاں
گیت فلموں کے گنگناتا ہے
شہر کا سب سے نوجواں غنڈہ
یہیں بھٹیارن چھپاتا ہے
اس کے ہر کمرے میں بکوڑی مل
رات دن ...... چلاتا ہے

مخمور جالندھری

ایک سی بات

چلتے تو سہی غنچوں کے انبار لگا دوں — رنگین فضا، شیشہ و مے، گیت، غزل، رقص
پیسوں کی نہیں فکر اگر کوئی تو کیا بات ہے صاحب! — کس درجہ حسیں رات ہے صاحب!"
جس رنگ کی، جس عمر کی چاہو گے ملے گی
معیار جسے کہتے ہیں پیسے کی کرامات ہے صاحب! — "آمد یہ تمہاری تو ہے زینت مرے گھر کی
گر جتنا پڑے بڑھتی ہے شیرینی بھی اتنی — اچھا تو یہی ہیں وہ — بہت خوب ہیں فرزند تمہارے
جو چیز مرے پاس ہے انوار کی برسات ہے صاحب! — کچھ کم نہیں "گیتا" بھی مری روپ ہیں قد ہیں
گھر سے بھی سوا آپ کو آرام ملے گا — اک ساتھ کھڑے کر دو تو دونوں نظر آئیں گے ستارے
ہنس مکھ ہے بڑی شوخ ہے مجموعۂ خدمات ہے صاحب! — رکھتا نہیں گھر میرا خیالات پرانے

کیوں جان کے لیٹا رہے کیچڑ میں کوئی پاؤں پسارے
پھر ــــ چھپے میں جس کے ہو بڑا مال ڈرے وہ
بیٹی مری کافی نہیں جو تم سے چھپے شرم کے مارے
دیکھو تو سہی چکھ کے انہیں چھو کے تو دیکھو
یہ اس کے تلے پوڑے، یہ کاڑھے ہوئے چادر پہ نظارے
ہم نے اسے چوکے ہی کی شوبھا نہیں رکھا
کچھ رقص و سرود اس کو سکھایا ہے کہ خلوت بھی نکھارے
پھر میرے تو گھر میں یہ ابھی بیاہ ہے پہلا
وقت آنے پہ ہو جائیں گے معلوم نہیں چاؤ ہمارے
ٹھہرو میں بلاؤں اُسے ــــ "گیتا ــــ مرے بیٹا!"

ٹپ ٹپ، چھنا چھن چھن، سراسر کئی خوشبوؤں کے دھارے
شرماؤ نہ ان سے ہمیں کچھ گا کے سناؤ
انگشتِ حنائی بڑھی سُر قیمتی پیانو کے پکارے
"چھم چھم چھما چھم کرتی ہوئی جائے دُلہنیا
اٹھلائے دلہنیا
لہرائے دُلہنیا
پھولوں سے بھری سیج پہ شرمائے دُلہنیا
گھبرائے دُلہنیا
مُسکائے دُلہنیا!"

سیف الدّین سیفؔ

ملّاح

زندگی کا بہاؤ لے جائے — جس طرف چاہے ناؤ لے جائے

اوجِ گاہِ جنوں پہ چڑھنا ہے — اور بڑھنا ہے اور بڑھنا ہے

زندگی سے فنا کے دھارے تک — اس کنارے سے اس کنارے تک

جس جگہ ڈوب جائیں ساحل ہے — یعنی منزل ورائے منزل ہے

ڈوبنا ہی اگر مقدر ہے — پھر بلاخیزیوں کا کیا ڈر ہے

آرزوؤں کو اوج پر لے آ — آ سفینے کو موج پر لے آ

لہر کی طرح ناؤ لہرا کر — ڈوب جائیں افق سے ٹکرا کر

جس میں صدیوں کے خواب ڈوبے ہیں — ان گنت آفتاب ڈوبے ہیں

منیب الرّحمٰن

اظہار

اب ترے جسم سے اٹھتی ہوئی خوشبو کی لپٹ
میرے احساس پہ آویزاں ہوئی جاتی ہے
گرم ہے کمرے کی خاموش فضا،
تیرے عارض پہ پسینے کی نمی
ذہن میں لاتی ہے برسات کی پہلی راتیں،
نیم سگرٹ ترے پوروں میں دبی
سرخیٔ لب نے نشاں چھوڑ دیا ہے جس پہ
کہہ رہی ہے کہ حقیقت ہے فقط دودِ رواں!

تو بھی خاموش ہے، میں بھی چپ ہوں
اور ہم دونوں یہی سوچ رہے ہیں دل میں:
کاش منّت کشِ اظہار نہ ہونا پڑتا!

کنہیا لال کپور

سالم ہندوستان میں اردو ادب کا آخری دور

خدا خدا کر کے اردو کا پانچواں دور ختم ہوا۔ اللہ اللہ کیسی کیسی صورتیں تھیں کہ خاک میں پنہاں ہو گئیں۔ یہ وقت شعر و شاعری بگذشت و رفت اب چند عجیب و غریب لوگ کہ جنہیں دیکھ کر عقل انگشت بدنداں اور دماغ نوحہ کناں ہے، بزم ادب میں تشریف لاتے ہیں۔ کندھوں پر اردو شاعری کا جنازہ اٹھائے ہائے ردیف ہائے قافیہ کے بین کرتے جونہی انہوں نے شبستانِ شاعری میں قدم رکھا، یک لخت تمام شمعیں گل ہو گئیں۔ تغزل نے آخری ہچکی لی۔ اور ترنم ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ اس گھپ اندھیرے میں حفظ مراتب کو بالائے طاق رکھ کر ہر ایک شاعر مسند کی جانب بڑھا۔ ان تمام میں یوسف ظفر پیش پیش تھے۔

یوسف ظفر

نام یوسف۔ لیکن تخلص ظفر تھا یا نہیں اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ نہایت مرنجاں مرنج بلکہ مریل قسم کے انسان تھے۔ اوائل عمر میں عجیب و غریب مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن آخری عمر میں بھی کوئی خاص آسانیاں نصیب نہ ہوئیں۔ شاعروں میں اپنا کلام اس طرح پڑھتے تھے جیسے کسی دوسرے کا کلام پڑھ رہے ہیں۔ غزل اچھی کہہ لیتے تھے لیکن بایں ہمہ اس سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ نظمیں کہنے کا جنون تھا۔ اکثر نظم کہنے کے بعد کافی ہاؤس میں تشریف لایا کرتے تھے۔ میخانے میں جانے کی آخری دم تک توفیق نہ ہوئی۔ چند سال حضرت ظہیر کے زنداں میں گذارے۔ وہاں سے سیدھے ہمایوں کے مقبرے میں پہنچے اور وہیں دفن ہوئے۔ قیوم نظر اور میراجی نے بیک وقت تاریخ وفات کہی۔

حیف صد حیف ظفر ——— مُرد۔

اس مصرع سے وفات کا سن ۱۹۶۸ء نکلتا ہے۔ جو قریب قریب صحیح ہے۔ کیونکہ آپ نے ۱۹۴۸ء میں وفات پائی۔

نمونۂ کلام:۔ کلام آپ کا بے نظیر ہے۔ کہیں سے اٹھا کر پڑھ لیجئے۔ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔

قیوم نظر

پورا نام مولوی عبدالقیوم بٹ تھا۔ لیکن بخوفِ طوالت اپنے آپ کو قیوم نظر کہتے تھے۔ غزل سے نظم اور نظم سے گیت کی طرف رجوع کرنے کے بعد مکمل خاموشی اختیار کر لی تھی۔ زندہ دلی طبیعت کا خاصہ تھا۔ کلرک ہونے کے باوجود محفلوں میں کھل کر ہنستے تھے۔ اکثر یوسف ظفر سے چشمک رہتی۔ شاید اس لئے کہ ان کی "قندیل" کے آگے ظفر کا چراغ نہیں جل سکا تھا۔ متعدد گیت لکھے جو ریڈیائے جانے پر بھی نظرائے گئے۔ میراجی سے عقیدت اور اُن کے سوا ہر شاعر سے وحشت۔ لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی میں خاص کمال حاصل تھا۔ بشرطیکہ نشانۂ مشق کوئی شاعر ہو۔ اپنے نظر تو آپ تھے۔

لطیفہ:۔ ایک محفل میں آپ نے یوسف ظفر کے ایک شعر کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ کاش آپ اتنے بیوقوف ہوتے کہ میرے تمام گیت لے لیتے۔ اور مجھے یہ شعر دے دیتے۔ یوسف ظفر نے برگشتہ خاطر ہو کر جواب دیا "معاف کیجئے۔ مجھے یہ خسارے کا سودا منظور نہیں"۔

حفیظ ہوشیارپوری

نام حفیظ لیکن ہوشیارپوری کے لقب سے مشہور ہوئے۔ وضع قطع میں حفیظ جالندھری سے خطرناک مشابہت رکھتے تھے۔ ہزاروں غزلیں کہیں، کہ شاید کوئی کام کا شعر ہو جائے۔ لیکن افسوس کہ یہ خواہش اکثر پوری ہوتی رہی۔

روائت:۔ ان کے پاس غزل کا ایک سانچہ تھا۔ جس میں الفاظ و تراکیب ڈال کر غزل نکال لیا کرتے تھے۔ دواوین کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں لگایا جا سکا۔ کیونکہ بیشتر کاغذ کی کمیابی کی وجہ سے شائع نہ ہو سکے۔ تقریباً ہر غزل میں وہی بات کہتے تھے۔ جو اس سے پہلی غزل میں کہہ چکے تھے۔ تاکہ ذہن نشین ہو جائے۔

لطیفہ:۔ ایک ریڈیو مشاعرے میں ایک گستاخ چھوکرے نے آپ کی غزل پر اعتراض کیا۔ کہ اشعار بے جان ہیں۔ آپ نے چمک کر فرمایا "میں شاعر ہوں۔ ابنِ مریم نہیں کہ مردہ اشعار میں روح پھونک سکوں"۔ معترض دم بخود ہو گیا۔

عبدالمجید بھٹی

نہایت بلند پایہ شاعر تھے۔ اُن کی شاعری میں مغز کے علاوہ سبھی کچھ ہوتا تھا۔ پہلے بچوں کے لئے گیت لکھتے رہے۔ بعد میں نوجوانوں کے لئے معمے لکھنے لگے جو انعامی نہیں ہوتے تھے۔ زبان میں ہندی الفاظ کو ترجیح دیتے تھے۔ بقول سالک صاحب اردو زبان کو آج سے دو سو برس پیچھے لے جانا آپ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ آپ کے کلام بلاغت نظام پر حضرت حفیظ جالندھری نے پیش لفظ لکھا

جو آپ کے کلام کی ضخامت سے کم از کم تگنا ہے۔

نمونہ کلام :- آپ کا کلام پڑھنے کے بجائے الجبرا کی کوئی بھی کتاب پڑھ لیجئے۔

ساحر لدھیانوی

پورا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ آیا تخلص کرتے تھے یا سحر اس کے متعلق بھی بیشتر محققین کو شک ہے۔ کلام پڑھتے وقت زبان کے بجائے ناک سے زیادہ کام لیتے تھے۔ چہرے پر چیچک کے داغوں کے علاوہ خستہ حالی کے متعدد نشان تھے۔ کوٹ اتار دیتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے ابھی ہوا میں تحلیل ہو جائیں گے۔ طبیعت کا رجحان اشتراکیت کی طرف تھا۔ تاج محل کو اس لئے پسند نہ کر سکے کہ جھونپڑا تک میسر نہ تھا۔ اکثر مین لائن پر سفر کیا کرتے۔ لدھیانہ سے بمبئی اور بمبئی سے لاہور پہنچے۔ اور مطلوبہ کرایہ نہ ہونے کی وجہ سے ماسکو نہ جا سکے۔ ساری عمر مارکس کا فلسفہ جس حد تک اُسے سمجھ سکے نظموں میں قلم بند کرتے رہے۔ بے ضرر انسان تھے۔ اس لئے حکومت نے کبھی گرفتار کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

نمونہ کلام :- طوائف! مزدور!! سرخ پرچم!!!

فکر تونسوی

تونسہ شریف کے رہنے والے تھے۔ لیکن شکل و شباہت سے معلوم ہوتا تھا کہ دھونسہ کے رہنے والے ہیں۔ فسادات لاہور میں کوشش کے باوجود اس لئے شہید نہ ہو سکے کہ ہندوؤں نے آپ کو ہندو اور مسلمانوں نے مسلمان سمجھا۔ پہلے کچھ بھی نہ تھے۔ لیکن بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیابان ہوتا چنانچہ کلرک ہو گئے۔ اور پھر خدا جانے کیا جی میں آئی کہ عریاں ہو گئے اور شاعر بن گئے۔ اور قیس نظم کے پردے میں بھی عریاں نکلا۔ جس مجلس میں کلام پڑھتے درہم برہم ہو جاتی۔ بے قافیہ نظم کے ساتھ ساتھ ان کی عریانی بھی بے قافیہ تھی۔ آپ کی شاعری کو آپ کے علاوہ اور بہت کم لوگ سمجھے۔ آپ نے اُردو کے ذخیرۂ الفاظ میں ایک نئے لفظ "تونسویت" کا اضافہ کیا جس میں اونس بھر اضافیت نہیں۔

تونسویت :- عموماً اس "ہیولے" کو کہتے ہیں جسے اگر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں یا اوپر سے نیچے پڑھا جائے تو مطلب میں چنداں فرق نہیں پڑتا۔

اُردو کے آخری دور کے شعرائے کرام رخصت ہوئے۔ اب شاذان عظام کی صف آرائی ہے۔ فصاحت و بلاغت کے کشتوں کے پشتے لگ رہے ہیں۔ نہ قاطعین برہان کو خبر ہے نہ سامعین کو۔ گیسوئے شراب منت پذیر شانہ نہیں رہا۔ کیونکہ اسے سنوارنے کے لئے

ہر ایک مناظرہ ایڑی کا زیادہ اور چوٹی کا کم زور لگا رہی ہے۔ نثر نگاروں کی وہ ریل پیل ہے کہ ان کے ساتھ نہ کوئی انجن ہے نہ کو لہو۔۔۔۔۔ وہ دیکھئے نثر نگار جاٹ اندر جاٹ اور کھاٹ اندر کھاٹ قصرِ ادب کی طرف آ رہے ہیں۔ ادھر انہوں نے دروازے پر دستک دی اُدھر زبان اور محاورے نے اٹوانٹی کھٹوانٹی سنبھالی اور تنقید کو جلدی جوتے کی فکر پڑی۔

کرشن چندر

کشمیری نژاد تو نہ تھے۔ لیکن ان کی گنجی چندیا اور خوبصورت آنکھیں (جو عینک لگانے سے پہلے واقعی خوبصورت تھیں) دیکھ کر کبھی کبھی ان کے کشمیری ہونے کا شبہ ہوتا تھا۔ کشمیر اُن کا نہ چراغ حسن حسرت کا تھا۔ (اگر زندہ ہیں تو چراغ پا نہ ہوں کیونکہ وہ اللہ بخشے ازل سے چراغ تہِ داماں رہے) طبیعت اس قسم کی پائی (بابو راؤ پائی سے اس کا کوئی تعلق نہیں) کہ ایک جگہ کبھی جم کر نہ بیٹھ سکے۔ لاہور سے دلی اور دلی سے لکھنؤ پہنچے۔ وہاں کی آب و ہوا راس نہ آئی تو پونا کا رخ کیا۔ پونے سے جی اکتایا تو بمبئی چلے گئے۔ مقبرہ وہیں بنا۔ حالانکہ تنے ہوتے رستے پہ بننا چاہئے تھا۔ تمام عمر اس کوشش میں ماہ کسیاتے رہے کہ کسی نہ کسی طرح ادب کو گھسیٹ کر پراپیگنڈا کے قریب لے آئیں۔ آخری عمر میں "راکھ" ہو کر اس سعی میں کامیاب ہو گئے۔ چند نئے الفاظ اردو زبان کو عطا فرمائے جن میں ایک "توس قزحی" اور دوسرا "جھینٹی" ہے۔

سعادت حسن منٹو

پیلی رنگت۔ کھلی پیشانی۔ ٹیڑھے بال۔ ڈراؤنی آنکھیں۔ سعادت حسن منٹو کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یرقان میں مبتلا ہیں۔ جوش ملیح آبادی کے بعد سب سے بڑے "سیف و سبو" اور محمود غزنوی کے بعد سب سے بڑے "سترھویں حملے" تھے۔ کئی بار حکومت نے گڑگڑا (گڑگڑا) کر کہا اٹھارواں حملہ چھوڑو اور واپس امرتسر چلے جاؤ۔ لیکن وہ باز نہ آیا۔ اور اس نے کہا خروشِ رفتہ باز آید کہ نیاید۔۔۔۔۔ نہ ساختہ تھے نہ پرداختہ، قلم بر۔۔۔۔۔ داشتہ تھے۔ جب ہاتھوں میں قلم اٹھانے کی سکت نہ رہی تو لکھنا بند کر دیا تھا۔ حالتِ نزع میں وصیت کی تھی کہ۔۔۔۔۔ رہنے دو ابھی ساغر و تحبیہ (کعبہ نہیں) مرے آگے۔ جوان تو شاید کسی عمر میں بھی نہ تھے لیکن سننے میں آیا ہے کہ توبہ توڑتے وقت ان کے چہرے پہ جوانی کی جھلک آ جاتی تھی۔ ہر قسم کے حجاب کو (حجاب امتیاز علی سمیت) پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کی زندگی کا حادثہ عظیم پیدا ہونا نہیں بلکہ غلط وقت پہ پیدا ہو جانے کا حادثہ صغرا تھا۔ ترقی پسند کی ترکیب سے چڑ تھی۔ مگر شعور، تحت الشعور اور لاشعور، شاہ کار، اقدار، بورژوا اور جدلیاتی مادیت سب کے معجون تھے (حالانکہ انہیں پھر اس سے چڑ رہی ہے) تمام عمر بغیر عنوان کے ایک ناول لکھنے کا عزم کرتے رہے۔ جس کا صرف سرورق آپ کی وفات حسرت آیات کے بعد چھپ سکا۔

ڈاکٹر شفیق الرحمٰن

مزاح نگار تھے۔ پیروڈی لکھنے میں کمال حاصل تھا۔ لیکن لطیفے جمع کرنے کے شوق نے انہیں کہیں کے علاوہ ہر جگہ کا رکھا تھا۔ آخری تصانیف میں لطائف کی وہ بھرمار ہے کہ اگر انہیں نکال دیا جائے تو شاید باقی کچھ رہ جائے۔ بلا کے حسین تھے اور ہر نئے فوٹو میں پہلے کی بہ نسبت زیادہ خوبصورت نظر آتے تھے۔ طبقۂ اناث میں بےحد مقبول تھے۔ "شیطان" اور "بڈی" دو کردار اردو مزاح کو بخشے۔ اس کے بعد کردار نگاری سے کچھ اس طرح آنکھیں چرائیں کہ اغیار تو اغیار اپنے بھی انہیں پا گئے۔

احتشام حسین

نقاد تھے یا ہو سکتے تھے۔ لیکن اس کے متعلق مولوی عبدالحق عرف انجمن ترقی اردو (ہند) بھی فیصلہ نہ کر پائے۔ خشک ترین تنقید لکھنے میں اپنی نظیر آپ تھے۔ طویل مضامین لکھنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ رنگینی سے اس قدر نفرت تھی کہ اگر اتفاق سے ایک آدھ خوبصورت فقرہ لکھ جاتے تو اسے فوراً کاٹ پھینکتے (خدا معلوم کہاں)۔ زبان پر کافی عبور تھا۔ خیالات ہمیشہ پا بہ رکاب رہے۔ ان کی تنقید ایک ہی نقطے کے گرد گھومنے کے بعد اکثر وہاں آجاتی تھی جہاں سے چلی تھی۔ بہترین ناصح تھے۔ لیکن آخری عمر تک فیصلہ نہ کر سکے کہ انہیں نصیحت کیا کرنی ہے

کنہیا لال کپور

طنز نگار تھے۔ یا کم از کم ایسا سمجھتے تھے۔ آپ کی ذات صنفِ طنز پر سب سے بڑی طنز تھی۔ ساری عمر میں صرف ایک کام کا مضمون لکھا۔ جو "اردو ادب کا آخری دور" کے نام سے بعد از مرگ واویلا ہوا۔ بقول شبلی بی کام یا بے کام اوائلِ عمر میں ان کا پیشہ پگڑی اچھالنا اور وقتِ پیری دستار بندھوانا تھا۔ صحیح زبان لکھنے کی بارہا کوشش کی۔ لیکن بقول اثر لکھنوی کامیاب نہ ہو سکے۔ پاکستان سے بھاگنے کے بعد فیروزپور کی ایک ٹوٹی ہوئی مسجد میں پناہ لی۔ اور آخری عمر میں مسلمان ہونے پر اظہارِ تاسف کرتے رہے۔ عالمِ شباب ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ قبر سے دو چار دفعہ اٹھنے کی سعی کی، تا کہ شمشان کا رخ کریں لیکن ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ مقبرہ موگا شریف میں بنا۔ لوحِ تربت پر یہ شعر کندہ ہے ؎

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے تجھے ہو شرم تو پانی میں جا کے ڈوب مرے

سبحان اللہ! اردو ادب کا آخری دور ختم ہوا۔ متقدمین۔ متوسطین۔ متاخرین اور بے توسلین سب رخصت ہوئے۔ بوم و ہما اپنے اپنے آشیانوں کو لوٹے۔ قصرِ ادب میں اب بالکل سناٹا چھایا ہے۔ چاروں طرف ہو کا عالم ہے۔ اور بیچارہ تذکرہ نویس ایک گمنام کونے میں کھڑا خدا سے دعا مانگ رہا ہے کہ اس کا چھٹا اور آخری دور کب آئے گا۔

شوکت تھانوی

خطوطِ غالب

(۱)

میر مہدی، خوش رہو،

آفریں۔ صد آفریں! خدا جانے کب کا بدلہ لیا۔ میں بوڑھا آدمی۔ بھولا آدمی۔ تمہاری باتوں میں آگیا۔ دھوکا کھا گیا۔ پھر اسی دنیا میں آبسا جس سے بھاگنے کے لئے زندگی بھر موت کا طالب رہا۔ تم سے رخصت ہو کر مختلف سیاروں میں بھٹکتا ہؤا دنیا میں آ کر دم لیا اور سیدھا دلی پہنچا۔ مگر ہائے دلی۔ وائے دلی۔ بھاڑ میں جائے دلی۔ اب یہاں نظام الدین ممنون کہاں۔ ذوق کہاں۔ مومن خاں کہاں۔ ویرانی سی ویرانی ہے۔ جہاں دلی تھی وہاں جنگل بیاباں نظر آیا۔ انسانی شکل کے وحوش نظر آئے۔ پوچھا جناب کی تعریف؟ جواب ملا۔ ست سری اکال۔ معلوم ہؤا کہ تختہ ہی الٹ چکا تھا۔ ہندو اور سکھ ادھر ہیں جہاں ہم تم تھے مسلمان وہاں ہیں جہاں جہانگیر کو بھی اگر کسی نے پوچھا تو موت نے۔ نہ یہاں سخنوری رہی نہ سخندانی کس برتے پہ تتا پانی۔ دلی والڈاب شہر نہیں کیمپ ہے۔ چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ۔ نہ شہر نہ بازار نہ نہر۔ اب اہل دلی ہیں یا ہندو ہیں یا سکھ ہیں۔ یا خاکی ہیں یا پنجابی۔ ان میں سے کس کی زبان میں دلی ڈھونڈوں۔ سنا ہے کہ لکھنؤ پھر غنیمت ہے۔ آزادی تو جاتی رہی مگر زبان درازی باقی ہے۔ اپنے مکان کی طرف گیا۔ مگر وہاں کیا دھرا تھا۔

گھر میں تھا کیا جو ترا غم اسے غارت کرتا　　وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

مگر سچ پوچھو تو اب وہ بھی نہیں۔ اس دلی سے تو ایک ہی دن میں جی اُچاٹ ہو گیا۔ جان لیکر لاہور کی طرف بھاگا۔ راستہ کیونکر کٹا کچھ نہ پوچھو۔ یہاں پہنچ کر اب کس سے کہوں کہ میں نجم الدولہ ہوں۔ مرزا نوشہ ہوں۔ اسداللہ خاں ہوں۔ غالب ہوں۔ وہی غالب جس کے کلام کے مرقعے چغتائی بناتے ہیں۔ جس کو ولایت میں چھپواتے ہیں۔ جس کو ہندوستان کی الہامی کتاب بتاتے ہیں۔ کوئی منہ نہیں لگاتا۔ کوئی بات نہیں پوچھتا۔ مہاجرین کے ایک کیمپ میں پڑا ہوں اس وقت دن کے بارہ بجے ہیں۔ میں ننگا ایک کھری چارپائی پر پڑا حقہ پی رہا ہوں۔ بھلے کو کرتہ یا انگرکھا گلے میں نہیں ورنہ جو کچھ سوچ رہا ہوں اسکے بعد گریبان پھاڑ ڈالنا ضروری ہوتا۔ میاں لڑکے! تم نے تو کہا تھا کہ میرے لئے دنیا میں جانے کا وقت اب آیا ہے۔ غالب کو اب دنیا والوں نے پایا ہے۔ وہ آنکھیں بچھائیں گے۔ جان

چھڑ گیں گے۔ پو جیں گے۔ مگر اب تباؤ میں کیا کروں؟ تجدید حیات کے بعد کیونکر مروں؟ پرستار یاں تو در کنار یہاں تو دو روٹیوں کا بھی سہارا نہیں۔ شراب کیسی پانی دینا کسی کو گوارا نہیں۔ کچھ معلوم بھی ہے میاں صاحبزادے! شاعری سے زیادہ ارزاں آج کل کوئی شغل نہیں۔ جس کو دیکھئے ایک تخلص لئے پھرتا ہے، اور شاعری کا دم بھرتا ہے۔ شاعری کے نام سے خرافات کے دریا بہائے جا رہے ہیں۔ اپنے کو شاعر کہتے بھی شرم آتی ہے۔ جو وبائے عام میں مرنے سے بھاگتا تھا اس کی قسمت میں وبائے عام کی یہ زندگی لکھی ہوئی تھی۔ یہ حال دیکھ کر شعر کہنے سے توبہ کی۔ اصلاح دینے سے توبہ کی۔ شعر سننا تو ممکن ہی نہیں بہرا ہوں شعر دیکھنے سے جی متلاتا ہے۔ پندرہ برس کی عمر سے پچھتر برس کی عمر تک پہلے شعر کہتا رہا۔ یعنی پہلے ساٹھ برس بکتا رہا۔ پھر عالم بالا میں سب جمع ہو گئے تھے تو کچھ شغل رہا۔ مگر اب تو یہی جی چاہتا ہے کہ لوگ مجھے زمرۂ شعرا میں شمار نہ کریں اور اس فن میں کبھی مجھ سے پرسش نہ ہو۔ مگر زندہ رہنا ہے تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ اب اللہ جانے کیا کرنا پڑے گا۔

ایک ہمدرد نے رائے دی ہے کہ ریڈیو جاؤں اور فلم کمپنیوں کو سونگھوں۔ سنا ہے کہ آج کل شاعروں کی اگر کھپت ہے تو ان ہی مقامات پر ہے۔ اب خدا جانے یہ ریڈیو کیا بلا ہے اور یہ فلم کمپنی کیا تماشہ ہے۔ خیر میرا گیا ہے اندازہ کرنے کے لئے کبھی چلا جاؤں گا بیکار تو پڑا ہی ہوں۔

مجتہد العصر میر سرفراز حسین اور ذاکر الحسین میر افضل علی عرف میرن صاحب کو دعا۔ مرزا حاتم علی مہر کی کوئی حور یا غلمان ملے تو کہلا دینا کہ اگلا خط ان ہی کو لکھوں گا۔ میرا یہ خط ان کے علاوہ مرزا علاء الدین خاں علائی، حکیم مومن خاں مومن، میرزا تفتہ، سید یوسف مرزا، قدر بلگرامی، حکیم غلام نجف خان وغیرہ کو سنا دینا۔ میرن صاحب کو دعا۔ میر تقی میر کی طرف جانا تو میرا اسلام لیکر جانا اور میرے لئے دعائے موت لے کر آنا۔

از سرِ نو موت کا طالب
غالب

(۲)

اے بھائی مرزا حاتم علی صاحب مہر۔

تم کو دیکھنے کے لئے تڑپتے تڑپتے تم سے باتیں کرنے کو جی چاہنے لگا۔ آؤ باتیں کریں۔ ادھر بیٹھو میرے قریب۔ ہاں یہ۔ اپنے پہنچنے اور دلی سے لاہور بھاگ آنے کی اطلاع قرۃ العین میر مہدی کو دے چکا ہوں خط دیکھا ہوگا۔ خدا جانے ہنسے ہو گے یا روئے ہو گے۔ اچھا اب سنو کہ پھر کیا بیتی۔ جن ہمدرد کا میں نے پچھلے خط میں ذکر کیا ہے۔ ان کے مشورے سے ریڈیو گیا۔ صاحب میرے ؎

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے   ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

یہ عجیب جادو نکلا۔ سر چڑھ کر بولنے والا جادو۔ اس کے ذریعہ گھر بیٹھے ہزاروں میل کی آواز سن لو۔ گانا سن لو۔ باتیں سن لو۔ اپنی سنانا ہے

کسی کی سنتا نہیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ بہرا ہونے کے بعد یہ وصف صرف مجھ میں ہے مگر اس کو دیکھ کر تو میں نے بھی کانوں پر ہاتھ رکھ لئے حقے کی طرح کی ایک چیز کمرے میں رکھی ہوئی ہے اس کی چلم کے قریب منہ لا کر بولئے بس منہ سے بات نکلی اور الم نشرہ ہوئی جن گھروں میں وہ صندوقچہ سا رکھا ہوا ہے جس میں یہ آواز پہنچ جاتی ہے۔ وہاں جہاں کی آواز چاہے سُن لیجئے۔ ایک سے ایک گانا۔ ایک سے ایک بیان۔ اور تو اور سنا ہے کہ مشاعرے تک اس ریڈیو پر ہو جاتے ہیں۔ اور یہاں کے مشاعرے سات سمندر پار ولایت والے بھی سُن سکتے ہیں۔ عقل حیران ہے کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا واقعہ ہے۔ جاننے کو تو میں چلا گیا مگر اب پریشان کہ میں یہاں کس مرض کی دوا بن سکتا ہوں۔ اُن ہمدرد نے تعارف کی رسم ادا کی۔ اس سرے سے اس سرے تک غالب آیا غالب آیا کی دھوم مچ گئی۔ معلوم ہوا کہ یہ کوئی معمولی جگہ نہیں بلکہ باقاعدہ سرکاری محکمہ ہے۔ اس محکمہ کے افسرِ اعلیٰ سے اس فقیر کو ملایا گیا۔ بڑی گرمجوشی سے ملے۔ اس طلسم کے عقدے حل کرنے لگے۔ اپنی میز کے نیچے خدا جانے کس بٹن کو گھمادیا کہ ایک دیوار نہایت میٹھی آواز میں مجھ کو میری ہی غزل سنانے لگی ؎

ہر اک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے   تمہیں بتاؤ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

اے بھائی! میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ جلدی جلدی آیۃ الکرسی پڑھنا شروع کر دی۔ جانتے ہو کہ آسیب سے میرا نشہ کیسا ہرن ہوتا ہے۔ میں سمجھا کہ ہو نہ ہو کچھ ایسا ہی خلل ہے۔ مگر جب اُن افسرِ اعلیٰ نے گھما پھرا کر، دکھا جھنکا کر سمجھایا تو بارے جان میں جان آئی۔ عقل تو چکر میں رہی مگر دل ٹھیر گیا۔ معلوم ہوا کہ اس ریڈیو پر میری غزلیں بہت گائی جاتی ہیں۔ مجھ سے تازہ کلام کی فرمائش ہوئی۔ میں موقع غنیمت جان کر مطلب پر آگیا۔ عرض کیا کہ پردیسی ہوں۔ بے سہارا ہوں۔ جنت کو چھوڑ کر اس امید پر دنیا میں آگیا ہوں کہ میری غائبانہ پرستش کرنے والے شاید اُس کس مپرسی کی تلافی کر دیں جس کا داغ لے کر مرا تھا۔ مگر فی الحال تو روزوں کی نوبت ہے اور روزی درکار ہے۔

اس محکمہ کے افسرِ اعلیٰ نے نہایت خندہ پیشانی سے بڑے میٹھے الفاظ میں کہا۔ "بلیشک۔ بلیشک۔ اگر یہ خدمت آپ ہمارے سپرد کر دیں تو زہے نصیب"۔

عرض کیا۔ "میاں تکلف چھوڑو۔ نیکی کر سکتے ہو تو پوچھ پوچھ کر نہ کرو"۔

ان صاحب نے سراپا اخلاق بن کر فرمایا۔ "آپ ہمارے یہاں اسٹاف آرٹسٹ ہو جائیے"۔

پوچھا۔ "وہ کیا بلا ہوتی ہے؟"

ایک دلربا تبسم سے بولے۔ "یہ ایک ملازمت ہے اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ تو اپنے کو ملازم سمجھئے مگر ہم آپ کو ملازم نہ سمجھیں گے"۔

حیرت سے پوچھا۔ "یہ کیا بات ہوئی۔ ہم سمجھیں اور آپ نہ سمجھیں۔ اس میں ناسمجھی کس کی ہے"۔

کہنے لگے۔ "قبلہ بات یہ ہے کہ یہ ملازمت سے زیادہ ایک قسم کا ٹھیکہ ہے۔ گویا ہم ٹھیکہ پر آپ کا دماغ لے لینگے اور اپنی ضرورت کے مطابق اس کو نچوڑتے رہیں گے۔ ظاہر ہے کہ کچھ دنوں کے بعد اس دماغ کا جوہر تو ہمارے پاس آجائے گا اور پھوک آپکے پاس رہ جائیگا۔ اس وقت ہم حسبِ شرائطِ معاہدہ

پندرہ دن کا نوٹس دے کر یا اگر آپ سے ایسے ہی خوش رہے تو پندرہ دن کی تنخواہ دے کر آپ کو رخصت کر دیں گے۔"

عرض کیا: "یعنی دماغ کا سارا عرق نکال کر بس رخصت کر دینگے۔ اور اتنا بھی نہ کریں گے کہ اپنی نگرانی میں کسی پاگل خانے میں کم سے کم داخل ہی کرا دیں۔ یہ کہاں کی مروّت ہے؟"

وہ حضرت مذاق سمجھ کر ہنستے ہوئے بولے: "بہت خوب فرمایا۔ مگر کیا عرض کیا جائے اس قسم کی ملازمت کی شرطیں ہی کچھ ایسی ہیں۔"

پوچھا: "یہ جتنے یہاں ملازم ہیں سب ان شرطوں پر راضی ہیں؟"

وہ بولے: "جی نہیں، سب ملازم اس قسم کے نہیں ہیں۔ چونکہ دماغ کوئی مستقل چیز نہیں ہے۔ لہٰذا مستقل ملازم صرف وہ ہیں جن کے دماغ سے ہم کو کوئی سروکار نہیں۔ اگر دماغ ہے تو سبحان اللہ ورنہ کوئی مضائقہ نہیں اکتسابی سندیں ہی کافی ہیں۔ ان میں بھی بہت سے اہل دماغ ہیں۔ مگر یہ ایک اضافی خصوصیت ہے جو عموماً زنگ آلود ہو کر رہ جاتی ہے۔ البتہ وہ لوگ جو صرف اہل دماغ ہیں اور فن کار ہیں ان کو مستقل ملازم رکھنے کے بجائے اسی قسم کا عارضی معاہدہ کیا جاتا ہے۔"

عرض کیا: "معلوم نہیں یہ آپ فن کار کی عزت کرتے ہیں یا بے عزتی۔ قدر کرتے ہیں یا ناقدری۔"

وہ صاحب بولے: "اس سے بڑھ کر اور عزت کیا ہو سکتی ہے کہ ہم ان کو باقاعدہ ملازم رکھنے کی جرأت نہیں کرتے۔ اس سے بڑھ کر اور قدر کیا ہوگی، کہ ہم انکو بعض صورتوں میں سرکاری ملازموں سے زیادہ تنخواہ دیتے ہیں۔ البتہ چونکہ فنکاروں میں ایک قسم کا خنّاس سا ہوتا ہے۔ لہٰذا انکے اس پندار کو توڑنے کے لئے ہم بڑے سے بڑے فنکار کو چھوٹے سے چھوٹے سرکاری ملازم کے ماتحت کر دیا کرتے ہیں۔"

عرض کیا: "گویا مجھ کو بھی اسی قسم کے لوگوں کی ماتحتی کرنا ہوگی۔"

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے: "یہ بات تو ہے قبلہ۔"

میں نے گفتگو کو اختتام تک پہنچانے کے لئے غصہ کو ضبط کرتے ہوئے کہا: "اور کام کیا کرنا ہوگا مجھ کو؟"

کہنے لگے: "غزلیں کہتے رہئے۔ منظوم ڈرامے لکھئے۔ بچوں کے لئے چھوٹے چھوٹے گیت لکھئے۔ اور ہمارے یہاں جو گانے والے اور گانے والیاں آتی ہیں ان کے تلفظ درست کرایا کیجئے۔"

پوچھا: "اور تنخواہ کیا ملے گی اس نجات کے طالب غالبؔ کو؟"

کچھ سوچ کر بولے: "ہم آپ کو ساڑھے تین سو تنک دیدیں گے۔"

حیرت سے پوچھا: "خشک؟ یا خلعتوں کے علاوہ؟ سنو صاحب! تم جانتے ہو کہ پیشگاہِ حضرت سلطانِ عالم سے بھی میں خلعتیں پاتا رہا ہوں۔

چودہ پارچے کا خلعت ایک بار' اور ملبوس خاص شالی رومال دوشالہ اکثر اوقات۔ مجھ کو اس کی عادت پڑی ہوئی ہے"۔

وہ صاحب بولے۔" قبلہ یہ خلعتوں کا زمانہ نہیں۔ اب تو بس تنخواہ ہی تنخواہ ہے"۔

اب میں نے صاف صاف سنائی " میاں ہوش کی خبر لو کس دھیان میں ہو کس خیال میں ہو۔ تم ساڑھے تین سو روپلی میں غالب کو خریدنا چاہتے ہو۔ اس کے دماغ اور اس کی دماغداری کے دام لگاتے ہو۔ یہ دماغ ابھی تو ایسا گیا گذرا نہیں کہ نیلام پر چڑھا دیا جائے۔ میں تو تم کو پرکھ رہا تھا۔ ٹٹول رہا تھا۔ ٹھٹھول کر رہا تھا۔ معلوم ہو گیا کہ تمہارے نزدیک میں کتنے پانی میں ہوں۔ بخشو مجھ کو"۔

وہ خدا جانے کیا کیا سمجھاتے رہے کیا کیا فرماتے رہے مگر میں سیدھا بھاگا اپنے کیمپ کی طرف۔ اپنے کو بُرا بھلا کہتا ہوا کہ کیوں آگیا تھا یہاں۔ عزیز گرامی میر مہدی ملیں تو کہہ دیجئے گا کہ ہاں بھائی خوب ہو رہی ہے قدردانی۔ واقعی بقول تمہارے اہل فن کا زمانہ ہے۔ ع پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں۔ اور پوچھتا ہے تو اس طرح جس کا حال لکھا۔ خدا اس پوچھنے سے بچائے۔ خدا کسی غیرت دار کو یہ دن نہ دکھائے۔

یہ خط بھی سب کو دکھا سنا دیجئے گا۔ کاش پھر سب اِکجا ہوں۔ ہے ہے۔ کیونکر اِکجا ہوں۔ دیکھئے زمانہ اور کیا کیا دکھائے۔ کس کس در کی خاک چھنوائے۔ سید یوسف مرزا ملیں تو مزاج پرسی کر لیجئے۔ معلوم نہیں اب ان کی خارش کا کیا حال ہے اس بندۂ خدا نے جنت میں بھی خارش کو نہ چھوڑا۔ اگلا خط ان ہی حضرت کو لکھوں گا۔ ورنہ نازک مزاج ہیں ناراض ہو جائیں گے۔

آپ کی خیریت کا طالب
غالب

(۳)

کوئی ہے؟ ذرا یوسف مرزا کو بلائیو۔ لو صاحب وہ آئے۔ میاں اس سے پہلے دو خط بھیج چکا ہوں۔ ایک میر مہدی کو دوسرا بھائی حاتم علی مہر کو۔ نظر سے گذرے ہونگے۔ اب میری کہانی سنو۔ میری زبانی سنو۔ کل رات طبیعت مکدر رہی۔ بڑے بڑے جی گھبرایا۔ کیمپ کے جن ہمدرد کا ذکر پچھلے خطوط میں کر چکا ہوں آدمی اچھے ہیں اور ہر اچھا آدمی چونکہ تھوڑا بہت خبط ہوتا ہے۔ لہذا وہ بیچارے بھی حسب حیثیت خبط واقع ہوئے ہیں۔ میرے پاس تشریف لائے اور خبر سنائی کہ آج شہر میں ایک مشاعرہ ہے۔ میں نے بھی سوچا کہ چل کر دیکھوں تو سہی کہ مشاعرے اب کیسے ہوتے ہیں۔ اے بھائی! اب جو پہنچا ہوں مشاعرے میں تو صاحب کمشنر بہادر دہلی یعنی سانڈرس صاحب بہادر کے دربار کا نقشہ نگاہوں کے سامنے آگیا۔ نہ مسند نہ تکیہ۔ نہ شمع نہ فانوس نہ چلم نہ حقہ۔ سب کرسیوں پر پیر لٹکائے بیٹھے ہیں اور ایک صاحب ایک اونچے سے چبوترے پر کھڑے کلام پڑھ رہے ہیں۔ اور سنو' اب مشاعرے میں شاعر گاتا ہے۔ سننے والے تالیاں بجاتے ہیں۔ عورتیں ہنستی ہیں۔ بچے غل مچاتے ہیں۔ میں ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا توبہ استغفار کرتا رہا۔ آج بہرا ہونا بھی کام نہ آیا۔ ایک آلہ کے ذریعے آواز کو اتنا اونچا کر دیا جاتا تھا کہ میرا ایسا بہرا بھی سُن لے۔ اور سن بھی وہ لے جو خدا کسی کو نہ سنوائے۔ غرض کو لنگڑا

کر دیا ہے۔ چھوٹے بڑے مصرعوں کی نوٹنکی پیش کی جاتی ہے۔ وہ بھی چٹپٹی نہیں پھیکی اور بے مزہ۔ ایک صاحب کے چند مصرعے یاد رہ گئے ہیں تم بھی سن لو سہ

تمہاری تمنائے کہنہ اٹھی ہے لہو کی بہاروں کا دامن سنبھالے
لبوں پر لئے حیلۂ نسل و رنگت
نگاہوں میں عذرِ من و تو کا دھندلا سہارا
کہ تم کو بھی مل جائے پابستگیٔ مسلسل کا ثمرہ
فضاؤں میں گونجے یہ نعرہ
"مہاراج کی جے!" "شہنشاہ کا بخت قائم!!"

اے بھائی یوسف مرزا! للّٰہ بتاؤ یہ کیا ہے۔ تمام شعرائے فردوس کو سناؤ۔ میر تقی سے پوچھو۔ نظیر اکبر آبادی شاید کچھ بتائیں۔ انشا شاید کچھ روشنی ڈالیں۔ میرا تو دماغ چکرا گیا۔ لو اور سنو۔ اس مختلف البطن شاعری کے بعد ایک صاحب نے اعلان کرنا شروع کیا:۔

"حضرات! اس نظم میں جو دعوتِ فکر ہے۔ اس کے لئے صاحبانِ فکر و نظر کی ضرورت ہے۔ اس قحط الرجال میں اگر آپ کو ایک بھی صاحب فکر و نظر کسی گوشہ میں مل جائے تو غنیمت سمجھئے۔ میں آپ کو سراغ دیتا ہوں امروہہ میں ایک صاحب نظر موجود ہے۔ جائیے اور ڈھونڈ لائیے۔ پتہ صرف یہ ہے نظرؔ امروہوی۔ پیغام اگر پہنچ گیا ہو تو نظرؔ صاحب امروہوی تشریف لے آئیں۔"

اور صاحب من! ایک نوجوان نے آ کر غزل سرائی شروع کر دی۔ وہ تو خیر ٹھیک ہے مگر یہ اعلان کیا تھا۔ یہ بات کیا ہوئی۔ میرے کپ کپے ساتھی نے بتایا کہ یہ اعلان کرنے والے صاحب دِلّی سے آتے ہیں اور مشاعروں میں تعارف کی رسم ادا کرتے رہتے ہیں۔ یوسف مرزا! آج معلوم ہوا کہ دِلّی کیوں ویران ہوئی۔ اب بتاؤ اگر کسی کو معلوم ہو گیا کہ میں بھی دِلّی والا ہوں تو کہیں مجھ کو بھی پکڑ کر اعلانچی نہ بنا دیں۔ میں تو چپکے سے اٹھا اور کھسک آیا۔ جان بچی لاکھوں پائے۔

یہ خط بھی سب کو سنا دینا۔ اگلا خط مرزا تفتہ کو لکھوں گا اُسے مانگ کر پڑھ لینا۔

اس دنیا سے نجات کا طالب
غالب

(۴)

اجی مرزا تفتہ! تم بیوفا یا میں گناہگار، میں بھی مُغلچہ اور تم بھی مُغلچے۔ ہم لوگ بھی غضب کے ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔

عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ کہو تمہاری محبوبہ کب تک یہ داغ دینے والی ہیں۔ مگر وہ کیا داغ دینگی۔ آپ مرے بھی تو کہاں جنت میں جہاں موت کا نشان نہیں۔ خیر چھوڑو اس قصہ کو اب میری سنو۔ پچھلے خط میں ایک مشاعرے کا حال لکھ چکا ہوں۔ آج ایک اور تماشے کا حال لکھتا ہوں۔

آج گھومتا پھرتا پرچھائیوں کی دنیا میں جا نکلا۔ چلتی پھرتی منہ بولتی سر کھیلتی تصویروں کی بستی ہیں جس کو یہ لوگ فلم کمپنی کہتے ہیں۔ تم پوچھو گے کہ یہ کیا ہے۔ مگر سمجھاؤں کیا خاک خود ہی کب سمجھا ہوں۔ عجیب شعبدہ ہے۔ اے بھائی پرچھائیاں باتیں کرتی ہیں۔ ناچتی ہیں، گاتی ہیں، ہنستی ہیں۔ روتی ہیں اور سب ہی کچھ کرتی ہیں، بس ہاتھ نہیں آتیں۔ ان دنیا والوں نے عجیب عجیب طلسم ایجاد کر لئے ہیں۔ جو کبھی وہم و گمان میں بھی نہ آتے تھے۔

میرے کمپ کے ہمدرد نے فلم کمپنی کے مالک سے نہ جانے میرے متعلق کیا کہہ دیا کہ وہ تو بس فرش راہ ہو گیا۔ کہنے لگا کہ ہمارے لئے گانے لکھ دیجئے۔ میں نے لاکھ سمجھایا کہ بھائی میرے گانا لکھنے میری بلا۔ غزل لکھ لیتا ہوں۔ وہ کہو تو لکھ دوں۔ اس نے کہا جی ہاں وہی۔ اور پھر لگا بکنے: "دیکھئے مرزا صاحب۔ ہمارا ہیرو جب دیکھتا ہے کہ اس کو کسی طرح کامیابی نہیں ہو سکتی۔ کچھ گڑبڑ گھٹالا ہو گیا ہے۔ اور جس سے وہ محبت کرتا ہے وہ لڑکی اس کو نہیں مل سکتی تو وہ سب کچھ چھوڑ کر نکل جاتا ہے۔ دنیا کو چھوڑ کر سنیاس لے لیتا ہے۔ اس جگہ گانا چاہئے۔ کچھ ٹراٹریجڈی کا ہو گانا۔"

میں خاک سمجھتا۔ اس زبان کو ٹالنے کیلئے کہہ دیا کہ بھائی میرے اس موقع کے لئے بس یہ غزل ٹھیک ہے ؎

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو　　ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

منہ کھول کر وحشیوں کی طرح سنتا رہا پھر بولا "نہیں مطلب یہ ہے کہ کچھ ایسا لکھ دیجئے جیسے وہ غزل ہے کہ ؎

جب تم ہی چلے پردیس لگا کر ٹھیس تو پیتم پیارا۔ دنیا میں کون ہمارا

میں ایک دم چیخا "یہ کیا بکواس ہے۔ کس مسخرے نے کہا یہ غزل ہے۔" اس نے گانا گوانے والے استاد کی طرف اشارہ کر دیا کہ "یہ ہیں ہمارے میوزک ڈائرکٹر ان ہی کی یہ فرمائش ہے"۔ اس شخص نے اور بھی کمال کی بات کہی: "دیکھئے صاحب آپ تو نثر کے چھوٹے بڑے فقرے لکھ دیجئے۔ بس گانا میں خود بنا لوں گا" میں تڑپ کر اٹھا اور سر پر پیر رکھ کر بھاگا۔ دیر ہوئی یہاں پہنچے ہوئے مگر اب تک وحشت طاری ہے۔ اے بھئی مرزا کسی طرح کہہ سن کر موت کے فرشتے کو راضی کر لو کہ مجھ کو لے جائے۔ سنا ہے فانی بدایونی سے اس کے اچھے مراسم ہیں۔ ان ہی کی سفارش پہنچواؤ۔

ملاقات کا طالب

غالب

★

سعادت حسن منٹو

شہید ساز

میں کاٹھیاواڑ گجرات کا رہنے والا ہوں۔ ذات کا بنیا ہوں۔ پچھلے برس جب تقسیمِ ہندوستان پر ٹنٹا ہوا تو میں بالکل بیکار تھا معاف کیجیے گا میں نے لفظ ٹنٹا استعمال کیا مگر اس کا کوئی حرج نہیں اس لیے کہ اردو زبان میں باہر کے الفاظ آنے ہی چاہئیں چاہے گجراتی ہی کیوں نہ ہوں۔

جی ہاں، میں بالکل بیکار تھا۔ لیکن کوکین کا تھوڑا سا کاروبار چل رہا تھا جس سے کچھ آمدن کی صورت ہو ہی جاتی تھی۔ جب بٹوارہ ہوا اور اِدھر کے آدمی اُدھر اور اُدھر کے آدمی اِدھر ہزاروں کی تعداد میں آنے جانے لگے تو میں نے سوچا چلو پاکستان چلیں۔ کوکین کا نہ سہی کوئی اور کاروبار شروع کر دوں گا۔ چنانچہ وہاں سے چل پڑا اور راستے میں مختلف قسم کے چھوٹے چھوٹے دھندے کرتا پاکستان پہنچ گیا۔

میں تو چلا ہی اس نیت سے تھا کہ کوئی موٹا کاروبار کروں گا چنانچہ پاکستان پہنچتے ہی میں نے حالات کو اچھی طرح جانچا اور الاٹمنٹوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مسکہ پالش مجھے آتا ہی تھا۔ چکنی چپڑی باتیں کیں۔ ایک دو آدمیوں کے ساتھ یارانہ گانٹھا اور ایک چھوٹا سا مکان الاٹ کرا لیا۔ اس سے کافی منافع ہوا تو میں مختلف شہروں میں پھر کر مکان اور دکانیں الاٹ کرانے کا دھندا کرنے لگا۔

کام کوئی بھی ہو انسان کو محنت کرنی پڑتی ہے، مجھے بھی [illegible] الاٹمنٹوں کے سلسلے میں کافی تگ و دو کرنی پڑی۔ کسی کے مسکہ لگایا کسی کی مٹھی گرم کی، کسی کو کھانے کی دعوت دی۔ کسی کو ناچ رنگ کی، غرضیکہ بے شمار بکھیڑے تھے۔ دن بھر خاک چھانتا۔ بڑی کوٹھیوں کے پھیرے کرتا اور شہر کا چپہ چپہ دیکھ کر اچھا سا مکان تلاش کرتا جس کے الاٹ کرانے سے زیادہ منافع ہو۔

انسان کی محنت کبھی خالی نہیں جاتی چنانچہ ایک برس کے اندر اندر میں نے لاکھوں روپے پیدا کر لیے۔ اب خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ رہنے کو بہترین کوٹھی۔ بینک میں بے اندازہ مال پانی ـــ معاف کیجیے گا۔ میں کاٹھیاواڑ گجرات کا روزمرہ استعمال کر گیا۔ مگر کوئی واندہ نہیں، اردو زبان میں باہر کے الفاظ بھی شامل ہونے چاہئیں ـــ جی ہاں، اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ رہنے کو بہترین کوٹھی، نوکر چاکر، پیکارڈ موٹر، بینک میں ڈھائی لاکھ روپے۔ کارخانے اور دکانیں الگ...... یہ سب کچھ تھا لیکن میرے دل کا چین جانے کہاں اڑ گیا۔ یوں تو کوکین کا دھندا کرتے ہوئے بھی دل پہ

کبھی کبھی بوجھ محسوس ہوتا تھا لیکن اب تو جیسے دل رہا ہی نہیں تھا۔ یا پھر یوں کہیئے کہ بوجھ اتنا آن پڑا کہ دل اس کے نیچے دب گیا۔ پر یہ بوجھ کس بات کا تھا؟

آدمی ذہین ہوں، دماغ میں کوئی سوال پیدا ہو جائے تو میں اس کا جواب ڈھونڈ ہی نکالتا ہوں۔ ٹھنڈے دل سے (حالانکہ دل کا کچھ پتا ہی نہیں تھا) میں نے غور کرنا شروع کیا کہ اس گڑبڑ گھوٹالے کی وجہ کیا ہے؟

عورت؟ ...... ہو سکتی ہے۔ میری اپنی تو کوئی بھی نہیں۔ جو تھی وہ کاٹھیاواڑ گجرات ہی میں اللہ کو پیاری ہو گئی تھی لیکن دوسروں کی عورتیں موجود تھیں۔ مثال کے طور پر اپنے مالی ہی کی تھی۔ اپنا اپنا ٹیسٹ ہے۔ سچ پوچھیئے تو عورت جوان ہونی چاہیئے اور یہ ضروری نہیں کہ پڑھی لکھی ہو ڈانس کرنا جانتی ہو۔ اپن کو تو ساری جوان عورتیں چلتی ہیں (کاٹھیاواڑ گجرات کا محاورہ ہے جس کا اردو میں نعم البدل موجود نہیں)

عورت کا تو سوال ہی اٹھ گیا اور دولت کا پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لیئے کہ بندہ زیادہ لالچی نہیں۔ جو کچھ ہے اسی پر قناعت ہے لیکن پھر یہ دل والی بات کیوں پیدا ہو گئی تھی۔

آدمی ذہین ہوں۔ کوئی مسئلہ سامنے آجائے تو اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کارخانے چل رہے تھے، دکانیں بھی چل رہی تھیں اور روپیہ اپنے آپ پیدا ہو رہا تھا۔ میں نے الگ تھلگ ہو کر سوچنا شروع کیا اور بہت دیر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ دل کی گڑبڑ صرف اس لیئے ہے کہ میں نے کوئی نیک کام نہیں کیا۔

کاٹھیاواڑ گجرات میں تو میں نے بیسیوں نیک کام کیے تھے۔ مثال کے طور پر جب میرا دوست پانڈورنگ مر گیا تو میں نے اس کی رانڈ کو اپنے گھر ڈال لیا اور دو برس تک اس کو دھندا کرنے سے روکے رکھا۔

وناٹک کی لکڑی کی ٹانگ۔ ٹوٹ گئی تو اسے نئی خرید دی۔ تقریباً چالیس روپے اس پر اٹھ گئے تھے۔ جمنا بائی کو گرمی ہو گئی۔ معافی کو (معاف کیجئے گا) کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ چھ مہینے برابر اس کا علاج کراتا رہا ...... لیکن پاکستان آکر میں نے کوئی نیک کام نہیں کیا تھا اور دل کی گڑبڑ کی یہی وجہ تھی ورنہ اور سب ٹھیک تھا۔

میں نے سوچا، کیا کروں؟ — خیرات دینے کا خیال آیا لیکن ایک روز شہر میں گھوما تو دیکھا کہ قریب قریب ہر شخص بھکاری ہے۔ کوئی بھوکا ہے کوئی ننگا۔ کس کس کا پیٹ بھروں، کس کس کا انگ ڈھانکوں؟ — سوچا ایک لنگرخانہ کھول دوں لیکن ایک لنگرخانے سے کیا ہوتا اور پھر اناج کہاں سے لاتا۔ بلیک مارکیٹ سے خریدنے کا خیال پیدا ہوا تو یہ سوال بھی ساتھ ہی پیدا ہو گیا کہ ایک طرف گناہ کر کے دوسری طرف کارِ ثواب کا مطلب ہی کیا ہے۔

گھنٹوں بیٹھ بیٹھ کر میں نے لوگوں کے دکھ درد سنے۔ سچ پوچھیئے تو ہر شخص دکھی تھا، وہ بھی جو دکانوں کے تھڑوں پر سوتے ہیں اور وہ بھی جو اونچی اونچی حویلیوں میں رہتے ہیں۔ پیدل چلنے والے کو یہ دکھ تھا کہ اس کے پاس کام کا کوئی جوتا نہیں۔ موٹر میں بیٹھنے والے کو یہ دکھ تھا کہ اس کے پاس کار کا نیا ماڈل نہیں۔ ہر شخص کی شکایت اپنی اپنی جگہ درست تھی۔ ہر

شخص کی حاجت اپنی اپنی جگہ معقول تھی۔

میں نے غالب کی ایک غزل اللہ بخشے شولاپور کی امینہ بائی چپلے کر سے سنی تھی۔ ایک شعر یاد رہ گیا ہے ؎ کس کی حاجت روا کرے کوئی —— معاف کیجیے گا یہ اس کا دوسرا مصرع ہے اور ہو سکتا ہے پہلا ہی ہو۔

جی ہاں، میں کس کس کی حاجت روا کرتا جب سو میں سے سو ہی حاجت مند تھے۔ میں نے پھر یہ بھی سوچا کہ خیرات دینا کوئی اچھا کام نہیں۔ ممکن ہے آپ مجھ سے اتفاق نہ کریں لیکن میں نے مہاجرین کے کیمپوں میں جا جا کر جب حالات کا اچھی طرح جائزہ لیا تو مجھے معلوم ہوا کہ خیرات نے بہت سے مہاجرین کو بالکل ہی نکما بنا دیا ہے۔ دن بھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ تاش کھیل رہے ہیں۔ جگار ہو رہی ہے (معاف کیجیے گا جگار کا مطلب ہے جوا یعنی قمار بازی) گالیاں بک رہے ہیں اور فوکٹ یعنی مفت کی روٹیاں توڑ رہے ہیں —— ایسے لوگ بھلا پاکستان کو مضبوط بنانے میں کیا مدد دے سکتے ہیں، چنانچہ میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ بھیک دینا ہرگز ہرگز نیکی کا کام نہیں۔ لیکن پھر نیکی کے کام کے لیے اور کونسا رستہ ہے؟

کیمپوں میں دھڑا دھڑ آدمی مر رہے تھے۔ کبھی ہیضہ پھوٹتا تھا کبھی پلیگ۔ ہسپتالوں میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ مجھے بڑا ترس آیا۔ قریب تھا کہ ایک ہسپتال بنوا دوں مگر سوچنے پر ارادہ ترک کر دیا۔ پوری اسکیم تیار کر چکا تھا۔ عمارت کے لیے ٹنڈر طلب کرتا۔ داخلے کی فیسوں کا روپیہ جمع ہو جاتا۔ اپنی ہی ایک کمپنی کھڑی کر دیتا اور ٹنڈر اُس کے نام نکال دیتا۔ خیال تھا ایک لاکھ روپے عمارت پر صرف کروں گا۔ ظاہر ہے کہ ستر ہزار روپے میں بلڈنگ کھڑی کر دیتا اور پورے تیس ہزار روپے بچا لیتا مگر یہ ساری اسکیم دھری کی دھری رہ گئی۔ جب میں نے سوچا کہ اگر مرنے والوں کو بچا لیا گیا تو یہ جو زاید آبادی ہے وہ کیسے کم ہوگی۔

غور کیا جائے تو یہ سارا لفڑا ہی فالتو آبادی کا ہے۔ لفڑا کا مطلب ہے جھگڑا، وہ جھگڑا جس میں فضیحتا بھی ہو، لیکن اس سے بھی اس لفظ کی پوری معنویت میں بیان نہیں کر سکا۔

جی ہاں غور کیا جائے تو یہ سارا لفڑا ہی اس فالتو آبادی کا باعث ہے۔ اب لوگ بڑھتے جائیں گے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ زمینیں بھی ساتھ ساتھ بڑھتی جائیں گی، آسمان بھی ساتھ ساتھ پھیلتا جائے گا۔ بارشیں زیادہ ہوں گی، اناج زیادہ پیدا ہوگا۔ اس لئے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہسپتال بنانا ہرگز ہرگز نیک کام نہیں۔

پھر سوچا مسجد بنوا دوں لیکن اللہ بخشے شولاپور کی امینہ بائی چپلے کر کا گایا ہوا ایک شعر یاد آ گیا ؎

نام منجور ہے تو فیج کے اسباب بنا

وہ منظور کو منجور اور فیض کو فیج کہا کرتی تھی۔ نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا۔ پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا۔

کس کم بخت کو نام و نمود کی خواہش ہے۔ وہ جو نام اچھالنے کے لئے پل بناتے ہیں نیکی کا کیا کام کرتے ہیں؟ —— خاک! میں نے کہا نہیں یہ مسجد بنوانے کا خیال بالکل غلط ہے۔ بہت سی الگ الگ مسجدوں کا ہونا بھی قوم کے حق میں ہرگز مفید نہیں ہو سکتا۔ اس لئے

کہ عوام بٹ جاتے ہیں۔

تھک ہار کر میں حج کی تیاریاں کر رہا تھا کہ اللہ میاں نے مجھے خود ہی ایک راستہ بتا دیا۔ شہر میں ایک جلسہ ہوا۔ جب ختم ہوا تو لوگوں میں بدنظمی پھیل گئی۔ اتنی بھگدڑ مچی کہ بیس آدمی ہلاک ہو گئے۔ اس حادثے کی خبر دوسرے روز اخباروں میں چھپی تو معلوم ہوا کہ وہ ہلاک نہیں بلکہ شہید ہوئے تھے۔

میں نے سوچنا شروع کیا۔ سوچنے کے علاوہ میں کئی مولویوں سے ملا۔ معلوم ہوا کہ وہ لوگ جو اچانک حادثوں کا شکار ہوتے ہیں، انہیں شہادت کا رتبہ ملتا ہے یعنی وہ رتبہ جس سے بڑا کوئی اور رتبہ ہی نہیں میں نے سوچا کہ اگر لوگ مرنے کے بجائے شہید ہوا کریں تو کتنا اچھا ہے۔ وہ جو عام موت مرتے ہیں ظاہر ہے کہ ان کی موت بالکل اکارت جاتی ہے اگر وہ شہید ہو جاتے تو کوئی بات تھی۔

میں نے اس باریک بات پر اور غور کرنا شروع کیا۔

چاروں طرف جدھر دیکھو خستہ حال انسان تھے۔ چہرے زرد، فکر و تردد اور غمِ روزگار کے بوجھ تلے پسے ہوئے۔ دھنسی ہوئی آنکھیں بے جان چال، کپڑے تار تار۔ ریل گاڑی کے کنڈم مال کی طرح یا تو کسی ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں پڑے ہیں یا بازاروں میں بے مالک مویشیوں کی طرح منہ اٹھائے بے مطلب گھوم رہے ہیں۔ کیوں جی رہے ہیں، کس کے لئے جی رہے ہیں اور کیسے جی رہے ہیں۔ اس کا کچھ پتا ہی نہیں۔ کوئی وبا پھیلی۔ ہزاروں مر گئے۔ اور کچھ نہیں تو بھوک اور پیاس ہی سے گھل گھل مرے۔ سردیوں میں اکڑ گئے۔ گرمیوں میں سوکھ گئے۔ کسی کی موت پر کسی نے دو آنسو بہا دیئے، اکثریت کی موت خشک ہی رہی۔

زندگی سمجھ میں نہ آئی، ٹھیک ہے، اُس سے حظ نہ اٹھایا، یہ بھی ٹھیک ہے...... وہ کس کا شعر ہے۔ اللہ بخشے شولاپور کی امینہ بائی چتلے کر کیا دردبھری آواز میں گایا کرتی تھی ؎ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے۔ میرا مطلب ہے اگر مرنے کے بعد بھی زندگی نہ سدھری تو لعنت ہے سُسری پر۔

میں نے سوچا کیوں نہ یہ بیچارے، یہ قسمت کے مارے، دردر کے ٹھکرائے ہوئے انسان جو اس دنیا میں ہر اچھی چیز کے لئے ترستے ہیں۔ اُس دنیا میں ایسا رتبہ حاصل کریں کہ وہ جو یہاں ان کی طرف نگاہ اٹھانا پسند نہیں کرتے وہاں ان کو دیکھیں اور رشک کریں۔ اس کی ایک ہی صورت تھی کہ وہ عام موت نہ مریں بلکہ شہید ہوں۔

اب سوال تھا کہ یہ لوگ شہید ہونے کے لئے راضی ہوں گے؟ میں نے سوچا کیوں نہیں، وہ کون مسلمان ہے جس میں ذوقِ شہادت نہیں مسلمانوں کی دیکھا دیکھی تو ہندوؤں اور سکھوں میں بھی یہ رتبہ پیدا کر دیا گیا ہے۔ لیکن مجھے سخت ناامیدی ہوئی جب میں نے ایک مریل سے آدمی سے پوچھا "کیا تم شہید ہونا چاہتے ہو؟" تو اس نے جواب دیا "نہیں"

سمجھ میں نہ آیا کہ وہ شخص جی کر کیا کرے گا۔ میں نے اُسے بہت سمجھایا۔ کہ دیکھو بڑے میاں، زیادہ سے زیادہ، زیادہ سے زیادہ تم ڈیڑھ مہینہ اور جیو گے۔ چلنے کی تم میں سکت نہیں۔ کھانستے کھانستے غوطے میں جاتے ہو

تو ایسا لگتا ہے کہ بس دم نکل گیا۔ پھوٹی کوڑی تک تمہارے پاس نہیں، زندگی بھر تم نے سکھ نہیں دیکھا، مستقبل کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پھر اور جی کر کیا کرو گے۔ فوج میں تم بھرتی ہو نہیں سکتے اس لئے محاذ پہ اپنے وطن کی خاطر لڑتے لڑتے جان دینے کا خیال بھی عبث ہے۔ اس لئے کیا یہ بہتر نہیں کہ تم کوشش کر کے یہیں بازار میں یا ڈیرے میں جہاں تم رات کو سوتے ہو اپنی شہادت کا بندوبست کر لو۔

اُس نے پوچھا: "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

میں نے جواب دیا: "یہ سامنے کیلے کا چھلکا پڑا ہے، فرض کیا جائے کہ تم اس پر سے پھسل جاؤ..... ظاہر ہے کہ تم مر جاؤ گے اور شہادت کا رتبہ پاؤ گے۔" پر یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ کہنے لگا: "میں کیوں آنکھوں دیکھے کیلے کے چھلکے پر پاؤں دھرنے لگا۔ کیا مجھے اپنی جان عزیز نہیں۔۔۔

۔۔۔ اللہ اللہ کیا جان تھی۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ جھریوں کی گٹھڑی!!

مجھے بہت افسوس ہوا اور اُس وقت اور بھی زیادہ ہوا جب میں نے سنا کہ وہ کم بخت جو بڑی آسانی سے شہادت کا رتبہ اختیار کر سکتا تھا خیراتی ہسپتال میں لوہے کی چارپائی پر کھانستا کھنکارتا مر گیا۔

ایک بڑھیا تھی۔ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ آخری سانس لے رہی تھی۔ مجھے بہت ترس آیا۔ ساری عمر غریب کی مفلسی اور رنج و غم میں گذری تھی۔ میں اسے اٹھا کر ریل کے پاٹے پر لے گیا۔ معاف کیجئے گا۔ ہمارے یہاں پٹڑی کو پاٹا کہتے ہیں۔ لیکن جناب جونہی اس نے ٹرین کی آواز سنی ہوش میں آ گئی اور کوک بھرے کھلونے کی طرح اٹھ کر بھاگ گئی۔

میرا دل ٹوٹ گیا۔ لیکن پھر بھی میں نے ہمت نہ ہاری۔ بنیا کا بیٹا اپنی دھن کا پکا ہوتا ہے۔ نیکی کا جو صاف اور سیدھا راستہ مجھے نظر آیا تھا میں نے اس کو اپنی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیا۔

مغلوں کے وقت کا ایک بہت بڑا احاطہ خالی پڑا تھا۔ اس میں ایک سو اکاون چھوٹے چھوٹے کمرے تھے، بہت ہی خستہ حالت میں۔ میری تجربہ کار آنکھوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ پہلی ہی بڑی بارش میں سب کی چھتیں ڈھے جائیں گی۔ چنانچہ میں نے اس احاطے کو ساڑھے دس ہزار روپے میں خرید لیا اور اس میں ایک ہزار مفلوک الحال آدمی بسا دیئے۔ دو مہینے کرایہ وصول کیا ایک روپیہ ماہوار کے حساب سے۔ تیسرے مہینے جیسا کہ میرا اندازہ تھا پہلی ہی بڑی بارش میں سب کمروں کی چھتیں نیچے آ رہیں۔ اور سات سو آدمی جن میں بچے بوڑھے سبھی شامل تھے شہید ہو گئے۔

وہ جو میرے دل پر بوجھ بوجھ سا تھا کسی قدر ہلکا ہو گیا، آبادی میں سے سات سو آدمی کم بھی ہو گئے۔ لیکن انہیں شہادت کا رتبہ بھی مل گیا۔ اِدھر کا پلڑا بھاری ہی رہا۔

جب سے میں یہی کام کر رہا ہوں۔ ہر روز حسب توفیق دو تین آدمیوں کو جامِ شہادت پلا دیتا ہوں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کام کوئی بھی ہو انسان کو محنت کرنی ہی پڑتی ہے۔ اللہ بخشے شولاپور کی امینہ بائی چتلے کر ایک شعر گایا کرتی تھی، لیکن معاف کیجئے گا وہ شعر یہاں ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ کچھ بھی ہو، کہنا یہ ہے کہ مجھے کافی محنت کرنی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک آدمی کو جس کا وجود چھکڑے کے پانچویں پہیے کی طرح بے معنی اور بیکار

تھا۔ جام شہادت پلانے کے لئے مجھے پورے دس دن جگہ جگہ کیلے کے چھلکے گرانے پڑے۔ لیکن موت کی طرح جہاں تک میں سمجھتا ہوں شہادت کا بھی ایک دن مقرر ہے۔ دسویں روز جاکر وہ پتھریلے فرش پر کیلے کے چھلکے پر سے پھسلا اور شہید ہوا۔

آج کل میں ایک بہت بڑی عمارت بنوا رہا ہوں۔ ٹھیکہ میری ہی کمپنی کے پاس ہے۔ دو لاکھ کا ہے۔ اس میں سے پچھتر ہزار تو میں صاف اپنی جیب میں ڈال لوں گا۔ بیمہ بھی کرا لیا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ جب تیسری منزل کھڑی کی جائے گی تو ساری بلڈنگ اڑا اڑا دھڑام گر پڑے گی کیونکہ مصالحہ ہی میں نے ایسا لگوایا ہے۔ اس وقت تین سو مزدور کام پر لگے ہوں گے۔ خدا کے گھر سے مجھے پوری پوری امید ہے کہ یہ سب کے سب شہید ہو جائیں گے لیکن اگر کوئی بچ گیا تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ پرلے درجے کا گناہگار ہے جس کی شہادت اللہ تبارک و تعالیٰ کو منظور نہیں تھی۔

"میں جانتا تھا کہ وہ نکلے"

ایک مرتبہ ہم مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لکھنؤ گئے۔ اجلاس کے ایام میں ایک شام ایسی بھی تھی کہ ہم فارغ تھے۔ اقبال کی طبیعت جب بیکاری سے گھبرانے لگی تو وہ مجھ سے فرمانے لگے "چلو کہیں چل کے گھڑی دو گھڑی گانا ہی سن آئیں"۔ میں پہلے تو آمادہ ہو گیا مگر بعد میں کسی اچانک کام کی وجہ سے رک گیا، وہ چل کھڑے ہوئے۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد جب وہ لوٹے تو مسکرا رہے تھے۔ کہنے لگے "تو آج تمہیں ایک تماشا دکھائیں"۔ میں نے استعجاب کے عالم میں دریافت کیا "آخر ہوا کیا ہے؟" فرمانے لگے "ہونا کیا تھا بس آج ایک مولوی صاحب کو ہم نے پکڑ لیا۔ جس طوائف کے ہاں ہم گانا سننے گئے تھے وہیں کہیں اس کانفرنس کے مندوبین میں سے ایک مولوی صاحب بھی ہمارے جانے سے قبل دل بہلا رہے تھے مگر آپ جب وہاں سے چمپت ہوئے تو اپنی بوکھلاہٹ کے عالم میں کانفرنس کا دعوتی رقعہ وہیں پھینک آئے تھے۔ ہم پہنچے تو طوائف نے ہم سے کہا کہ جس طرح بھی ہو ہم مولوی صاحب کو تلاش کر کے انکی امانت بحفاظت ان تک پہنچا دیں۔ مگر ہم نے یہ سوچا ہے کہ یہ رقعہ نواب وقار الملک بہادر صدر ایجوکیشنل کانفرنس ہی کی معرفت کیوں نہ لوٹائیں تاکہ ضابطے کی پابندی بھی ملحوظ رہے اور نواب بہادر بھی دیکھ لیں کہ دنیا بھلی سے بھلی ہے۔"

اتنا کہہ کر اقبال نے کاغذ کا تختہ نکالا اور قلم پکڑ کر نواب صاحب کے نام طوائف کی طرف سے ایک مفصل خط لکھ ڈالا۔ اس میں شام کے واقعے کی تمام تفصیل بے کم و کاست بیان کرنے کے بعد لکھا کہ بندی قبلہ مولوی صاحب کے پتے سے واقف نہیں اس لئے آپ سے التماس کرتی ہے کہ انکا کھوج لگا کر انکے کاغذات ان تک پہنچا دیں۔ اس خط کی بھنک مولوی صاحب کے کان میں بھی پڑ گئی اور وہ ہانپتے کانپتے اقبال کے پاس آئے اور لگے بے طرح منت خوشامد کرنے اور انکی جان و مال کو دعائیں دینے۔ مگر اقبال تو گویا اس وقت کے انتظار ہی میں تھے۔ آئے ہو تو جانے کہاں ہو کے بمصداق انہوں نے حضرت کو وہ رگیدا کہ بس اللہ دے تو بندہ لے۔ آپ نے ناک سے کتنی لکیریں کھینچیں تب آپ کی جان چھوٹی۔ (مرزا جلال الدین۔ ملفوظات اقبال)

فراق گورکھپوری

یہ مروّت ہے یا محبّت ہے
آج تم سے مجھے شکایت ہے

وہ گنہگارِ عشق آتے ہیں
جن کے قدموں کے نیچے جنّت ہے

کچھ کمی پر ہے دردِ تنہائی
آج مجھ کو تری ضرورت ہے

ہر اشارہ ہے میکدہ بردوش
کیا اب ان انکھڑیوں کی نیّت ہے

معجزے ہو ہی جاتے ہیں اے دوست
ہم فقیروں کا دم غنیمت ہے

ہے تمنّائے گفتگو تجھ سے
دیکھ لینے کی تجھ کو حسرت ہے

بزم آرائیاں نہ پوچھ اس کی
ہر نظر جس کی رشکِ خلوت ہے

زندگی کے عذاب خانے میں
عاشقوں کا وجود رحمت ہے

سو بہاروں کی اک بہار اے دوست تیری رنگینیٔ طبیعت ہے

عشق ہے مرگِ ناگہاں کا پیام عشق سے زندگی عبارت ہے

پیکرِ ناز —— کوئی عالم ہو ایک تصویرِ خوابِ راحت ہے

کس سے عرضِ وفا کریں اے دل نگہِ دوست بے مروت ہے

کچھ انہی پہ کھلے رموزِ حیات ان نگاہوں سے جن کو نسبت ہے

آنکھ اوجھل جہاں بچشمِ زدن بس یہاں اک نظر کی فرصت ہے

کیا سے کیا ہو گیا جمال ترا ہم فقیروں کا فیضِ صحبت ہے

میری بربادیوں کا رنج نہ کر مہرباں اپنی اپنی قسمت ہے

دلِ غم دیدہ کو بقولِ فراقؔ
یاد آنا ترا قیامت ہے

عدم

قسمتِ نارسا کی بات نہ کر — بننے والی گھٹا کی بات نہ کر
اب نہیں ہے ہمیں کوئی تکلیف — چارہ گر اب دوا کی بات نہ کر
کیا برائی ہے غنچۂ گل میں — اُس کے رنگِ قبا کی بات نہ کر
حادثے اور کم ہیں دنیا میں — دلِ ناداں خدا کی بات نہ کر
ہم بھی ایسے گنہ گار نہیں — زاہدِ پارسا کی بات نہ کر
تو نے وعدہ کیا تھا محشر کا — دیکھ اب التوا کی بات نہ کر
عذرِ مستی نہ ڈھونڈ لے کوئی — تمکنت سے حیا کی بات نہ کر

اے عدمؔ سب گناہ کر لیکن
دوستوں سے ریا کی بات نہ کر

تاثیر

لطفِ وفا نہیں کہ وہ بیداد گر نہیں — خاموش ہوں کہ میری فغاں بے اثر نہیں
تیرے بغیر تلخیٔ کام و دہن حرام — دردِ جگر ہے لذتِ دردِ جگر نہیں
سجدوں سے نامراد ہے جلووں سے ناامید — وہ رہ گزر کہ اب جو تری رہ گزر نہیں
تم کیا گئے کہ سارا زمانہ چلا گیا، — وہ رات دن نہیں ہیں وہ شام و سحر نہیں
ہر ہر روش معاملۂ حسن و عاشقی — ہر ہر قدم فروغِ جمالِ نظر نہیں
بے باک چال، چال سے بے باک تر نظر! — اب حسن تو بہت ہے مگر فتنہ گر نہیں
زخموں سے چور قافلے، پُر خار راستے — اس میں ترا قصور تو اے راہبر نہیں!

دنیائے چشم و گوش تو برباد ہو گئی
اب کچھ بغیر معرکۂ خیر و شر نہیں

احمد ندیم قاسمی

یہ میری بے بصری ہے کہ تیری بے خبری — مرا جنونِ عملی ہے، تری خرد نظری

اب آفتاب کی باری ہے، رات بھاری ہے — میں دیکھتا ہوں کب تک ستارۂ سحری

یہ ایک قطرۂ شبنم ہے مہر و مہ بکنار — بہت قریب سے دیکھو جو فطرتِ بشری

جہاں سے پھول گرا تھا، وہیں کلی چٹکی — اگر ہے فتنہ یہی، تو نثارِ فتنہ گری

زمیں اداس، ستارے اداس، چاند اداس — یہ پچھلی رات ہے یا تیری شانِ کم نظری

یہ تجھ کو دیکھ کے کیوں لوگ مجھ کو دیکھتے ہیں — یہ تیری جلوہ گری ہے کہ میری پردہ دری

فلک پہ ٹوٹے ستارا زمیں پہ اشک گرے
مرے ندیم! یہی ہے کمالِ بخیہ گری

تابش دہلوی

درد پاکر ہمہ تن دل نہیں ہونے پاتے — ہم ترے عشق کے قابل نہیں ہونے پاتے

صورتِ شمع جلے بزم میں تیری برسوں — پھر بھی ہم رونقِ محفل نہیں ہونے پاتے

دیر و کعبہ ہیں بالفاظِ دگر وہ سجدے — جو مرے عجز میں شامل نہیں ہونے پاتے

اشک بنتے ہیں وہی خونِ جگر کے قطرے — قصۂ غم کا جو حاصل نہیں ہونے پاتے

بے محابا نگہِ شوق تجھے دیکھتی ہے — اب حجابات بھی حائل نہیں ہونے پاتے

کر دیا شوقِ طلب نے ہمیں گم کردۂ راہ — ہم سرِ جادۂ منزل نہیں ہونے پاتے

ڈوب چکتے نہیں ہم بحر میں طوفانوں سے — یعنی آسودۂ ساحل نہیں ہونے پاتے

روزِ فردا بھی قیامت نہیں ہوتا تابشؔ
ان کے وعدے ہیں کہ باطل نہیں ہونے پاتے

انجم رومانی

آزاد غلام

پکارتے ہیں مجھے وہ لمحے
جنہیں کچل کر بڑھا ہوں آگے
بڑھا ہوں آگے کہ زندگی ہیں
کچھ اور ممکن نہیں ہے شاید

اور آج دنیا بدل چکی ہے، جہانِ کہنہ اجڑ چکا ہے
ہزاروں لمحے رسیلی کلیوں کی طرح کھلتے ہیں اور کہتے
ہیں "زندگی ہے۔
ہمارے رس میں، ہمارے امرت بھرے نفس ہیں"—

کچھ اور ممکن نہیں تھا، میں نے
اُن اَن گنت پُربہار لمحوں کو بے حسی سے
کچل کے اپنا جہان تعمیر کر لیا تھا
جہاں تھیں بیکار، سرد باتیں، تکلّف آمیز وارداتیں

اگرچہ رگ رگ میں ان کا رس رچ چکا ہے، لیکن
میں اب بھی کیفِ نفس سے محروم ہوں کہ مجھ کو
تحفظِ زندگی کی خاطر
جہانِ کہنہ کی لاش سے لپٹے رہنے والوں سے واسطہ ہے

قطعہ

اُف یہ لمحاتِ جدائی کی کرم فرمائیاں
عشق کو بھانے لگی ہیں انجمن آرائیاں
دل کی، دنیا کے غموں سے ہو چلی ہے رسم و راہ
دور ہوتی جا رہی ہیں اب مری تنہائیاں

(سلیم احمد)

مسعود پرویز

کیا کہیے ناداں دل کو ناکام بھی ہے بدنام بھی ہے
سربستہ ہیں راز اس کے پر ان کی حکایت عام بھی ہے

یوں تو ترکِ محبت کے دعوے بھی کرتے ہیں لیکن
آنکھوں سے آنسو ہیں رقصاں ہونٹوں پہ کسی کا نام بھی ہے

دل ویراں ہی سہی میرا پر اس دل کے ویرانے میں
دہکتے ہوئے عارض کی شفق ہے اور زلفوں کی شام بھی ہے

اے فلکِ بے فیض مجھے تیرے مہتاب سے کیا لینا
میرا ماہِ منور ہر شب نو ہے اور تمام بھی ہے

عشق ہے لاحاصل جب تک مائل بہ تقابل حسن نہ ہو
نگہِ شوق تو اٹھی پر کوئی بالائے بام بھی ہے؟

شاید اب وہ جرأتِ رنداں ہی نہ رہی میخواروں میں
ورنہ محفل میں مے بھی ہے مینا بھی جام بھی ہے

ہائے وہ دن پرویزؔ کہ جب جینا مرنا دشوار نہ تھا
ہر آغازِ کار سے پہلے اب فکرِ انجام بھی ہے

آفتاب احمد

دیکھے نہ تھے یہ رنگ کبھی یادِ یار کے
"سو داغ دے گئے مجھے دو دن بہار کے"

بھولی سی اک نگاہ کم انداز ہی سہی
جی ڈھونڈتا ہے آج بہانے قرار کے

آخر ترا خیال بھی دل سے بھلا دیا
یہ اختیار اور دلِ بے اختیار کے

کچھ کم نہ تھی عنایتِ بے گانگی تری
دو لفظ کہہ کے بھول گئے تجھ سے پیار کے

روحِ قرار کچھ تری قربت ہی میں نہیں
جانا یہ آج تیری محبت میں ہار کے

جب تیری یاد تجھ کو بھلانے کا نام تھی
کچھ وہ بھی مرحلے تھے غمِ انتظار کے

اشکوں سے دھل گیا مرے دامن کا داغ داغ
دل کیا سے کیا ہوا شبِ ہجراں گزار کے

عبد المتین عارف

تیرے پیمان حرفِ بام ہوئے
دن ڈھلے اور ڈھل کے شام ہوئے

وصل میں لذّتِ وصال نہیں
اور فرقت کے غم حرام ہوئے

آنچ دیتی ہے جنّتِ موعود،
یعنی دھوکے میں ہم تمام ہوئے

تیری آنکھوں سے سب کو نسبت ہے
مے ہوئی، خُم ہؤا، کہ جام ہوئے

دل میں دیپک سے جھلملانے لگے
جانے ہم کس سے ہمکلام ہوئے

منزل اک جست کی نہیں مرہون
راہ میں سینکڑوں مقام ہوئے

عبّاس احمد عبّاسی

یہ جانتا ہوں کہ ہر انجمن میں ہوں ممتاز
یہ اور بات کہ میرا جہاں نہیں کوئی

تری عطائے محبّت عزیز ہے مجھکو
مگر اب اس کا یہاں قدرداں نہیں کوئی

وفورِ تشنگیِ شوقِ بندگی کی قسم
مری جبیں کے لئے آستاں نہیں کوئی

کھلا یہ گمرہیٔ صاحبانِ ہوش سے راز
کہ راہبر ہیں مگر راہ داں نہیں کوئی

ہزار حیف کہ وہ میکدہ بھی ہے برہم
کہ جس میں بندۂ پیرِ مغاں نہیں کوئی

نہ جانے کیوں مگر ان کی نوازشوں میں بھی اب
قرارِ دل کے لئے امتحاں نہیں کوئی،

اختر ہوشیار پوری

آپ کا غم نہیں یا زیست کی بیداد نہیں
مختصر یہ ہے کہ کب اہلِ جنوں شاد نہیں؟

مدتیں گزریں یہاں پھول بھی مہکا نہ کوئی
اور بگولے کبھی اُٹھے ہوں تو کچھ یاد نہیں

اور بھی کوئی خرابات میں تھا تیرے سوا
مجھ کو ساقی تری آنکھوں کی قسم یاد نہیں

میں زمانے سے ترے غم کا مداوا چاہوں
اے مرے دوست کچھ اتنا بھی ہمیں یاد نہیں

ہے بجا شکوۂ عالم کی خرابی پہ پیش
یاد وہ عالم نہیں اخترؔ ناشاد نہیں

سلیمہ احمد

جو کی بھی آہ تو اے اہلِ درد کیا پایا
بہت ہوا تو زمیں کانپی عرش تھرّایا

وہ غم ملا کہ غمِ اہلِ دہر کو سمجھے
یہی بہت ہے اگر عشق میں یہی پایا

بہت ہوا کہ بُری یا بھلی گزار گئے
ستم نصیبوں کو جینا تو خیر کیا آیا

اب آرزو بھی تری ساتھ چھوڑ دیتی ہے
یہ کس دیار میں مجھ کو مرا جنوں لایا؟

سلیمؔ آج یہ آنکھوں میں اشک کیسے ہیں
کب اُس کو بھول گئے تھے جو اب وہ یاد آیا

محمد حسن عسکری

پابلو پکاسو

پکاسو کا نام سنتے ہی ذہن میں عجیب و غریب اور عموماً ناقابلِ فہم تجربوں کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ پکاسو بیسویں صدی کے آرٹ اور دانش کی تجرباتی روح کی علامت بن گیا ہے۔ پچھلے پچاس سال میں اُس کے فن نے جتنے رنگ بدلے ہیں اُتنے آرٹ کی ساری تاریخ میں شاید ہی کسی مصوّر کے فن نے بدلے ہوں۔ چنانچہ اُس کی فنّی شخصیت عام لوگوں کے لئے ایک معمّہ، اور اس سے بھی گزر کے ایک تماشہ بن گئی ہے۔ آرٹ کے شوقین فیشن میں آ کے اس کی تصویروں کے بارے میں اشتیاق کا اظہار تو کرتے ہیں، مگر اُس کی فنّی شخصیت کے مرکزی عنصر کا پتہ چلانے کی کوشش نہیں کرتے، اور نہ اُس کے نت نئے تجربات اور اس مرکزی وحدت کا درمیانی رشتہ سمجھنا چاہتے ہیں۔ اِس مرکزی وحدت کا پتہ چل جائے تو پھر اُس کی "مکعبیت" بھی اتنی وحشت ناک باقی نہیں رہتی۔

یہ مرکزی وحدت کیا ہے؟ اس کا جواب اتنا سیدھا سادا ہے کہ ایک دفعہ تو آدمی اسے سُن کے چونک پڑتا ہے۔ یہ مرکزی وحدت ہے اس کا اسپینی خون۔ حالانکہ اُس کی عمر کا بیشتر حصّہ فرانس میں گزرا ہے، سیزان اور تُولوز لوترک نے اُس کی فنّی تربیت میں، بلکہ اُس کے فنّی شعور کو ایک خاص سمت دینے میں بڑا نمایاں حصّہ لیا ہے۔ اس نے عربوں کی خطّاطی سے سبق سیکھے ہیں اور حبشیوں کی مجسّمہ سازی کو اپنی روح میں جذب کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ مگر یہ گوناگوں اثرات قبول کرنے کے باوجود اُس کی بنیادی اسپینیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ پکاسو کی رُوح کو سمجھنے کے لئے اسپین کی رُوح کو سمجھنا ضروری ہے۔

اسپین صرف یورپ کا حصّہ نہیں ہے۔ یہ ملک باقی لاطینی مُلکوں سے نسلی، لسانی، ثقافتی اور مذہبی تعلّقات تو رکھتا ہے، اور بہت سی روایات اِن ملکوں میں مشترک بھی ہیں۔ مگر ایک بات نے اسپین کو ان سب ملکوں سے مختلف بنا دیا ہے۔ اور وہ بات یہ ہے کہ اِس مُلک میں سات سو سال تک عرب حکمرانی کر چکے ہیں —— صرف حکمرانی نہیں کر چکے بلکہ اس مُلک کے باشندے بن کر رہ چکے ہیں اور اس طرح کہ اسپین والوں کے طور طریقوں، عادات و اطوار، سوچنے سمجھنے کے ڈھنگ اور یہاں کے مناظر تک پر اپنا اثر چھوڑ گئے ہیں۔ اسلام

نے خدا، انسان اور فطرت کو ایک دوسرے میں خلط ملط نہیں کیا تھا، بلکہ ان تینوں تصوّرات کو بڑی حد تک الگ الگ رکھّا تھا، اور ان کی مستقل ہستی کو بھی تسلیم کیا تھا۔ اسلام نے انسان کو فطرت کی ہم آہنگی ڈھونڈنے کا سبق نہیں سکھایا تھا۔ بلکہ صاف یہ حکم دیا تھا کہ فطرت کو اپنا تابع بناؤ اور اس سے کام لو۔ چنانچہ زیادہ تر اسلامی فنون میں خصوصاً اسلامی تعمیرات میں انسان اور فطرت ایک دوسرے کے مخالف نہیں، بلکہ ایک دوسرے سے الگ نظر آتے ہیں۔ بالکل یہی چیز اسپین والوں کے کردار میں، ان کے فن میں، اُن کی عمارتوں میں نظر آتی ہے۔ اسپین کے معمولی مکان اس قسم کے ہوتے ہیں کہ اُن کی لائنیں فطرت کی لائنوں میں مدغم نہیں ہوتیں، بلکہ فطرت سے بالکل الگ چلتی ہیں۔ اسپینی گاؤں تک فطرت کا حصہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنی ہستی الگ برقرار رکھتا ہے۔ یہیں سے پکاسو کی مکعبیت پیدا ہوئی ہے۔

اسلام اور عربوں نے اسپین والوں کے طرزِ احساس میں، سمجھنے کے طریقوں میں، خود بصارت کے عمل میں ایک سادگی پیدا کر دی ہے۔ اُنکی اخلاقی حِس کے فیصلے اور اُن کی آنکھ کے فیصلے دونوں کے دونوں ابہام سے خالی، براہِ راست اور سادہ ہوتے ہیں۔ جس طرح اطالوی مصوّر اپنے موضوع میں مدغم ہوتا معلوم ہونے لگتا ہے ایسا اسپینی مصوّر کے یہاں نہیں ہوتا۔ اس کے یہاں چیزوں کی معروضیت برقرار رہتی ہے، اور اُن کا وجود مصور کے وجود سے الگ رہتا ہے۔ اس علیحدگی میں کسی قسم کا ارتعاش یا تناؤ یا تشنج نہیں پیدا ہونے پاتا۔ مصوّر اور اُس کا موضوع بننے والی چیزیں بڑے اطمینان کے ساتھ ایک دوسرے سے الگ رہتی ہیں۔ یہ خصوصیّت ویلاس کوئیس میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ گویا میں بھی اور پکاسو میں بھی اس کا اندازہ اُس تصویر سے بھی ہو سکتا ہے جو اس مضمون کے ساتھ دی جا رہی ہے۔

اسپین والوں کی دوسری خصوصیت ہے اخلاقی سادگی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گہرے اخلاقی مسائل کی اُنہیں سمجھ نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ اُن کے اخلاقی فیصلوں میں لاگ لپیٹ، الجھاوے اور بہلاوے نہیں ہوتے۔ اخلاقی مسائل میں وہ بہت جلدی فیصلہ کرتے ہیں اور بہت صاف۔ پھر یہ کہ اُن کے اخلاقی معیار مابعد الطبیعاتی اور غیر ضروری حد تک مثالیت پرستانہ نہیں ہوتے۔ اُن کے اخلاقی فیصلوں کی بنیاد ہمیشہ سماجی یا اجتماعی اعتبارات پر ہوتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات سیاسیات کی حدیں دُور نہیں رہ جاتیں۔ ایک ایل گریکو تو ضرور ایسا ہے جو مابعد الطبیعاتی اخلاقیات میں غرق ہے، مگر وہ اصلاً یونانی تھا۔ ورنہ باقی مصوّروں کا تو یہ حال ہے کہ ویلاس کوئیس جیسا غیر سیاسی آدمی اور درباری مصوّر تک اپنی تصویروں میں بادشاہ کی جھوٹی تعریف نہیں کر سکا۔ گویا کی تصویریں تو خیر کھلم کھلّا سیاسی نوعیت رکھتی ہی ہیں۔ وہی اجتماعی اخلاقیات پکاسو کی زیرِ نظر تصویر میں نظر آتی ہے۔ پکاسو ایک خاص قسم کے اجتماعی جذبے کے تحت ان دو فقیروں کو دیکھتا ہے، اور وہ اپنے بصارتی اور جذباتی تجربے کو انتہائی راست اور سادہ شکل میں پیش کر دیتا ہے۔ حالانکہ یہ تصویر اُس کے "نیلے دور" یعنی ۱۹۰۵ء کے قریب کی ہے۔ مگر اُس کے بصارتی عمل، جذباتی عمل اور پھر فنی عمل کے ارتکاز اور یکسوئی نے تصویر میں ہلکی سی تیسری بُعد پیدا کر دی ہے چنانچہ

اس تصویر کی ٹکنیک میں آئندہ آنے والی مکعبیت کی طرف بھی ایک اشارہ ملتا ہے۔

اس تصویر کی رُوح کو ٹھیک طرح سمجھنے میں وہ مجسّمہ بھی مدد دے گا جس کی تصویر موازنے کی غرض سے پیش کی جا رہی ہے۔ فن کار نے ایک غلام قوم کے غصّے اور انتقام کی خواہش کو مجسّمے کی شکل میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ بنیادی جذبہ بالکل صاف اور سیدھا سادا ہے۔ اور پُر زور بھی، مگر فن کار کا تخلیقی جذبہ وہ ارتکاز پیدا نہیں کر سکا جو پکاسو نے پیدا کر لیا تھا۔ مجسّمہ ساز کی توجہ فن پارے کے بُنیادی اور مرکزی جذبے سے ہٹ کر حبشی کے جسمانی حُسن کی طرف چلی گئی۔ غلام کا انتقامی جذبہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اُس نے یہ بھی چاہا ہے کہ مرد کے جسمانی حسن کا ایک نمونہ بھی پیش کر دوں۔ چنانچہ اُس کا تخلیقی جذبہ صاف اور بے میل نہیں رہا۔ اُس کی ذاتی شخصیت جس چیز کو ڈھونڈ رہی ہے۔ اُسے فن کار نے اپنے موضوع میں پانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ فن کار اور موضوع اپنی ہستی کو ایک دوسرے سے الگ نہیں رکھ سکے۔ لہٰذا مرکزی جذبہ مکمل ترین اور مؤثّر ترین فنّی شکل بھی اختیار نہیں کر سکا، اور یہ مجسّمہ اوّل درجے کی تخلیق نہیں بنا۔ یہ مجسّمہ پکاسو کی تصویر کا ہم پایہ نہیں۔ بلکہ ایک پُرانے اسپینی مصوّر میوریلو کی تصویروں کی صف میں آتا ہے۔ میوریلو کا محبوب موضوع فقیر اور غریب بچّے تھے۔ مگر اُسے بچوں کو معصوم اور بھولا بھالا بنانے کی فکر زیادہ رہتی تھی۔ اس کھوٹ کی وجہ سے اس کی تصویر میں پکاسو والی اخلاقی گہرائی پیدا ہی نہیں ہو سکی۔ پکاسو کی تصویر میں بچّے کی شکل دیکھئے ——— بچّہ معصوم بھی ہے، اس کی آنکھوں میں زندگی ہے۔ مگر پھر بھی کچھ کھویا کھویا سا ہے جیسے سوچ رہا ہو یہ افلاس اور بیماری کیا چیزیں ہیں، کیوں ہیں۔ انسان پر ان کا اثر کیوں پڑتا ہے؟ پکاسو کی تصویر ہمیں سماجی نظام سے لے کر پُورے کائناتی نظام تک کے بارے میں گہرے اخلاقی بلکہ مابعد الطبیعاتی سوال پوچھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اسی لئے پکاسو بہت بڑا فنکار ہے۔

عُریانی

ایک بادشاہ اپنے بچّوں کو تصویر خانہ دکھانے لے گیا۔ وہاں آدم اور حوّا کی ایک تصویر ٹنگی ہوئی تھی۔ بادشاہ نے پوچھا "بتاؤ ان میں آدم کون ہے، حوّا کون؟"

بچّوں نے جواب دیا: "یہ کپڑے تو پہنے ہی نہیں ہیں پہچانیں کیسے؟"

نئی کتابیں

"آنندی"، مصنفہ غلام عباس

"سیاہ حاشئے"، مصنفہ سعادت حسن منٹو

آنندی (تنقید)

محمد حسن عسکری

غلام عباس نے اتنے ہی اچھے افسانے لکھے ہیں جتنے اردو کے کسی اور افسانہ نگار نے۔ اگر اُن کے اچھے افسانوں کا مقابلہ اردو کے دوسرے اچھے افسانوں سے کیا جائے تو غلام عباس کے افسانے کسی طرح بھی ہیٹے نہیں رہیں گے۔ مگر پھر بھی انہیں وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے۔ عام طور پر افسانے کے متعلق جو تنقیدی مضامین لکھے جاتے ہیں اُن میں عباس کا ذکر بھولے بھٹکے ہی ہوتا ہے۔ مضمون نگار ذرا با خبر یا ستھرے ذوق کا ہوا تو اُس نے اُن کے متعلق کچھ لکھ دیا، ورنہ غائب۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی درست ہے کہ انفرادی طور سے اُن کے دو تین افسانے مقبول بھی ہوئے اور مشہور بھی ہوئے۔ بلکہ "آنندی" کا شمار تو اُردو کے مشہور ترین افسانوں میں ہے۔ اگر آپ ادب سے سنجیدہ دلچسپی رکھنے والے کسی آدمی سے پوچھیں کہ تمہیں کون کون سے افسانے اب تک پسند آئے ہیں تو وہ "آنندی" کا نام ضرور لے گا۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ غلام عباس مجموعی طور سے تو مقبول نہیں ہیں، مگر اُن کے بعض افسانے بہت مقبول ہیں۔ اگر ہم اس تضاد کی وجہ معلوم کر لیں تو ہم غلام عباس کے فن کی خصوصیات کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔

اُردو میں جو افسانہ نگار بحیثیت مجموعی مقبول ہوئے ہیں، اُنہیں کسی نہ کسی چیز کا "سودا" ضرور ہے ——— یہ لفظ میں کسی بُرے معنی میں استعمال نہیں کر رہا ہوں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اُنہیں ایک خاص قسم کا موضوع پسند ہے، انہوں نے عکاسی کے لئے ایک خاص علاقہ یا ایک خاص طبقہ چھانٹ لیا ہے، کوئی منفرد یا چُبھتا ہوا اسلوبِ بیان ایجاد کیا ہے، یا اُن کے ایک افسانے کا مجموعی تاثر یا فضا دوسرے افسانے کی فضا سے مماثل ہوتی ہے۔ غرض کوئی نہ کوئی بات ہوتی ہے جس سے آدمی پہلی نظر میں پہچان سکتا ہے کہ افسانہ کس کا ہے۔ کرشن چندر، منٹو، عصمت، بیدی، ممتاز مفتی، اشک سب کے یہاں ایسی امتیازی صفات موجود ہیں۔ اس کے برخلاف غلام عباس کو کسی چیز کا سودا نہیں ہے۔ نہ تو کسی خاص موضوع کا، نہ کسی خاص اسلوب کا، نہ کسی خاص جذباتی فضا کا۔ اسی چیز سے اُنہیں نقصان بھی پہنچا ہے اور فائدہ بھی۔ یہی اُن کی کمزوری ہے، اور یہی اُن کی قوت۔

بات یہ ہے کہ جب دوسرے لوگوں نے لکھنا شروع کیا تو

جو سیاسی، معاشی، سماجی اور نفسیاتی پیچیدگیاں پڑے ہی پردے میں نشو و نما پا رہی تھیں اب واضح ہو چکی تھیں۔ اب ہر حساس نوجوان کے لئے بغاوت یا کم سے کم بیزاری لازمی ہو گئی تھی۔ اُس کی نفرت اور اُس کی محبت کے مرکز متعین تھے۔ اب وہ اپنا کام صرف لکھنا نہیں سمجھتا تھا، بلکہ چند چیزوں کے خلاف اور دوسری چند چیزوں کے حق میں لکھنا خیال کرتا تھا۔ ہر لکھنے والے نے اس وسیع دائرے کے اندر اپنی نفرت اور محبت کے لئے چند چیزیں چن لی تھیں، بہت حد تک اسی انتخاب نے اُسے ایک خاص ذریعۂ اظہار بھی دے دیا تھا، اور اس تعلق نے اُس کے افسانوں میں ایک ہم آہنگی، وحدت اور انفرادیت پیدا کر دی تھی۔ ۳۶ء کے قریب والے دور میں ایسا ہونا ناگزیر تھا۔

مگر غلام عباس نے اس سے آٹھ دس سال پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ اس وقت متوسط طبقے کا نوجوان اپنے ماحول سے بڑی حد تک مطمئن تھا، خصوصاً مسلمان نوجوان۔ چنانچہ اُس زمانے کا ادب مسائل سے عموماً خالی ہوتا تھا۔ پریم چند کو چھوڑ کر اگر کوئی چھوٹا موٹا مسئلہ کہیں نظر آتا ہے تو عظیم بیگ چغتائی کے یہاں۔ ورنہ افسانہ نگار کی دلچسپیوں کو تو اس دنیا سے ماورا سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ غلام عباس نے بھی ابتدا "الحمرا" کے افسانوں اور اسی قبیل کی دوسری چیزوں سے کی۔ تو اگر اُن کے یہاں ایسی نمایاں اندرونی وحدت نہیں ملتی جو خود ہماری توجہ کو جذب کر لے یا ہم پر چھا جائے تو اس کی ذمہ داری اُن کی نشو و نما کے زمانے پہ ہے۔ تعریف کی بات تو یہ ہے کہ اُن کا ذہنی ارتقا (اُن کے اکثر پیشروؤں اور ہم عصروں کی طرح) وہیں کا وہیں نہیں رک گیا، بلکہ وہ بڑھ کر اگلی نسل والوں سے آملے۔ اُن کے اندر پرانی اقدار سے ہٹ کر چلنے کے وہ سب انداز ہیں جو دوسرے "نئے" افسانہ نگاروں میں ملتے ہیں، البتہ وہ بیتابی، وہ بے صبری وہ جھنجھلاہٹ وہ شدت نہیں ہے جو نوعمر باغیوں میں ہوتی ہے، نہ وہ بے لاگ سادگی اور بھولا پن ہے جو ایک دفعہ کو تو مخالف پر بھی غالب آجاتا ہے۔ دوسرے لکھنے والوں کا افسانہ تو ایک دھواں دھار حملہ ہوتا ہے جس کے ریلے میں مخالف مورچہ ڈھیتا چلا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف غلام عباس کے انداز میں مصالحت کا رنگ ہوتا ہے جیسے انہیں اپنے اوپر پورا اعتماد نہ ہو یا مخالف کی نیک نیتی پر بھروسہ ہو کہ وہ تھوڑی سی رد و کد کے بعد مان ہی جائے گا۔

ایک خاص زمانے میں نشو و نما پانے سے غلام عباس پر یہ اثرات مرتب ہوئے ہیں، چاہے انہیں کھونا سمجھئے چاہے پانا۔ البتہ ایک چیز ایسی ہے جسے کھرے منافع کے سوا اور کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔ ۳۶ء میں تو لوگ اپنی بات کہنے کے لئے ایسے تڑپ رہے تھے کہ اُن میں اتنا صبر تھا ہی نہیں جو پہلے بات کہنے کا طریقہ سیکھیں۔ اب تو چند باتیں ایسی تھیں جو لکھنے والوں کو اپنا ذریعۂ اظہار بنا کر دنیا کے سامنے آنا چاہتی تھیں، اور اُن کے سامنے ادیب اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کرتا تھا۔ مگر ۲۹ء کے قریب کوئی چیز ظاہر ہونے کے لئے ایسی بیقرار نہیں تھی۔ کوئی آدمی اس وجہ سے ادیب بنتا تھا کہ وہ ادیب بننا چاہتا تھا ادیب بننے کے لئے آدمی خاص قسم کے اورائی موضوع استعمال

میں لاتا تھا، اور خاص قسم کے "ادبی" الفاظ، فقرے، ترکیبیں۔ جو لوگ ذرا سمجھ دار تھے وہ پامال موضوعات سے بچنے کے لئے ذرا سی کاوش اور بیان کے ذریعوں اور اسالیب کا استعمال سیکھنے کے لئے تھوڑی سی محنت بھی گوارا کر لیتے تھے۔ اس رسم کے ماتحت غلام عباس نے بھی اپنی زبان اور بیان کو سنوارنے کی شعوری کوشش کی، اور کسب سے یہ چیزیں حاصل کیں۔ چنانچہ ان کی زبان نئے افسانہ نگاروں کو دیکھتے ہوئے غیر معمولی طور پر صاف ستھری، سادہ اور رواں ہے، آلائشوں اور الجھیڑوں سے پاک، جن مطالب کو وہ بیان کرنا چاہتے ہیں ان کے اظہار پر قادر، اپنی صلاحیتوں سے واقف، اپنی حدوں کے اندر بالکل مطمئن اور ان سے متجاوز ہونے کے خیال سے گریزاں۔ یہ خوبیاں مجموعی اعتبار سے نئے افسانہ نگاروں میں کم یاب ہیں۔ عصمت چغتائی کی نثر کا تو خیر کہنا ہی کیا، وہ تو جتنا کہنا چاہتی ہیں اُس سے کہیں زیادہ کہہ جاتی ہیں۔ مگر غلام عباس کا یہ وصف ہے کہ وہ جو کہنا چاہتے ہیں اسے کہہ ضرور دیتے ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ کہیں کور کسر رہ جائے اور پڑھنے والا تشنگی محسوس کرے۔ وہ اپنی بساط سے بڑھ کر بات کہنے کی کوشش بھی نہیں کرتے جسے اُن کی زبان یا اسلوب سنبھال نہ سکے۔ اگر انہیں کسی پیچیدگی یا باریکی کا بیان منظور ہوتا ہے تو وہ پہلے ٹھیر کے اسے سمجھ لیتے ہیں، اور پھر جس حد تک وہ اُن کی گرفت میں آتی ہے اُسی حد تک کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ اُن کے انداز میں بڑا توازن، اعتدال اور ٹھہراؤ پیدا ہو گیا ہے جو بے حسی یا جمود ہرگز نہیں ہے۔

غلام عباس کی قوتِ بیان کا بہترین مظہر اُن کا افسانہ "آنندی" ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ زبان و بیان ہی نے اسے افسانہ بنایا ہے، ورنہ ایک چٹکلہ تھا۔ مگر مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اظہار کے معاملے میں اُن کی احتیاط اب حد سے بڑھنے لگی ہے۔ سنبھال سنبھال کے قدم اُٹھانا بڑی ضروری چیز ہے بلکہ نئے ادب کے ماحول میں تو قابلِ ستائش ہے۔ مگر اتنا سنبھلنا بھی اچھا نہیں کہ قدم ہی رُکنے لگے۔ اس کشمکش میں پڑھنے والے کا ذہن جھٹکے کھانے شروع کر دیتا ہے، اسی وجہ سے آدمی افسانے کی فضا میں جذب ہوتے ہوتے پھر الگ ہو جاتا ہے۔ یہ چیز افسانے کی اثر انگیزی میں ذرا سی مانع ہوتی ہے۔

میں نے کہا تھا کہ غلام عباس کو کسی چیز کا سودا نہیں ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اُنہوں نے یہ افسانے پختہ عمر کو پہنچ کے لکھے ہیں۔ جب ہیجان اور ہنگامہ آرائی کا زمانہ ختم ہو چکا تھا، اور زندگی میں اُن کی ایک جگہ متعین ہو چکی تھی۔ اس لئے ان کے افسانوں میں بڑی متانت اور ضبط آ گیا ہے —— صرف اندازِ بیان ہی میں نہیں بلکہ مشاہدے میں، تفصیلات کے انتخاب میں، افسانے کی تراش خراش میں۔ اگر ہم مجموعی حیثیت سے اُن کے افسانوں کی فضا کا تعین کرنا چاہیں تو اسے ایک معنی خیز دھیمے پن کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے ہیں؟ مگر اس دھیمے پن کے پیچھے وہ تمام چیزیں چھپی ہوئی ہیں جو دوسرے نئے افسانہ نگاروں کے یہاں دھڑ دھڑ جل اٹھتی ہیں۔ جو باتیں اوروں کے یہاں بلاخیز بن کے آتیں وہ یہاں بڑی نرمی اور ملائمت کے ساتھ آتی ہیں: "آنندی"، "سمجھوتہ"، "حمام میں"۔ ان سب افسانوں کی یہی کیفیت ہے۔ غرضیکہ اعتدال پسندی اور توازن غلام عباس کے افسانوں کے بیان اور خیال دونوں پر حاوی ہے۔ اور یہی چیز اُن کے

رنگ کو سب سے الگ کرتی ہے۔

غلام عباس کے متعلق مجموعی طور سے کوئی بات کہنا چاہیں تو سب سے پہلے نظر اُن کی فنی خصوصیات کی طرف جاتی ہے۔ غالباً نئے افسانہ نگاروں میں یہ امتیاز اُنہیں کو حاصل ہے۔ موضوع، خیال یا جذبے کی وحدت اُن کے یہاں جلدی سے نہیں ملتی۔ مگر پھر بھی اُن کے افسانوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کریں تو ایک نتیجہ ضرور مرتب ہوتا ہے۔ غلام عباس کی دلچسپی اور تحقیق و تفتیش کا مرکز یہ احساس ہے کہ انسان کے دماغ میں دھوکا کھانے کی بڑی صلاحیت ہے، بلکہ فریب خوردگی کے بغیر اس کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے اور وہ ہر قیمت پر کسی نہ کسی طرح کا ذہنی فریب برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کے مجموعے میں دس افسانے ہیں جن میں سے پانچ کا موضوع وضاحتاً یہی ہے، اور یہی پانچ افسانے غلام عباس کے بہترین افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں کردار یا تو کسی نئے فریب میں مبتلا ہوتے ہیں یا کسی فریب کا پردہ چاک ہوتا ہے۔ "جواری" کا ہیرو اپنے ذہنی فریب کے نشے میں ایسا مست ہے کہ وہ ذلیل ہونے کے بعد بھی نہیں چونکتا، بلکہ اپنے آپ کو مخمور رکھنے اور دوسروں کو بھی اسی نشے کے دو ایک گھونٹ پلانے کی جان توڑ کوشش کرتا رہتا ہے۔ "کتبہ" میں باپ کے خوابوں کی عمارت توڑ دی جاتی ہے، مگر بیٹا باپ کی قبر پر کتبہ نصب کرا کے اپنے لئے اہمیت کا ایک نیا فریب ایجاد کرتا ہے۔ "حمام میں" کے کرداروں کے سارے ذہنی فریب خاک میں مل جاتے ہیں اور وہ صاف صاف اس کا اعلان کر دینا چاہتے ہیں، مگر پھر بھی ان فریبوں کے بغیر اُنہیں اپنی زندگی ہی ناممکن نظر آنے لگتی ہے، چنانچہ وہ اس شکست و ریخت کے احساس ہی کو اپنے شعور سے مٹانے کی فکر شروع کر دیتے ہیں۔ اُنہیں زندگی کی چند تلخ حقیقتوں کو راستہ دینا پڑتا ہے، اور وہ اپنے مطالبات میں ترمیم گوارا کر لیتے ہیں تاکہ زندہ رہ سکیں۔ "سمجھوتہ" کے ہیرو نے اخلاقیات کی دیوار کے پیچھے جھانک کے دیکھ لیا ہے۔ مگر وہ ذرا عملی قسم کا آدمی ہے۔ دل شکستہ نہیں ہوتا، اپنے نئے علم سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی غلبیت پسندی بھی ایک فریب نہیں ہے؟ وہ سمجھتا ہے کہ میں نے اخلاقی اقدار سے سمجھوتہ کیا ہے، مگر یہ سمجھوتہ دراصل اس نے اپنے آپ سے کیا ہے۔ اور ایک نئی قید کو آزادی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ "آنندی" میں ایک فرد کیا، ایک پوری جماعت نے اپنے آپ کو جان بوجھ کر دھوکے میں مبتلا کیا ہے۔ شہر آنندی کی تعمیر اور اس کی آبادی اور رونق میں درجہ بدرجہ اضافہ انسانی حماقت کے قصر کی تعمیر ہے۔ آنندی میں جو نئی اینٹ دوسری اینٹ پر رکھی جاتی ہے وہ اس قصر کو بلند تر اور مستحکم تر بناتی ہے۔ آنندی کیا بن رہا ہے ایک نیا فریب بن رہا ہے اسی وجہ سے شہر کی تعمیر ایک خاص طنزیہ معنویت اختیار کر لیتی ہے اور اس کے طول طویل بیان ہی میں ساری افسانویت ہے۔ یوں دیکھنے میں تو شہر بسنے کی کہانی بڑے مزے لے لے کر بیان کی گئی ہے، مگر دراصل یہ چٹخارہ ہی ایک دبا دبا زہر خند ہے، جیسے انسانی حماقت کے نئے سے نئے ثبوت مہیا کرنے میں مصنف کو لطف آ رہا ہو۔

یہ ہے غلام عباس کے افسانوں کا مرکزی اور بنیادی جذبہ —— انسان کی فریب خوردگی اور حماقت۔ یہ احساس بڑے

اندوہ والم یا شدید کلبیت کا موجب بن سکتا ہے۔ مگر غلام عباس کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ یہاں بھی اُن کے مزاج کی اعتدال پسندی آڑے آئی۔ وہ اس فریب خوردگی اور حماقت پر نہ تو رنج کا اظہار کرتے ہیں نہ غم و غصّے کا، نہ ابلیسانہ طمانیت کا۔ انہیں انسان کی اس بنیادی کیفیت پر کچھ تاسف بھی ہوتا ہے، کچھ ہنسی بھی آتی ہے، کچھ حیرت بھی ہوتی ہے۔ مگر فی الجملہ وہ کشمکش و پیچ میں پڑ جاتے ہیں کہ آخری فیصلہ کیا کریں۔ چنانچہ وہ کوئی آخری فیصلہ نہیں کرتے۔ بلکہ ایک طرح ہم کہہ سکتے ہیں اُن کا آخری فیصلہ یہ ہے کہ جب انسانی زندگی مسلسل فریب ہے ہی تو پھر فریبوں کو قبول کرنے کے سوا اور کیا چارۂ کار ہے؟ "حمام میں" سے تو صاف نتیجہ یہی مرتب ہوتا ہے کہ انسان کو زندہ رہنا ہے تو فریبوں سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ چنانچہ غلام عباس کے افسانوں کا آخری تاثر تسلیم و رضا کا ہے۔ اُن کے افسانوں کی یہ کیفیت اور بھی نمایاں ہو جائے گی اگر ہم ان کا مقابلہ منٹو کے افسانے "نیا قانون" سے کریں۔ منٹو نے بھی انسان کی ذہنی فریب خوردگی کا نقشہ دکھایا ہے، مگر منٹو کا افسانہ پڑھ کر یا تو انسان کی ذہنی بے چارگی پر جھنجھلاہٹ ہوتی ہے یا شکست کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ غلام عباس کا افسانہ پڑھ کر آدمی زندگی کی شرائط سے سمجھوتہ کرنے کو راضی ہو جاتا ہے۔

بہر حال اس سے پتہ چلتا ہے کہ مجموعی حیثیت سے غلام عباس کے افسانے ایک مرکزی وحدت سے ایسے خالی نہیں ہیں جیسے پڑھنے والوں کو معلوم ہوتے ہیں۔ البتّہ یہ وحدت ذرا دیر میں ہاتھ آتی ہے۔ جہاں غلام عباس کا ایک مُنفرد لب و لہجہ، ایک منفرد اندازِ بیان اور ایک منفردِ وضعی احساس ہے، وہاں اُن کے احساسات کی بھی ایک علیحدہ سمت ہے۔ صرف فنّی اعتبار سے نہیں، بلکہ مجموعی حیثیت سے بھی وہ ایک انفرادیت اور ایک مستقل شخصیت رکھتے ہیں جس کی نئے افسانوی ادب میں ایک ممتاز جگہ ہے۔

اب چونکہ اُن کی کتاب شائع ہو چکی ہے، اس لئے اُن پر مجموعی حیثیت سے غور و فکر کیا جا سکتا ہے، اور نئے ادب میں اُن کی جگہ پورے انصاف کے ساتھ مقرر کی جا سکتی ہے۔ اور اُن کی جگہ یقیناً کسی اور افسانہ نگار سے گھٹ کے نہیں ہوگی۔

سیاہ حاشیے :- آفتاب احمد

منٹو اردو کا سب سے بدنام افسانہ نگار ہے۔ محتسب کی نظر ہی میں نہیں اپنے ہم مشربوں کے حلقہ میں بھی، اس لئے کہ وہ اپنے ہم مشربوں کے رستوں سے بھی ہٹ کر چلا ہے۔ اس نے یہ بدنامی مول لی ہے تو اپنی فطری افتاد سے مجبور ہو کر۔ اس کی روشنیٔ طبع ہی اس کے لئے بلا ہو گئی ہے۔ اس نے زندگی کے ان عناصر، انسانی فطرت کے ان تاروں کو چُنا ہے جن پر دوسروں کی نظر نہیں پڑتی۔ اُسے عموماً بڑے چونکا دینے والے موضوع پسند ہوتے ہیں ایسے کہ جن کے ذکر ہی سے آپ کے دماغ میں ایک ہیجان اور سنسنی پیدا ہو جائے۔ جس موضوع میں یہ

بات نہ ہو وہ کم سے کم منٹو کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا وہ اس کے ادب کا موضوع نہیں بن سکتا۔ یہ نہیں کہ اس نے کوئی کمزور فطری مجیر العقول اور طلسماتی واقعات کی دنیا بسائی ہے۔ یوں ہوتا تو منٹو بدنام کیوں ہوتا؟ —— بات یہ ہے کہ اس نے واقعات اور کردار تو اسی دنیا، سب کی جانی بوجھی دنیا سے لئے ہیں۔ مگر اس کا کمال یہ ہے کہ وہ ظواہر کے پردے چاک کر کے آپ کو ان کی تہ میں چھپے ہوئے میلانات کی ایک جھلک دکھانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے کرداروں کے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جو صرف چونکا ہی نہیں دیتے بلکہ اپنی بنیادی صداقت، اور گہری معنویت کی وجہ سے حقیقت کا ایک نیا، اور زندہ احساس و ادراک پیش کرتے ہیں۔ منٹو کے فنی شعور کا سب سے نمایاں وصف یہی ہے کہ وہ "حقیقت کی تلاش" میں کوشاں رہتا ہے اور پھر اس میں حقیقت کو اس عریاں حالت میں دیکھنے کی تاب بھی موجود ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ اس لئے منٹو کے کامیاب افسانے پڑھ کر مجھے ہمیشہ یوں محسوس ہوا ہے کہ یہ افسانے منٹو کے علاوہ اردو کے موجودہ افسانہ نگاروں میں کسی اور سے ممکن ہی نہیں ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اردو کے اکثر افسانہ نگار حقیقت کو یوں بے نقاب دیکھنے کی نہ جرأت کرتے ہیں نہ تاب رکھتے ہیں۔ وہ زندگی اور انسانی نفسیات کی ہمہ گیر اور معنی خیز پیچیدگیوں کا سامنا کرنے کی بجائے کسی نہ کسی اخلاقی فارمولے یا نقطۂ نظر کی مدد سے دستہ ٹٹولنے کے عادی ہیں۔ جب تک وہ اپنے کرداروں کو اس طرح نہیں دکھا لیتے جیسا ان کے خیال میں ان کرداروں کو نظر آنا چاہیئے۔ انہیں چین نہیں پڑتا۔ نئے ادیبوں کے لئے اس کے سوا اور چارہ بھی کیا ہے؟ آخر "مقصدی ادب" تو اسی طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ مگر منٹو کو "مقصدی ادب" پیدا کرنے کا جنون نہیں ہے۔ اور اسی لئے وہ ایسا ادب پیدا کر سکا ہے جو ایک گہری معنویت کا حامل ہے اور یہ "مقصد" سے بلند چیز ہے۔ منٹو نے اپنے کرداروں کو سمجھنے اور پیش کرنے میں کسی معین اخلاقی نظریے کی پیروی کا بکھیڑا پالا ہی نہیں۔ اس نے اپنے آپ کو نیک و بد اور گناہ و ثواب کے عام پسند اور سکہ بند تصورات سے بچائے رکھا ہے۔ اس نے حقیقت کو بغیر کوئی اخلاقی نقاب اڑھائے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بڑا صبر آزما مقام ہے۔ اور اگر منٹو اس سے آسان گزر گیا ہے تو محض اس لئے کہ اس نے اپنی نظر، اپنے احساس، غرض اپنی شعوری قوتوں کی صحت پر اعتماد کیا ہے۔ اور کسی خارجی رہنما کا سہارا نہیں ڈھونڈا۔ تبھی تو اس کی باتیں آپ کے دماغ میں ہیجان بھی پیدا کئے دیتی ہیں اور ساتھ ساتھ دل میں سمائی بھی جاتی ہیں۔

میں نے اب تک منٹو کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ زیادہ تر اس کے ان افسانوں پر عاید ہوتا ہے جن کی بدولت وہ زمانہ بھر میں رسوا ہے۔ مگر دراصل اس صحبت میں مجھے اس کی ایک نئی کتاب پر تبصرہ کرنا ہے جو حال ہی میں "مکتبہ جدید" کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ کتاب کا نام ہے "سیاہ حاشیے"۔ اس کتاب میں منٹو نے فسادات کے موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ وہ اس طرح کہ اس نے فسادات سے متعلق کچھ لطیفے اور اصلی واقعات جمع کر دیئے ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ فسادات ادب کا موضوع بن بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ ہمارے ادیبوں نے

فسادات کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ اور اس معصوم وسادہ یقین سے لکھا ہے کہ اور نہیں تو ادب ہی کے ذریعہ وہ دنیا میں انسانیت تہذیب، محبت، اخوت، مساوات اور عدل وانصاف کو عام کر کے دم لیں گے۔ خدا ان کی کوششیں بار آور کرے، دنیا تو خیر بدلے نہ بدلے ہاں انہوں نے اپنی عاقبت ضرور سنوار لی ہے۔ مگر منٹو کا انداز یہاں بھی سب سے الگ ہے۔ یہاں بھی وہ عام روش سے ہٹ کر چلا ہے، یہاں بھی اس کی نظر ایسی چیزوں پر پڑی ہے جو دوسروں سے پوشیدہ رہیں۔ منٹو فسادات کی انسانیت سوز فضا میں بھی نہ تو نام نہاد بلند بانگ انسانی اور اخلاقی اصولوں کے نام پر بولتا ہے اور نہ ان کو عام کر دینے کا دعویٰ دار ہے۔ چنانچہ اس نے بندھے ٹکے انداز میں فسادات پر افسانے نہیں لکھے، بلکہ اس سے کہیں زیادہ بامعنی کام کیا ہے، اسے ظالم اور مظلوم سے اتنی دلچسپی نہیں جتنی انسان سے، اسی لئے اس نے فسادات کے بارے میں "قصے گھڑنے" کی بجائے یہ مناسب سمجھا کہ وہ چند ایسے اصلی واقعات کو من وعن پیش کر دے جن میں مختلف قسم کے انسان بطور انسان کے نظر آتے ہیں۔ یہاں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یہ مسلمان ہیں یا ہندو، ظالم ہیں یا مظلوم، یہاں پھر منٹو نے اوروں کی طرح نیک و بد اور گناہ و ثواب کا حکم نہیں لگایا۔ میں نے شروع میں کہا تھا کہ منٹو غیر معمولی اور چونکا دینے والے واقعات چننے کا عادی ہے۔ مگر یہاں اس نے یہ اثر پیدا کرنے کے لئے بڑی نازک ٹکنیک استعمال کی ہے۔ یہاں اس نے غیر معمولی حالات میں معمولی باتوں کو نمایاں کر کے زندگی میں ان کی گہری معنویت کا احساس دلایا ہے۔ فسادات کے بارے میں منٹو کو انسان کی بربریت اس کی مظلومی اور بے بسی نے متاثر نہیں کیا، کیونکہ یہ سب اپنی شدت کے باوجود انسانی روح کی ہنگامی کیفیات ہیں، اسے اگر متاثر کیا ہے تو ان بظاہر غیر اہم اور معمولی باتوں نے جو مختلف انسانوں کے شعور میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ اُن کے خون میں رچی ہوئی ہیں۔ اور ہنگامی کیفیات کی شدت کے باوجود بار بار اُبھر آتی ہیں۔ کبھی وہ اس کی بلندی کی آئینہ دار ہوتی ہیں اور کبھی اس کی پستی کی۔ مگر بہر صورت اُس کی انسانیت کی ——— منٹو کی یہ تصنیف اپنی ان خصوصیات کی بنا پر اردو ادب میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔

رعایت

"میری آنکھوں کے سامنے میری جوان بیٹی کو نہ مارو"
"چلو اسی کی مان لو ـــــ کپڑے اتار کر ہانک دو ایک طرف"
(سیاہ حاشیے)

آرام کی ضرورت

"مرا نہیں ـــــ دیکھو ابھی جان باقی ہے۔"
"رہنے دو یار ـــــ میں تھک گیا ہوں۔"
(سیاہ حاشیے)

(بقیہ صفحہ ۵۲)

سمائی کہ اپنے آپ کو کسی چیز سے اٹکا ہی نہ رکھا۔ نہ کھُل کے محبت کی نہ نفرت۔ مختلف مسائل کے متعلق کوئی آخری فیصلہ کرنے کے ڈر سے اُن پر بحث تک نہ کی۔ قوم کے اہم سے اہم مسائل کے متعلق یہی رویّہ رہا کہ جیسے چلتا ہے چلنے دو۔ ان معاملات میں ہمارے ادیبوں نے کبھی اپنی ذمہ داری محسوس ہی نہیں کی۔

مگر زیادہ پُرلطف بات یہ ہے کہ قوم سے بے توجہی کا گلہ کرتے رہے۔ پاکستان بننے سے پہلے قوم کو یہ کبھی نہیں بتایا کہ پاکستان اچھی چیز ہے یا بُری۔ مگر پاکستان بننے کے بعد یہ شکایت ضرور کی کہ یہ چیز تو ہمارے خواب و خیال میں بھی نہیں آئی تھی، یہ ہُوا کیا۔

پاکستان بننے پر ہمارے ادیبوں کا چونکنا بڑی بے مثال بات ہے قوم کے مفادات اور عزائم سے ادیب ایسے غافل اور بے نیاز رہے کہ انہیں عوام کی صلاحیتوں سے قطعاً بے خبری رہی۔ چنانچہ پاکستان کا وجود میں آنا واقعی اُن کے لئے حیرت ناک ہونا چاہیئے۔

مگر اس دھچکے سے ایک فائدہ ضرور ہُوا۔ ہمارے ادیبوں کو یہ پتہ چل گیا کہ ہم ایک خاص جماعت کے فرد ہیں، اور چاہے ہم قوم کے عزائم سے دلچسپی لیں یا نہ لیں۔ ہمارا مستقبل قوم کے مستقبل سے الگ نہیں ہو سکتا۔ اس احساس کے ساتھ ساتھ مسلمان ادیبوں کو اپنی ذمہ داریوں کا بھی خیال آیا ہے۔ قوم اور ادیبوں میں مفاہمت کا سلسلہ شروع تو ہو گیا ہے۔ مگر ابھی مشکل یہ ہے کہ قوم ادیبوں کو نہیں پہچانتی، اُن کے تخلیقی کام سے دلچسپی نہیں رکھتی۔ مگر دوسری طرف حکومت کے عمّال نے ادب اور ادیبوں کی طرف توجہ شروع کر دی ہے۔ پاکستان بنے ہوئے سال بھر ہو گیا، مگر اُنہیں ابھی تک پتہ ہی نہیں چلا تھا کہ ادب یا ادیبوں کا بھی وجود ہے۔ مگر جب پتہ چلا تو اُنہوں نے ادب کے وجود ہی کو خطرناک سمجھتے ہوئے تین بڑے ادبی رسالوں کو بند کر دیا۔ ادیبوں کی آزادی کے بہترین محافظ عوام ہو سکتے تھے، لیکن چونکہ ادیبوں نے عوام کو یہ محسوس کرنے کا موقع ہی نہیں دیا کہ یہ بھی ہمیں میں سے ہیں۔ اس لیئے شاید حکومت کے اس ادب کُش اقدام پر بھی عام لوگوں کو نقصان کا کوئی احساس ہی نہیں ہو گا۔

چنانچہ اور باتیں تو الگ رہیں، پاکستان میں محض ادب کی بقا کے لئے یہ لازمی ہو گیا ہے کہ ادیب جلد از جلد عوام کا اعتماد حاصل کریں، اور اُسی طرح حاصل کریں جس طرح حافظ، سعدی، میر اور اقبال کو حاصل تھا۔ یعنی قوم کی خوشامد کر کے، قوم کی تعریف میں قصیدے لکھ کے نہیں، بلکہ محض اپنے آپ کو قوم کا ایک فرد سمجھ کے۔ اور اسی حیثیت سے دل کھول کر محبت اور نفرت کر کے ۔۔۔ ہماری تحریروں میں ایک دفعہ یہ بات جھلکنے لگے تو ہم قوم سے اپنے حقوق بھی مانگ سکیں گے، ان کی حمایت بھی حاصل کر سکیں گے۔ اور ہمارے ادب میں بھی وہ قوت اور توانائی آ جائے گی جو کسی قوم کے نمائندہ ادب میں ہونی چاہیئے۔

یہ مضمون تو تھا ساری بحث کا خلاصہ، اصل بحث تو بہت طول طویل ہے۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ ہر دو پیرا الگ الگ تفصیلی طور سے لکھا جائے۔

نئی کتابیں!

مکتبہ جدید لاہور آپ کی فرمائش پر ہر ایک کتاب مہیا کرتا ہے۔

افسانے

- ایک گرجا ایک خندق — کرشن چندر — ۲/۱۲
- سیاہ حاشیے — سعادت حسن منٹو — ۲/-
- آنندی — غلام عباس — ۲/۸
- قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے — محمد حسن عسکری — ۲/-
- یا خدا — قدرت اللہ شہاب — ۱/۸
- وغیرہ وغیرہ — شوکت تھانوی — ۲/-
- چغد — سعادت حسن منٹو — ۳/۴
- زعفران کے پھول — خواجہ احمد عباس — ۲/۱۲
- ہندوستان سے پاکستان تک — ۲/۸
- چاک گریباں — آغا بابر — ۳/-
- لذت سنگ — منٹو — ۲/۸
- آنکھ مچولی — شکیلہ اختر — ۲/۸
- نئے ادب کے معمار — منٹو، ستیارتھی — فی ۱/۵

ناول

- ایسی بلندی ایسی پستی — عزیز احمد — ۴/-
- عورت — رئیس احمد جعفری — ۴/۴
- مجاہد — ″ — ۵/-
- داستانِ مجاہد — نسیم حجازی — ۴/-
- محمد بن قاسم — ″ — ۵/-
- عشرت — عارف بٹالوی — ۲/۸
- موت کا جہنم — محمود ہاشمی — ۱/۴
- رقص ابلیس — ایم اسلم — ۴/-
- شہناز — منفلوطی — ۴/-
- ۱۵ اگست — رشید اختر ندوی — ۲/-
- زندگی — ۴/- ، نئے انسان — ۴/-
- آخری سلام — ۴/۸ ، کانچی ہاؤس — ۳/۴
- نسرین — ۴/- ، جہنم — ۵/-

متفرق

- شہناز نظم — اختر شیرانی — ۳/۸
- کامیابی — ڈاکٹر ماردن — ۳/-
- اخراج اسلام از ہند — ۴/- ، کشمیر — ۲/۸
- ۴۷ء کا بہترین ادب — ۶/- ، جہاد کشمیر — ۲/۸
- سٹینڈرڈ اردو ڈکشنری — ۱۲/-
- روح قرآن — ڈاکٹر غلام جیلانی — ۳/۸
- کارل مارکس اور اس کی تعلیمات — ۶/۸
- جہاد — مسلم — ۱/۸
- حیوٰۃ المسلمین — ۴/۸
- تذکرہ اولیائے کرام — ۲/۸
- جلال و جمال — احمد ندیم — ۴/-
- نئے ادب کے معمار — ساحر، مخدوم، مجاز — فی ۱/۵
- من و یزداں — نیاز فتحپوری — ۷/۸
- آزاد پاکستان — مسلم — ۴/-
- مطالعہ پاکستان — قریشی — ۲/-
- زندہ نبی کی زندہ تعلیم — محمد علی — ۴/-
- احادیث العمل — ″ — ۱۰/-

ایجنسی کی کتابیں

- نئے پیمانے — مرتبہ شبلی بی کام — ۳/-
- ڈائری — ″ خوشتر گرامی — ۳/-
- گناہ کے افسانے — ″ — ۳/-
- بڑے آدمیوں کے عشق — ″ — ۴/-
- جوانی کی راتیں — ″ — ۱/۸
- میرے سپنے — ۳/- ، ہنی مون — ۳/-
- دل کے پیام — آسی رامنگری — ۳/-
- حسن پرست — ۳/- ، پنچھی — ۲/-
- محبت کی راہیں — محمد امین شرقپوری — ۳/-
- پتنگے — ۲/- ، زنجیریں — ۲/-
- کام، پریم، گربھ شاستر — فی ۱/۸
- فلمی پریاں — مرتبہ مہدی علیخاں — ۳/-
- طریق اداکاری (ری پیک) — ۱/۴
- قفس زریں — ۴/- ، ثمرہ عمال — ۲/-
- وطن پرست — ۴/- ، ڈاکٹر فو مانچو کی واپسی — ۲/۸
- آندھی — ۲/۸ ، انوکھا سنسار — ۲/-
- صحت اور زندگی — ۳/۴

نظم

- شعلہ ساز — فراق — ۵/-
- نقش فریادی — فیض — ۲/-
- تلخیاں — ساحر لدھیانوی — ۲/۸
- نغمۂ شیریں — حفیظ جالندھری — ۵/-
- زہریلے آنسو — قاضی نذر الاسلام — ۲/۱۰
- پون جھکولے — قیوم نظر — ۱/۸
- اختر ستان — اختر شیرانی — ۳/-
- دیوان غالب — طاہر ایڈیشن — ۳/-

مکتبہ جدید • لاہور • کراچی پی بی ۲۲۵

غلام عباس

اُس کی بیوی

وہ دونوں تیسری منزل کے ایک کمرے میں تھے۔

یہ چھوٹا سا کمرہ اپنی ہلکی نیلی روشنی کے ساتھ باہر سے یوں دکھائی دیتا گویا ٹرین کا کوئی ٹھنڈا ڈبا ہے۔ جسے کہ ریلوے والے گرمی کے موسم میں "فردوس بریں" یا "خواب یاسمیں" وغیرہ شاعرانہ نام رکھ کر بعض خاص خاص گاڑیوں میں جوڑ دیتے ہیں۔

بارشوں کا زمانہ قریب قریب ختم ہو چکا تھا۔ مکانوں میں بسنے والی مخلوق نے پسینے کی بدبو اور گھٹن سے نجات پائی تھی۔ فضا میں خصوصاً رات کے وقت خنکی پیدا ہو گئی تھی۔ ہاں جب کوئی بڑا سا کالے رنگ کا پتنگا اپنی تیز بھنبھناہٹ کے ساتھ کسی برقی قمقمے کے گرد اندھا دھند چکر کاٹنے لگتا تو ظاہر ہو جاتا، کہ برکھا رُت ابھی پورے طور پر گئی نہیں۔

"نجمہ بھی ٹھیک ایسے ہی سیدھی مانگ نکالا کرتی" نوجوان نے کہا "مگر کبھی کبھی گدی تک مانگ لے جاتی ——— یہ طریقہ اس نے ایک بنگالن سے سیکھا تھا۔"

نسرین چپ رہی، نظریں قرینی سنگھار میز کے آئینے پر جمائے جس میں اسے اپنا دھندلا دھندلا نیلگوں عکس دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بالوں میں کنگھی کرتی رہی۔ جیسا کہ سونے سے پہلے بعض عورتوں کی عادت ہوتی ہے۔

نوجوان اس کے پاس ہی چاندنی پر کہنیوں کے بل اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ یوں لیٹنے سے اس کی سفید سلک کی قمیص اور خاکی زین کی پتلون میں جا بجا سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ اس نے چند لمحے انتظار کیا۔ اور پھر کہنا شروع کیا "کبھی کبھی نجمی اپنے دہنے کان کے پاس سے اپنے بھورے بالوں کی ایک لٹ نکال کر لام دل سا بنا لیا کرتی۔ جو اس کے سرخ و سفید بھرے بھرے گال پر بہت بھلا لگتا......"

نسرین کے چہرے پر خفیف سی، اضمحلال کی کیفیت پیدا ہوئی مگر زبان سے اب بھی اس نے کچھ نہ کہا۔ وہ سوچ رہی تھی یہ کیسا مرد ہے، جس کے پاس باتیں کرنے کے لئے بیوی کے علاوہ اور کوئی موضوع ہی نہیں۔ وہ برابر دو گھنٹے سے اسی عورت کا ذکر کئے جا رہی تھی، جو اب دنیا میں موجود نہ تھی۔ ان دو گھنٹوں میں وہ اس نوجوان کی متاہل زندگی کے تمام اہم واقعات اور اس کی مرحوم بیوی کی بہت سی عادتوں اور خصلتوں سے واقف ہو چکی تھی۔ یہ کہ اسے بچپن ہی سے اپنی بیوی سے عشق تھا۔ یہ کہ نجمہ کا باپ ان کی شادی کے خلاف تھا مگر چچا حق میں تھا۔ جب وہ منگنی تھی تو اس کے

بانیں کان میں کہا پڑا کرتا تھا۔ یہ کہ اسے حنا کا عطر بہت مرغوب تھا۔
...وہ کمرہ شیشے سے مور بہت اچھا بنایا کرتی تھی.....

شروع شروع میں اُسے اس ذکر سے کچھ دلچسپی ہوئی۔ جیسے کہ ابتدا میں ایک عورت کو دوسری عورت کی باتوں سے ہوا کرتی ہے۔ مگر جلد ہی وہ اس سے بیزار ہو گئی تھی۔ جب اس کی جمائیاں اور انگڑائیاں، اس موضوع سے اس کا پیچھا نہ چھڑا سکیں۔ تو آخر اس نے زچ ہو کر چپ سادھ لی تھی۔

دو منٹ خاموشی میں گزر گئے۔

وہ اب جوڑا کھول کے جوڑا باندھ چکی تھی۔ اور اُن ہیئر پنوں اور کلپوں کو جن سے وہ اپنے بالوں کی آرائش میں مدد لیا کرتی، فرش پر سے اٹھا اٹھا کر سنگھار میز کے خانے میں ڈال رہی تھی۔ اس اثنا میں نوجوان کی نظریں اس کی گوری گوری انگلیوں کی ذرا ذرا سی حرکات کا تعاقب کرتی رہی تھیں۔

کئی دن ہوئے اس نے اس عورت کو دیکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اسے نجمہ کی یاد بے طرح ستانے لگی تھی۔ اور وہ اس سے ملنے کی تدبیریں کرنے لگا تھا۔ اور آخر جب اس نے اس قدر روپیہ جمع کر لیا۔ کہ دو راتوں کے لئے اس عورت کو خرید سکے۔ تو اس نے سیدھا اس کے گھر کا رُخ کیا تھا۔

"میری بیوی ——"

"تو کیا بہت محبت تھی آپ کو بیگم صاحبہ سے۔" بالآخر نسرین نے [illegible] جب ایک آدمی یوں ہی چلا جائے، تو دوسرا کب تک چپ رہ سکتا ہے۔

"بے حد۔" بیساختہ نوجوان کے منہ سے نکلا۔ وہ اس کی لگاوٹ کی بات کو نہیں سمجھ سکا تھا۔

"مگر صاحب آپ کی باتیں عجیب ہیں۔" ایک انتقامی جذبہ اس میں بیدار ہو رہا تھا۔ "سمجھ میں نہیں آتا، وہ کیسی محبت تھی جو اس کے مرنے کے تین ہی مہینے بعد فوچکر ہو گئی۔ اور اب آپ....."

وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔ یہ بات دل دکھانے والی تو تھی ہی مگر ساتھ ہی اس کے پیشے کے بھی خلاف تھی۔

نوجوان چند لمحوں کے لئے گم سم رہا۔ پھر اس نے اپنی صاف اور روشن آنکھیں، جن میں مجرمانہ گھبراہٹ یا گناہگارانہ جھینپ کی کوئی علامت نہ تھی اٹھا کے نسرین کے چہرے کی طرف دیکھا پھر وہ آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا۔ کہ شاید لیٹے رہنے سے وہ اپنی مدافعت پورے طور پر نہ کر سکے۔ لمحہ بھر کے لئے اس کے ہونٹ لرزے۔ مگر زبان کچھ نہ کہہ سکی۔

کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ اس کے بعد نسرین انگڑائی لیتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور بغیر کچھ کہے کمرے سے باہر نکل گئی۔

کوئی پاؤ گھنٹے کے بعد وہ واپس آئی۔ زیور وغیرہ اس نے اتار دیئے تھے۔ اور شب خوابی کے لئے ایک سادہ سی اجلی دھوتی باندھ لی تھی، وہ اس قدر آہستہ سے داخل ہوئی۔ کہ نوجوان نے اس کے قدموں کی چاپ تک نہ سنی۔ وہ چاندنی پر پیٹ کے بل لیٹا تھا۔ اس کی عمر تئیس چوبیس برس سے کسی صورت کم نہ تھی۔ مگر اس وقت وہ برقی لیمپ کی

مدھم نیلی روشنی میں اپنی چھوٹی چھوٹی سیاہ مونچھوں کے ساتھ، گھنے ابرو، اور چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کالج کی کسی ابتدائی جماعت کا طالب علم معلوم ہوتا تھا۔ سامنے چاندنی پر مٹر کے دانے کے برابر ایک سیاہ پتنگا چت پڑا تھا۔ جو شاید برقی قمقمے سے ٹکرا کر نیچے آرہا تھا۔ پتنگا ہوا میں اپنی ننھی ننھی بال سی ٹانگیں چلا چلا کر، اور سر کو فرش پر رگڑ رگڑ کر سیدھا ہونے کی کوشش کرتا۔ مگر اسے جہاں ذرا کامیابی ہوتی، نوجوان دیا سلائی کے تنکے سے پھر اسے اوندھا کر دیتا۔

جب نسرین بالکل اس کے سر پر آکھڑی ہوئی تو وہ چونکا،

"اوہ آپ ہیں۔" اور اس نے جلدی سے پتنگے کو دیا سلائی سے پرے اچھال دیا۔

"بیگم صاحب کے مرنے کا رنج تو بہت ہوا ہوگا آپ کو؟" یہ سوال کر کے وہ خود حیران رہ گئی۔

نوجوان نے لمحہ بھر تامل کیا اور پھر سنجیدہ لہجے میں کہنا شروع کیا "نہیں شروع شروع میں کچھ ایسا غم نہیں ہوا تھا۔ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ایسا ہو گیا ہے۔ مگر میں زیادہ دن اس فریب میں نہ رہ سکا کیونکہ بیمار پڑ گیا۔ پورا ایک مہینہ چارپائی پر پڑا رہا۔ جب میری حالت بہت خراب ہو جاتی۔ تو امی جانی اور زہری، یہ میری چھوٹی بہن ہے میرے سرہانے آکر کھڑی ہو جاتیں، اور ایسی چپ چاپ سہمی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتیں۔ کہ میں جلدی سے آنکھیں بند کر لیتا۔ اور چاہتا کہ نہ مروں..... بس پھر میں رفتہ رفتہ تندرست ہوتا گیا۔"

اس کے لہجے نے نسرین کو متاثر کیا۔

دو تین لمحے پھر دونوں چپ رہے۔

"آپ نے کہا تھا" اچانک نسرین کے لہجے میں شوخی جھلک رہی تھی "میری شکل بیگم صاحب سے ملتی جلتی ہے۔ بھلا کیا کیا چیز ملتی ہے؟"

"سب سے زیادہ تمہاری آنکھیں ملتی ہیں" نوجوان کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ مگر لہجے سے ابھی افسردگی کا اثر دور نہیں ہوا تھا۔ "ویسی ہی سیاہ اور گہری، دوسرے نمبر پر ٹھوڑی ویسی ہی پتلی اور تیسرے نمبر پر....."

"چلیے ہٹیے بتائیے نہیں:"

"تمہارے بال، تمہاری گردن، انگلیاں....."

نوجوان کی فطری چونچال تیزی سے بحال ہو رہی تھی۔ اور نسرین اپنے کو روکے ہوئے تھی، کہ کہیں اپنا سوال دہرا نہ بیٹھے۔

آدھ گھنٹے کے بعد روشنی گل کر دی گئی تھی۔ اور وہ دونوں کھڑکی کے پاس پلنگ پر دراز ہو گئے تھے۔ نوجوان جو رات کو جلدی سو جانے کا عادی تھا زیادہ دیر نہ جاگا۔ مگر نسرین آنکھیں کھولے پڑی رہی۔ اور کھڑکی میں سے آسمان کو دیکھتی رہی۔

یہ قمری مہینے کی آخری تاریخوں کی ایک رات تھی۔ آسمان صاف مگر تاریک تاریک سا تھا۔ ستارے اس قدر تیزی سے چمک رہے تھے۔ کہ معلوم ہوتا تھا زمین کے قریب سرک آئے ہیں۔ نسرین ستاروں کو ہمیشہ بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتی تھی۔ سب سے پہلے جب اسے ستاروں کا احساس ہوا تھا اس کی عمر چار برس کی تھی۔ اس کی ماں مر چکی تھی۔ مگر باپ ابھی زندہ تھا۔ اس نے باپ کے ساتھ ریل گاڑی میں

ایک لمبا سفر کیا تھا۔ آدھی رات کو وہ دونوں ایک چھوٹے سے دیہاتی اسٹیشن پر اترے تھے۔ اسی اسٹیشن پر لال ٹین کی مدھم روشنی میں ایک موٹے تنگ دھڑنگ فقیر نے اسے ایسی لال لال ڈراؤنی آنکھوں سے گھورا تھا کہ اسکی چیخ نکل گئی تھی۔ اور وہ بے اختیار باپ کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی۔ کچھ دیر دونوں اسٹیشن ہی پر ٹھہرے رہے۔ مگر کوئی سواری نہ ملی۔ آخر باپ نے اسے گود میں لے لیا۔ گٹھڑی بغل میں ماری اور اندھیرے گھپ میں پیدل چلنا شروع کر دیا۔

یہ سفر بھی بہت لمبا تھا۔ مگر اس کی سہمی ہوئی نظروں نے جلد ہی ستاروں کو ڈھونڈ نکالا۔ ان کو دیکھ دیکھ کر اس کا ڈر کم ہونے لگا۔ یہاں تک کہ وہ باپ کے کندھے سے لگ کر سو گئی۔

صبح کو جب نسرین کی آنکھ کھلی تو سورج خاصا نکل آیا تھا۔ اٹھتے ہی سب سے پہلے اُسے جو احساس ہوا۔ یہ تھا کہ نوجوان اس کے بستر پر موجود نہیں۔ اُس نے سوچا۔ غسل خانے میں ہوگا۔ اور وہ پہلے پہلے بستر پر کروٹیں بدلنے لگی۔

جب پاؤ گھنٹہ گذر گیا۔ اور نوجوان کہیں نظر نہ آیا۔ تو اُسے الجھن ہونے لگی۔ شمن جھاڑ دینے کمرے میں آیا، تو اس سے پوچھا:۔

”وہ رات والے بابو کہاں ہیں؟“

”چلے گئے۔“

”چلے گئے؟“ اُس نے تعجب سے پوچھا۔

”جی ہاں، صبح ہی صبح۔ ہم سب سو رہے تھے۔ دروازہ بھی تو کھلا ہی چھوڑ گئے۔“

”ویسے تو سب خیریت ہے نا؟“ بیساختہ اس کے منہ سے نکل گیا۔

”جی سب خیریت ہے۔“ شمن اس کا مطلب فوراً سمجھ گیا تھا۔ ”میں نے اُٹھتے ہی سب دیکھ بھال لیا تھا۔“

اپنے شبہے کے گھٹیا پن پر اُسے شرم آگئی۔ مگر دوسرے ہی لمحہ اس خیال نے اس پر تسلط جما لیا۔ کہ وہ نوجوان کیوں چلا گیا۔ اُس نے سوچا رات اُسے میرا طعنہ بُرا لگا۔ وہ بڑا حساس تھا۔ اوپر اوپر سے ہنستا بولتا رہا۔ اور صبح ہوتے ہی چل دیا۔

منہ ہاتھ دھو کر نیچے پھوپی کے پاس جانے کو تھی۔ کہ اچانک کسی کے جلد جلد سیڑھیاں چڑھنے کی آواز آئی۔ نوجوان گیا نہیں تھا۔ وہ رومال میں کچھ باندھے لئے آ رہا تھا۔

”معاف کرنا۔“ اُس نے اپنے پھولے ہوئے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں بتائے بغیر ہی چلا گیا۔ میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ یہ لو۔“ یہ کہہ کر اس نے رومال نسرین کے ہاتھ میں دے دیا۔

”کیا ہے؟“ نسرین نے پوچھا۔

”گوشت ترکاری۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرانے لگا۔ جیسے اس نے کچھ شرارت کی ہو۔

”گوشت ترکاری؟ کس نے کہا تھا لانے کے لئے؟“

”خفا کیوں ہوتی ہو۔ بات یوں ہے۔ جب نجمی زندہ تھی۔ میں یونہی منہ اندھیرے اُسے جگائے بغیر گھر سے نکل جاتا۔ ہوا خوری کی ہوا خوری ہو جاتی اور آتی دفعہ گھر کا سودا لیتا آتا۔ ہمیں نوکر رکھنے کی توفیق نہیں تھی بس یونہی مل بانٹ کے کام کیا کرتے۔ وہ گھر کا اور میں باہر کا۔۔۔۔ ذرا

دیکھو تو گوشت کیسا تازہ اور عمدہ ہے۔ آدھا دست کا آدھا پشت کا اور گُردا اُرونگے کا۔ نوکر کا باپ بھی ایسا گوشت نہیں لا سکتا۔ اور پھر ذرا کچنال کو تو دیکھو۔ آج ہی شہر میں آئی ہے۔ پھر پیاز بھی ہے، ہری مرچیں بھی، اورک بھی اور دھنیا بھی......"

نوجوان ڈاڑھی بھی منڈواتا آیا تھا۔ تھوڑا سا صابن اس کے کان کی لوؤں پر ابھی تک لگا رہ گیا تھا۔ نسرین کا جی چاہا کہ دوپٹے کے دامن سے صابن کو پونچھ ڈالے۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکی۔

"آپ نے ناحق تکلیف کی۔" نسرین نے کہا۔ "خیر اب لے آئے تو میں شمن کو بلواتی ہوں۔"

"نہیں نہیں اسے مت بلواؤ۔"

"یہ کیوں؟"

"میں کھانا خود پکاؤں گا۔ جب نجمی زندہ تھی۔ تو کبھی کبھی میں بھی ہنڈیا پکایا کرتا۔ وہ سامنے مونڈھے پر بیٹھی مجھے بتاتی رہتی...."

"ہمارا شمن بھی بہت ہوشیار ہے۔" نسرین نے کہا۔ "ایسا کھانا پکاتا ہے کہ زبان چٹخارے لیتی رہ جاتی ہے۔"

"نہیں صاحب۔" نوجوان نے قطعی فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ "نجمی کچنال ایک خاص ترکیب سے پکایا کرتی تھی۔ وہ ترکیب یا تو وہ جانتی تھی یا میں جانتا ہوں۔۔۔۔ مہربانی کر کے آپ انگیٹھی، کوئلے اور چاقو منگوا دیجئے۔"

نسرین نے اس سلسلے میں کچھ اور کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ اور خاموش سیڑھیوں سے اُتر گئی۔

"آؤ بیٹا۔" نسرین کی پھوپھی نے اسے دیکھ کر آگے دالان میں پان بنا تھوکتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی ابھی شمن سے کہہ رہی تھی۔ کہ تمہارا اور ان کا ناشتہ اوپر لے جائے۔"

"میں ناشتہ نہیں کروں گی۔ اس کے لئے اوپر بھیج دو۔"

"تم چپ چپ کیوں ہو؟"

"نہیں تو۔"

"شکل سے تو بڑا کم زبان معلوم ہوتا ہے۔"

نسرین نے کچھ جواب نہ دیا۔

"کیا کر رہا ہے اس وقت؟" پھوپھی نے پوچھا۔

"ہنڈیا کا سودا خرید کے لایا ہے۔ خود ہی پکانے بیٹھا ہے۔"

نسرین کی پھوپھی کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

"سچ؟"

"ہاں۔ ہاں۔"

"بڑا ہی سیدھا سادہ ہے۔"

"خبطی ہے پورا، رات بھر اپنی مری بیوی کی باتیں کر کر کے دماغ چاٹ گیا۔ شمن کو اس کے پاس بھیج دینا۔ ہاتھ بٹاتا رہے گا۔ میں ذرا نوبہار کے ہاں جاتی ہوں۔"

نسرین کا خیال تھا کہ وہ کم سے کم ایک گھنٹہ نوبہار کے ہاں ضرور گذارے گی۔ مگر آدھا گھنٹہ بھی نہ گذرنے پایا تھا۔ کہ وہ اُٹھ آئی۔ سیدھی اوپر کی منزل میں پہنچی۔ دیکھا کہ کمرے کے باہر دالان میں انگیٹھی دہک رہی ہے۔ اور نوجوان اس کے پاس ہی ایک چھوٹی سی دری پر۔

نتھی پالتی مارے بیٹھا پیاز کتر رہا ہے۔ آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ پانی بہہ رہا ہے۔ اس سے ذرا ہٹ کے شمن بیٹھا بڑے مزے سے یہ تماشہ دیکھ رہا ہے۔

"شمن" نسرین نے کسی قدر سختی سے کہا۔ "تم بیٹھے منہ کیا تک رہے ہو۔ صاحب سے پیاز لیکر کیوں نہیں کترتے؟"

"میں تو کئی دفعہ عرض کر چکا ہوں۔" شمن نے منہ بنا کر کہا۔ "پر صاحب مانتے ہی نہیں۔ مجھ سے آگ جلانے کو کہا۔ میں نے آگ جلا دی۔"

"اچھا تم نیچے جاؤ۔"

جب شمن چلا گیا۔ تو نسرین نے کہا۔

"حضرت یہ اس عمر میں ہنڈکلھیا پکانے کی کیا سوجھی ہے۔ لائیے پیاز مجھے دیجیئے۔ اور جاکر آنکھوں پر چھینٹے دیجیئے۔" اور اس نے ہاتھ بڑھا کر نوجوان کی گود سے پیاز کی رکابی خود ہی اٹھا لی۔ نوجوان نے مزاحمت نہ کی۔

دو گھنٹے کے بعد جب وہ دستر خوان پر کھانا کھانے بیٹھے۔ تو نوجوان نے کہا۔

"معاف کرنا۔ میری وجہ سے تم کو اتنی تکلیف اٹھانی پڑی۔ بات یہ ہے کہ نجمی ——"

"باتیں چھوڑیئے اور کھانا کھایئے۔"

"واہ واہ کیا مزے کا کھانا پکایا ہے۔" نوجوان نے پہلا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "نجمی کے ہاتھ کا مزا یاد آ گیا۔"

"چھٹے بنایئے نہیں۔ چپاتیاں تو دیکھیئے کیسی ٹیڑھی ہیں۔"

"چپاتیاں نجمی کو بھی پکانی نہیں آتی تھیں۔ اور میں زیادہ تر تنور ہی سے روٹیاں لگوا لایا کرتا تھا۔"

"مجھے تنور کی روٹی زہر لگتی ہے۔"

"کبھی کبھی ہم کوئی سستا سا خانساماں بھی رکھ لیا کرتے۔ مگر وہ پندرہ بیس روز سے زیادہ نہ ٹکتا۔ چپکے چپکے کسی اچھے گھر کی ٹوہ میں رہتا اور پھر کھسک جاتا۔"

کھانے سے فارغ ہو کر دونوں کمرے میں فرش پر آ بیٹھے۔

"آپ نے کہا تھا۔" نسرین نے کہا۔ "آج کل آپ کسی دوست کے ہاں رہتے ہیں؟"

"ہاں۔ نجمی کے مرنے کے بعد میں نے امی جانی اور زہری کو گاؤں بھیج دیا تھا۔ اور خود ایک دوست کے ہاں اٹھ آیا تھا۔ یہ دوست بھی میری طرح اکیلا ہی ہے۔ ہم دونوں مکان کے کرائے، کھانے پینے کے خرچ اور نوکر کی تنخواہ میں برابر کے ساجھی ہیں۔"

"اور آدھی تنخواہ امی جانی کو بھیج دیتے ہیں؟"

"ہاں۔ مگر وہ ہمیشہ کسی نہ کسی بہانے سے کچھ نہ کچھ لوٹاتی رہتی ہیں۔ کبھی گرم پتلون سلوانے کے لئے۔ کبھی نیا بوٹ خریدنے کے لئے۔"

نسرین نے محسوس کیا۔ کہ اس کی ماں اسے بہت چاہتی ہوگی۔

"اپنی ہمشیرہ کی کیا عمر بتائی تھی آپ نے؟"

"دس برس۔ بڑی پیاری بچی ہے۔"

"اسکول جاتی ہے؟"

"نہیں گھر پر مولوی صاحب سے پڑھتی ہے۔ سینا پرونا اسے دادی سکھاتی ہے۔ اس نے ایک بکری پالی ہے۔ دودھ سی سفید۔ ایک بھی رنگدار بال اس کے سارے جسم پر نہیں۔ اس کی لمبی سی ڈاڑھی ہے۔ زہرہ اس کی بڑی دیکھ بھال کرتی ہے۔ کھیت سے بوٹے توڑ لاتی اور اپنے ہاتھ سے اسے کھلاتی ہے۔ ہمارے گاؤں کے پاس ہی چھوٹی سی ندی بہتی ہے۔ وہ اسے وہاں پانی پلانے لے جاتی ہے۔ ایک دن کیا ہوا۔ کہ وہ بکری ندی کنارے پانی پی رہی تھی۔ کہ ایک بڑا سا کتا آیا۔ وہ جو زور سے بھونکا تو بکری ڈر کر ندی میں گر پڑی۔ پانی کا بہاؤ تیز تھا۔ وہ اس کے ساتھ بہہ چلی۔ اس پر زہرہ نے چیخ چیخ کر اپنا برا حال کر لیا۔ اتفاق سے ایک کسان ادھر سے گزرا۔ شور سن کر دوڑا ہوا آیا۔ بڑی مشکل سے بکری کو نکالا۔ تب زہرہ کی جان میں جان آئی"۔

نسرین یہ سادہ سا بے رنگ واقعہ بڑی دلچسپی سے سنتی رہی۔ جب اس نے بیان ختم کیا۔ تو دو منٹ تک دونوں چپ رہے۔

نوجوان پر کچھ کچھ غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ وہ گاؤ تکیے کے سہارے لیٹ گیا۔ رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اور وہ سو گیا۔

نسرین اٹھی۔ الماری کے خانے سے سفید ململ کا دوپٹہ اور گوٹا اٹھا لائی اور نوجوان کے قریب ہی فرش پر بیٹھ کر دوپٹے میں گوٹا ٹانکنے لگی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں اس کا جی اس کام سے گھبرا گیا۔ اور وہ پلنگ پر جا کر لیٹ گئی۔

تیسرے پہر ایک رکشا منگوایا گیا۔ اور وہ دونوں بازار جانے کی تیاری کرنے لگے۔ نوجوان نے یہ خواہش ظاہر کی تھی۔ کہ وہ اسے کوئی تحفہ خرید کے دینا چاہتا ہے۔ اس نے بغیر کسی شرم و حجاب کے صاف صاف کہہ دیا تھا۔ کہ نسرین بیس روپے تک کی جو چیز چاہے خرید سکتی ہے۔ اس سے زیادہ کی اسے توفیق نہیں۔

"یہ سچ ہے" اس نے کہا "کہ اتنے کم داموں کی کوئی چیز تمہارے لائق نہیں ہو سکتی۔ مگر میرا جی چاہتا ہے کہ میری کوئی چیز خواہ وہ کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو تمہارے پاس بطور یادگار رہے"۔

اور وہ اس کے ساتھ چلنے پہ رضامند ہو گئی تھی۔ پھوپھی کو اجازت دینے میں تامل ہوا تھا۔ مگر ایک تو نسرین خود جانے پر مصر تھی۔ دوسرے نوجوان کے چہرے سے ایسی معصومیت برس رہی تھی کہ کسی برے ارادے کا گمان تک نہ ہوتا تھا۔ اور وہ خاموش رہ گئی۔

اور اب نسرین نیلے رنگ کا ریشمی برقعہ اوڑھے نوجوان کے پہلو میں رکشا میں بیٹھی تھی۔ شہر کی کھلی سڑکوں پر ہزاروں عورتوں مردوں کے بہتے ہوئے ہجوم میں یہ جوڑا بھی تھا۔ اسے دیکھ کر کسی کو یہ سوچنے تک کی پروا نہ تھی کہ ان کا رشتہ زن و شوہر کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔

وہ رکشا سے اتر کر کئی بازاروں میں سے گذرے۔ کئی دکانوں میں گئے۔ جب وہ سڑک پر چلتی تو وہ اس کے آگے پیچھے راستہ صاف کرتا، اسے آنے جانے والی گاڑیوں، موٹروں اور ہجوم کی دھکا پیل سے بچاتا۔ یوں اپنی حفاظت میں لے جاتا گویا وہ کوئی بہت مقدس چیز ہے جس کا دامن تک کسی سے چھو جانا اسے گوارا نہیں۔ جب وہ کسی دکان میں داخل ہوتے۔ تو اس کی فرمائش کی چیزیں دکاندار سے منگوا منگوا کر ایسی تکریم سے اس کے سامنے پیش کرتا۔ کہ دیکھنے والے یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکتے کہ یہ کوئی نیا جوڑا ہے۔ اور یہ کہ شوہر بیوی سے کمال عشق رکھتا ہے۔

نسرین نے بڑی قیمت کی کوئی ایک چیز نہیں خریدی۔ بلکہ روزمرہ کے استعمال کی کئی چھوٹی چھوٹی چیزیں خریدیں۔ جن میں سے بعض کی واقعی اسے ضرورت تھی۔ مثلاً ایک توچٹلا خریدا۔ ایک ریشمی آزار بند۔ کچھ چھوٹی بڑی سوئیاں، دو تین مختلف رنگوں کے تاگے کی ریلیں۔ کچھ کروشیا کی سلائیاں، ایک فریم۔ دو تین مختلف غازے اور لپ۔ ان سب چیزوں پر بیس سے کچھ کم ہی روپے خرچ ہوئے۔ ہر ایک چیز خریدنے کے بعد وہ بڑی ادا کے ساتھ نوجوان سے پوچھتی: "باقی کیا بچا؟"

واپسی پر نوجوان اُسے ایک ریستوراں میں لے گیا۔ اور ٹھنڈی اور گرم کئی قسم کی چیزیں منگوائیں۔ اور نسرین کو اپنی مرضی کے خلاف کئی چیزیں کھانی پڑیں۔

جس وقت وہ گھر پہنچے اچھا خاصا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ نسرین کی پھوپھی بڑے اضطراب سے اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ جب وہ صحیح سلامت گھر پہنچ گئی تو اس کی جان میں جان آئی۔

شمن سے کہہ دیا گیا تھا کہ وہ کھانا نہیں کھائیں گے چنانچہ سرِشام ہی سے اوپر کی سیڑھیوں کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ نسرین نے پچھلی رات کی طرح پھر کمرے کی ہلکی نیلی روشنی میں کنگھی کرنی شروع کی۔ نوجوان پھر اس کے پاس ہی چاندنی پر لیٹ گیا۔

"نسرین!" اس نے کہا۔ "میں نے تمہیں نجمی کی بہت سی باتیں بتائیں۔ مگر ایک بات نہیں بتائی۔"

نوجوان نے جس لہجہ میں یہ بات کہی تھی وہ ایسا گمبھیر تھا کہ نسرین بے ساختہ کہہ اٹھی

"وہ کیا؟"

نوجوان کچھ لمحے خاموش رہا۔ اور پھر بولا۔

"وہ یہ کہ وہ —— وہ باوفا نہیں تھی۔"

"کیا مطلب؟" نسرین نے اور بھی متعجب ہو کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ وہ کسی اور کو چاہتی تھی۔"

"جھوٹ ہے۔"

"نہیں سچ ہے۔"

"اس کا کوئی ثبوت بھی؟"

"مجھے ثبوت مل گیا تھا۔"

"کیسا ثبوت؟"

نوجوان لمحہ بھر کے لئے خاموش رہا اور پھر بولا

"اس کے خط۔ میں نے غلطی سے اس کے نام کا ایک خط کھول لیا تھا۔"

یہ کہتے کہتے نوجوان ایک دم سخت افسردہ ہو گیا۔ اور اس نے گردن جھکا لی۔

"اور تم پھر بھی اسے چاہتے رہے؟"

"ہاں ——" بھرائی ہوئی آواز میں نوجوان کے منہ سے نکلا "اس کے سوا چارہ ہی نہ تھا۔"

کئی لمحے خاموشی رہی۔ جس کو توڑنے کی کسی میں خواہش پیدا نہ ہوئی۔

"کیا وہ جانتی تھی کہ تم اس کے اس راز سے واقف ہو؟"

بالآخر نسرین نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں نے آخری دم تک اس پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ اُس کی موت سے چند منٹ پہلے مجھے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے وہ سخت نزع میں ہے اور مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ مگر میں اس سے آنکھیں نہ ملاتا تھا۔ البتہ دلداری اور تشفی کے لفظ برابر میرے منہ سے نکلتے رہے تھے۔ یہاں تک کہ اس نے آخری ہچکی لی اور رخصت ہوگئی۔"

کچھ لمحے پھر خاموشی رہی جس کو خود نوجوان ہی نے توڑا۔

"آخر اُس پر یہ ظاہر کرنے کا فائدہ بھی کیا تھا۔"

اس رات پچھلی رات کی بہ نسبت جلد ہی روشنی گل کردی گئی۔ نوجوان پھر جلد ہی سو گیا۔ مگر نسرین برابر ستاروں کو جھلملاتے دیکھتی رہی۔ پچھلے پہر اچانک نوجوان نے سوتے میں سسکی لی۔ اور پھر تیز تیز سانس لینے شروع کر دیئے۔ نسرین نے سر اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر جس طرح کوئی بچہ سوتے سوتے ڈر جائے تو ماں اسے چھاتی سے چمٹا لیتی ہے۔ اسی طرح نسرین نے اس کی گردن میں بازو ڈال کر اسے اپنے آغوش میں بھینچ لیا۔

●

غالب کا نظریہ

مرزا صاحب ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالمِ رنگ و بو کی سیر کی ہے۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے یہ نصیحت کی ہے کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو کھاؤ مزے اڑاؤ مگر یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو۔ شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا غم وہ کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک فشانی۔ کہاں کی مرثیہ خوانی۔ آزادی کا شکر بجا لاؤ۔ غم نہ کھاؤ، اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چُنّا جان نہ سہی۔ مُنّا جان سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی تو ایک قصر ملا۔ اقامتِ جاودانی ہے اور اس ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمردین کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ چشمِ بد دور وہی ایک حور— بھائی ہوش میں آؤ۔ کہیں اور دل لگاؤ۔

زنِ نو کُن اے دوست در ہر بہار — کہ تقویمِ پارینہ ناید بکار

شفیق الرّحمٰن

شیطان، عینک اور موسمِ بہار

بہار آگئی۔ ولایتی سینٹ جھکے، کمپنی باغ میں نئی نئی کونپلیں پھوٹیں۔ پژمردہ چہروں پر میک اپ سے تازگی آگئی۔ مسرت و شادمانی کی لہر سول لائینز کے گوشے گوشے میں دوڑ گئی۔ سڑکوں پر پیراشوٹ کے کپڑے کے رنگین ملبوس دکھائی دینے لگے، اور لوگوں نے بے تحاشہ "اور نگ زیب" فلم کا وہ ریکارڈ بجانا شروع کر دیا جس کے شروع کے بول ہیں بلبل مہکا غنچہ چہکا، بادل آیا گھوم کے۔

جب قدرت اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ انگڑائی لے کر اٹھی تو شیطان کی عینک کھو گئی۔

شیطان کی عینک ایسی ویسی عینک نہیں جسے ہر عینک ساز مہیّا کر سکے، اُن کی عینک کے شیشوں کے اُفقی رُخ میں بھی کئی نمبر ہیں اور عمودی رُخ میں بھی چنانچہ کچھ شمال شمال مشرق اور جنوب مغرب جنوب کی قسم کے شیشے ہیں۔

ایسی پیچیدہ عینک کا جلد ملنا محال تھا، لہٰذا شیطان بغیر عینک کے دکھائی دیئے جانے لگے۔ جج صاحب نے ولائت جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ سب متعجب ہوئے سوائے شیطان کے۔ شیطان کا خیال تھا کہ لوگ بڑی تیزی سے ولائت جا رہے ہیں۔ ان دنوں تو یہ رفتار اتنی تیز ہو چکی ہے، کہ کسی کے ولایت جانے پر ذرا حیرت نہیں ہوتی حیرت ہوتی ہے تو اس بات پر کہ فلاں شخص اب تک ولائت کیوں نہیں گیا۔ ان کا اندازہ تھا کہ ہر شخص اللہ کو پیارا ہونے سے پہلے کم از کم ایک مرتبہ ولائت ضرور ہو آئے گا۔

ویسے جج صاحب کے جانے نہ جانے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ فکر تھا تو رضیہ کا۔ اگر وہ ساتھ چلی گئی تو بہت برا ہوگا۔ ولایت میں لڑکے بڑے سمارٹ ہوتے ہیں۔ اور جج صاحب آزاد خیالات کے انسان تھے۔ شیطان کا تو بہت ہی برا حال تھا۔ کیونکہ وہ رضیہ پہ دوبارہ فریفتہ ہو گئے تھے۔ ہُوا یوں کہ وہ تقریباً دو سال تک رضیہ سے نہ مل سکے۔ جب وہ باہر سے آئے تو جج صاحب کا کنبہ کہیں چلا جاتا۔ جب کنبہ آتا تو شیطان کہیں اِدھر اُدھر ہوتے۔ پورے دو سال کے بعد وہ چاء پر رضیہ سے ملے۔ میں نے دونوں کا تعارف کرایا۔ اور بتایا کہ وہ جج صاحب کے ساتھ ولایت جا رہی ہے۔ بڑی رسمی قسم کی گفتگو ہوئی۔ شیطان نے پوچھا آپ کے مشغلے کیا ہیں؟ آپ کے محبوب ایکٹر اور پسندیدہ مصنّفین کون کون سے

ہیں۔ ڈروس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے، آپ شام کو کیا کیا کرتی ہیں بی۔ اے میں آپ کے مضامین کیا تھے، آپ کو شلوار پسند ہے یا غرارہ جو نارڈ شا واقعی اچھا مصنف ہے۔

کچھ دنوں کے بعد شیطان نے بیان دیا کہ جمعے کی سہ پہر کو چار بج کر پچپن منٹ سے وہ رضیہ پر نئے سرے سے دوبارہ عاشق ہو گئے ہیں۔

اُن کی حالت اس قدر مخدوش ہو چکی تھی کہ میں سچ مچ ان کے حق میں دستبردار ہو گیا۔ میں دستبردار کیوں ہوا؟ شاید یہ قربانی کا جذبہ تھا، جذبۂ ترحم تھا۔ یا وہ لافانی فوق البشر آسمانی جذبہ جو انسان کے دل میں کبھی کبھی آتا ہے جو روح کو لامتناہی وسعتوں میں لے جاتا ہے، جو انسان کو فرشتوں میں لا کھڑا کرتا ہے اور کبھی فرشتوں کو انسانوں میں، جذبہ جو——
وغیرہ وغیرہ۔

دستبردار ہونے کی ایک اور وجہ بھی تھی —— مجھے یقین تھا کہ چاہے شیطان کچھ کر لیں رضیہ ان کی جانب کبھی ملتفت نہ ہو گی بنے گا کچھ بھی نہیں۔

شیطان تو عاشق ہو گئے لیکن رضیہ پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا ویسے رضیہ کا رویہ ہم سب کے متعلق عجب مولویانہ سا تھا۔ اُسے کسی سے محبت ہوتی تھی نہ نفرت۔ شیطان کا خیال تھا۔ کہ رضیہ کا دل کچھ تو قدرت نے برف میں لگایا تھا۔ کچھ اس نے ٹھنڈا۔۔ تازہ رکھنے کے لئے ریفریجریٹر میں رکھ لیا۔

× × × × × × ×

شیطان نے مجھے فون کیا۔ اور چائے پر ایک کیفے میں بلایا۔ پوچھا۔ کہ اور کون ہو گا۔ بولے یونہی ایک آدھ دوست وغیرہ وغیرہ۔ میں کیفے کے دروازے میں داخل ہوا۔ ترنگ بھری بلبلوں کی چہچہیں، کبوتروں کے رونے کی آوازیں، مرغیوں کی فریادیں ملی جلی سنائی دینے لگیں میں سمجھ گیا کہ آرکیسٹرا کوئی انگریزی دھن بجا رہا ہے۔ شیطان کو ڈھونڈنا مصیبت ہو گئی جدھر دیکھتا ہوں اجنبی چہرے نظر آتے ہیں۔ آخر انہوں نے خود آواز دی۔ عینک کے بغیر وہ واقعی اجنبی سے معلوم ہو رہے تھے۔ دراصل عینک ان کے چہرے کا جزو بن چکی تھی، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی میں نے ان کو عینک کے بغیر بھی دیکھا ہو، یہاں تک کہ جب دو تین برس کے تھے تب بھی شاید عینک لگاتے تھے۔

میں نے پوچھا کہ باقی اصحاب کہاں ہیں۔ انہوں نے اشارے سے بتایا۔ ایک تو میں ہوں اور یہ تین وغیرہ وغیرہ ہیں۔ میں نے دیکھا کہ تین بالکل ایک جیسی عینکیں مجھے دیکھ رہی ہیں، بالکل ایک جیسی شبیہیں تھیں پہلے تو خیال ہوا کہ کہیں ایک چہرے کا عکس مختلف آئینوں میں تو نہیں پڑ رہا۔ شیطان نے تعارف کرایا —— یہ کریمہ ہیں —— یہ رحیمہ ہیں —— اور یہ سفینہ۔

میرے لئے وہ تینوں بالکل ایک سی تھیں، سب سے پہلے نظر عینکوں پر جاتی تھی جو ایک سی تھیں، عینکوں کے عقب میں جو تھوڑے بہت خدوخال دکھائی دیتے تھے وہ بھی ایک جیسے تھے۔ باوجود انتہائی کوشش کے میں ان میں تمیز نہ کر سکا۔ بار بار ایک ہی لڑکی کے سامنے کیک سرکاتا رہا اور اپنی طرف سے یہی سمجھتا رہا۔ کہ طشتری تینوں کے سامنے رکھی تھی۔ ایک لڑکی کو گھبرا کر مس زرینہ بھی کہہ گیا۔ جس پر شیطان نے دوبارہ ان کے نام

لئے مجھے صرف کریمہ یاد رہا۔ شاید کریمہ بہ بشاشت برحال رہا کی وجہ سے۔ کریمہ تینوں میں کم معمولی تھی ویسے وہ حسین ہوتے ہوتے بال بال بچ گئی تھی۔

آخر میں نے ہمت کی اور تینوں کو مس کریمہ اور مس سفینہ وغیرہ کہہ کر مخاطب کیا۔ اور بتایا کہ مجھے ان سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ شیطان نے لفظ مس کئی دفعہ دہرایا اور بولے۔ جانتے ہو دنیا میں عورت یا تو ہٹ ہوتی ہے اور یا پھر مس۔

چائے کے بعد شیطان انہیں چھوڑنے چلے گئے اور میں وہیں بیٹھا ان کے نام یاد کرتا رہا۔ دفعتاً کوئی شخص زور زور سے نمکین پانی کے غرارے کرنے لگا۔ میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ ریڈیو پر پکا گانا ہو رہا تھا شیطان نے واپس آکر کہا "تمہارے فقرے تین لڑکیاں ادھار ہیں" انہوں نے میری رائے طلب کی میں نے انہیں بتایا کہ معنک لڑکیوں سے آج تک میرا واسطہ نہیں پڑا اس لئے میں کچھ نہیں کہہ سکتا اور پھر اس صورت میں جبکہ شیطان کی ایک معنک کزن کسی کالج میں استانی ہیں۔ البتہ ایک شعر میں نے کہیں سے سنا تھا۔

اگرچہ عینکوں سے فرق کچھ اتنا نہیں پڑتا!
معنک لڑکیوں پر لوگ عاشق کم ہی ہوتے ہیں

لیکن ان کا خیال تھا کہ عینک لڑکی کا زیور ہے۔ عینک کو مقوی حسن کا درجہ دیا گیا ہے۔ کئی چہرے تو عینک کے بغیر اچھے معلوم نہیں ہوتے۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ وہ چہرے نہیں تھے۔ دراصل وہ چہرے میں آج تک نہیں دیکھے۔

انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ مختلف کالجوں میں پڑھتی ہیں، مہینے میں پندرہ دن ہوسٹلوں میں رہتی ہیں اور پندرہ دن گھر۔ ان سے واقفیت بھی خوب ہوئی۔ موسم بہار کی آمد پر ابھی شیطان کی عینک کو گم ہوئے چند دن ہی گزرے ہوں گے۔ کہ انہوں نے سینما میں اپنی ان کزن کو دیکھا جو استانی ہیں۔ وہ پچھلے درجے میں بالکل اکیلی بیٹھی تھیں۔ یہ ان کے پیچھے جا بیٹھے۔ پہلے گلا صاف کیا، کھنگارے۔ پھر ایک ترقی پسند سا شعر پڑھا، مگر وہ خاموش رہیں۔ انہوں نے عینک کے شیشے صاف کرنے کا مشورہ دیا کہ میلے ہو رہے ہیں۔ وہ چپ رہیں یہ شکایتیں کرنے لگے۔ کہ مہینے ہو جاتے ہیں اور تم نہیں ملتیں ہم بلاتے ہیں تو انکار ہو جاتا ہے۔ خود اکیلی سینما جاتی ہو۔ پہلی تاریخیں ہیں۔ تمہیں تنخواہ ملی ہو گی۔ دیکھیں تمہارا بٹوہ۔

جب شیطان نے بٹوے پر ہاتھ ڈالا تو چھینا جھپٹی شروع ہو گئی۔ آس پاس کے لوگ دیکھنے لگے۔ آخر فتح شیطان کی رہی، اور انہوں نے بٹوہ چھین لیا۔ اب جو قریب سے انہیں دیکھتے ہیں تو وہ کوئی اور تھیں۔ بڑے شرمندہ ہوئے۔ جو معافی مانگنی شروع کی تو انہیں فلم بھی نہ دیکھنے دی۔ پکچر ختم ہوئی تو انہیں گھر چھوڑنے گئے اور دوستی ہو گئی۔ یہ تھی کریمہ جس کی بائیں آنکھ پر شیطان بری طرح فریفتہ ہو گئے تھے کیونکہ وہ اکثر شیطان کی دائیں طرف بیٹھتی اور وہاں سے بائیں آنکھ مقابلتاً قریب ہوتی۔

ایک روز شیطان کیفے میں کافی پی رہے تھے کہ دروازہ کھلا، کریمہ آئی اور شیطان کے سامنے سے ہوتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلی گئی۔ انہیں

بہت بُرا لگا۔ یہ اُٹھے اور اسی طرح تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اس کے سامنے جا بیٹھے۔ اوپر کچھ اندھیرا سا تھا۔ انہوں نے خفگی کا اظہار کیا، اور کہا کہ لڑکیوں کو آداب بالکل نہیں آتے۔ اگر باتیں کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ تو کم از کم ہیلو ہی کہہ دیتیں۔ اسی طرح تو غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ جب اچھی طرح خفا ہو چکے تو معلوم ہوا کہ یہ کریمہ نہیں تھی کوئی اور عینک لڑکی تھی۔ شیطان نے بڑی خوشامدیں کیں۔ بات بات بھی ہی ہی کرتے رہے۔ بالائی اور کافی منگائی ـــــ یہ رحیمہ تھی۔

تیسری لڑکی سفینہ خود کنارے آ لگی۔ اور ایک دن کریمہ اور رحیمہ کے ہمراہ چڑیا گھر میں مل گئی۔

"تو سارا قصور تمہاری گمشدہ عینک کا ہے ـــ"

"اور موسم بہار کا بھی ـــ" وہ بولے

میں نے مشورہ دیا۔ کہ وہ اپنی سرگرمیوں کو تب تک ملتوی کر دیں جب تک ان کی نئی عینک نہیں آ جاتی۔

"عینکیں تو آتی جاتی رہتی ہیں موسم بہار بہت دیر میں آتا ہے" وہ آہِ سرد کھینچ کر بولے "اور پھر رضیہ نے بھی تو کہا تھا کہ آپ عینک کے بغیر اچھے معلوم ہوتے ہیں۔"

ہم نے بل منگایا۔ شیطان نے حسبِ معمول بل کا بغور مطالعہ کیا دوبارہ میزان کیا اور ساڑھے تین آنے کی غلطی نکالی، بیرہ بل درست کرا کے لایا۔ میں نے چار آنے طشتری میں چھوڑ دیئے۔ بیرے نے بہت بُرا منہ بنایا ابھی تھوڑی دُور ہی گیا ہوگا۔ کہ شیطان نے آواز دے کر واپس بلا لیا اور چار آنے طشتری سے اٹھا کر جیب میں ڈال لئے۔

ہم باہر نکلے، موٹر سائیکل سنبھالی اور جج صاحب کی کوٹھی کا رُخ کیا۔ شیطان کا اصرار تھا کہ جس طرح ملازمت میں ایکسٹینشن ملتی ہے۔ اسی طرح انہیں بھی وہ کتنے سال مل جانے چاہئیں جو انہوں نے رضیہ کے عشق میں گزارے۔ ان کا عشق تب سے گنا جائے جب وہ پہلی مرتبہ رضیہ پر عاشق ہوئے تھے۔ اس طرح وہ مجھ سے کافی سینیئر ہو جاتے تھے۔

پھاٹک پر ہمیں ننھا ملا جو غلیل لئے کھڑا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حکومت آپا شکار کھیلنے گئی ہیں جج صاحب کے ساتھ ـــــ یہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ کیونکہ حکومت آپا کی جدائی میرے لئے ہمیشہ مسرت آمیز ہوتی ہے۔

شیطان بولے "کاش۔ مجھے پہلے پتہ چل جاتا۔ جہاں وہ گئی ہیں وہاں کے جانوروں کو مسلح کر دیتا۔"

ہم نے رضیہ کے متعلق دریافت کیا۔ ننھے نے دیدے گھمائے، دانت نکالے، غلیل چلائی اور بڑی سنجیدگی سے بولا "یقین کیجئے بھائی جان میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ آخر رضو آپا میں ایسی کیا چیز ہے جو آپ دونوں کو پسند ہے۔ کم از کم مجھے تو وہ بے حد معمولی دکھائی دیتی ہیں۔"

"جب تم ہماری عمر کو پہنچو گے۔ تو تمہارا معیار یقیناً بدل جائے گا۔"

"ان عورتوں سے خدا بچائے۔" ننھے میاں بولے "میں نے تو عمر بھر ایسی لڑکی نہیں دیکھی جس نے مجھے متوجہ کیا ہو۔"

یہ ننھے میاں نہایت گستاخ قسم کے بچے تھے۔ بالکل چھوٹے سے تھے پھر بھی یہ عمر بھر کا حوالہ دینا ان کا تکیہ کلام تھا۔ عمر بھر میں فلاں چیز کی تلاش میں رہا۔ ساری عمر میں نے یوں کیا۔ عمر گزار دی لیکن یوں نہیں کیا۔

شیطان ننھے میاں کو دیکھ کر دانت پیستے اور قسم کھاتے کہ اگر وہ کبھی اسمبلی کے ممبر بن گئے تو ایک قانون نافذ کرائیں گے جس کی رو سے عشاق کو اجازت ہو گی۔ کہ اگر محبوب کا کوئی ایسا چھوٹا بھائی ہو تو اسے جاں بحق تسلیم کر دیں۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم زد وکوب تو کر سکیں شیطان ان دنوں کچھ حساس سے ہو گئے تھے، بہار آتے ہی وہ حساس ہو جاتے ہیں۔

بیگم ہلیس: "سناؤ بچو کیسے ہو۔ تمہاری موٹر سائیکل کیسی ہے؟"

"جی خدا کے فضل سے اچھی ہے اور آپ کی خیریت کی طالب ہے۔"

"بھائی جان آپ کی موٹر سائیکل کی طاقت کتنی ہے؟"

"ڈھائی ہارس پاور۔"

"یعنی دو گھوڑے اور ایک بچھڑا۔ لیکن جس روز میں اس پر سوار ہوا تو انشاء اللہ یہ ساڑھے تین ہارس پاور کی ہو جائے گی امی جان ہارس پاور کا ترجمہ کیجیے۔"

"مجھے کیا پتہ کہ یہ کمبخت پاور ہاؤس کیا بلا ہے۔"

"قوتِ اسپ۔" ننھا سینہ پھلا کر بولا۔

"یہ دن بدن شرارتی ہوتا جا رہا ہے ۔۔۔ آج یہ کہیں سے ایک چھوٹا سا بچے کا بکرا پکڑ لایا۔ جو اودھم مچایا ہے تو خدا کی پناہ۔"

بیگم نے ذرا دوسری طرف دیکھا اور شیطان غائب تھے۔

"جانوروں کا تو اسے اتنا خبط ہے۔ کہ پڑوس کی ساری کتیاں اور بلے اس سے ڈرتے ہیں، کہیں کوئی نظر آ گیا۔ فوراً پکڑ لیا۔"

"امی جان۔ الف اے۔ خاں صاحب کی موٹر آئی ہے۔"

یہ الف اے خاں شاید کوئی فقیر احمد یا ندا احمد وغیرہ تھے، ان پر ننھے میاں خاص طور پر مہربان تھے۔ ہر ملاقات پر سلام کے بعد سوال ہوتا۔ "چچا جان آپ اتنے برسوں سے الف۔ اے خاں کیوں ہیں، لوگ ایم۔ اے خاں ہو گئے ہیں۔ آپ بی۔ اے خاں تک نہیں ہوئے؟"

"مسز خاں بھی آئی ہوں گی۔ اچھا میں چلتی ہوں، اتنی دیر تم ننھے کو پڑھاؤ، اس کا سبق بھی سننا، یہیں بیٹھے رہو، باہر مچھیاں اور مکھر بہت ہیں۔"

سب سے پہلے ننھے میاں نے اپنی تازہ ترین تھیوریاں پیش کیں۔ کہ در اصل آسمان ایک سیاہ خول ہے جس میں بے شمار چھوٹے چھوٹے سوراخ ہیں، اس خول کے پیچھے نہایت تیز روشنی رہتی ہے۔ ہم ان سوراخوں کو ستارے سمجھتے ہیں۔ یہ ہوائی جہاز والے اگر زیادہ اونچے چلے گئے تو خول سے ایسے ٹکرائیں گے کہ دھڑام سے آواز آئے گی اور سب کا انتقال ہو جائے گا۔ اور یہ کہ کشش ثقل کے بالکل الٹ ایک اور کشش ہے۔ جو انسان کو آسمان کی طرف کھینچتی ہے۔ اس کا نسخہ ابھی تک معلوم نہیں ہوا۔ جس روز دریافت کر لیا گیا۔ سفر میں بڑی آسانی ہو جائے گی۔ لوگ سٹوں سے آسمان کی طرف اڑ جایا کریں گے۔ اتنی دیر میں زمین گردش کرتی رہے گی اور وہ شہر دور چلا جائے گا۔ جب نیا شہر آنے والا ہوگا۔ تو مخالف گیئر لگا کر کشش ثقل کے ذریعے نیچے اترا آیا کریں گے۔

اس کے بعد وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ انسان اپنا توازن کس طرح

قائم رکھتا ہے۔ اگر پودے چھ فٹ لمبے لٹھ کو زمین پر کھڑا کر دیا جائے تو وہ فوراً گر پڑتا ہے لیکن انسان کھڑا رہتا ہے اور نہیں گرتا۔ انہیں یہ بات بھی حیرت میں ڈالتی تھی کہ پانی پت کی لڑائیاں ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کے بغیر کیونکر فتح کی گئیں۔

"ننھے تم اسی وقت کاپی لاؤ اور کتے پر ایک کہانی لکھو جو کم از کم دو صفحے کی ہو۔ جاؤ۔ شاباش"۔ میں نے پیچھا چھڑانے کی نیت سے کہا۔

ابھی مشکل سے باغیچے تک پہنچا ہوں گا کہ ننھے میاں کاپی لئے کھڑے تھے۔

"جاؤ، جا کر کہانی لکھو۔ ورنہ میں بیگم سے کہہ دوں گا"۔

"لکھ لی — یہ رہی —"

لکھا تھا مجھے کتوں کا بڑا شوق ہے، چھوٹے کتوں کا تو بہت ہی شوق ہے، خوبصورت چھوٹے کتوں کا تو بہت زیادہ ہی شوق ہے۔ کتے بھی مجھے پسند کرتے ہیں۔ کل کا ذکر ہے کہ میں نے دور سڑک پر پڑوسیوں کا ننھا سا حسین و جمیل کتا دیکھا۔ میں نے آواز دی — ڈبو — ڈبو — ڈبو — ڈبو — ڈبو — ڈبو — ڈبو — ڈبو — ڈبو — ڈبو — ڈبو — ڈبو — ڈبو — ڈبو — ڈبو — (اسی طرح ڈبو ڈبو لکھ کر دو صفحے بھر رکھے تھے) — لیکن افسوس کہ یا تو میری آواز ڈبو تک نہ پہنچ سکی اور یا وہ ڈبو نہیں تھا — اس لئے نہیں آیا۔

ارادہ ہوا کہ بلی پہ کہانی لکھوائی جائے۔ پھر سوچا کہ میاؤں میاؤں سے بھی صفحے بھرے جا سکتے ہیں۔ بڑی مصیبتوں سے میں نے ننھے میاں سے پیچھا چھڑایا۔ دبے پاؤں باغیچے میں پہنچا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ نہایت سہانا سماں ہے، معطر جھونکے چل رہے ہیں، تارے جگمگا رہے ہیں، چاند ابھی نکلا تو نہیں لیکن ارادہ کر رہا ہے۔ فوارے کے سامنے رضیہ اور شیطان یوں چپ کھڑے ہیں۔ جیسے تصویر اتروا رہے ہوں۔

میں شیطان کے حق میں ریٹائر ہو چکا تھا اور مجھے یوں چھپ چھپ کر ہرگز نہیں دیکھنا چاہئے تھا لیکن یہ میری انتہائی کمزوری ہے کہ جہاں محبت بھری باتیں ہو رہی ہوں مجھ سے بغیر سنے نہیں رہا جاتا۔

شیطان نے ایک نہایت لمبی آہ کھینچی، اتنی لمبی کہ میں حیران رہ گیا۔ بڑے غمگین لہجے میں بولے — "ٹوٹے چمک کر ستارے امید کے — اک خواب تھا کہ پتہ نہیں کیا ہوتا رہا —"

"اک خواب تھا کہ تا بہ سحر دیکھتے رہے —" رضیہ نے لقمہ دیا۔ اور دونوں روش پر چلنے لگے۔ وہ میرے قریب سے گزرے شیطان تو اتنے قریب تھے کہ میں چاہتا تو ہاتھ بڑھا کر گدگدی کر سکتا تھا۔

"جی ہاں بالکل وہی — اُف یہ ستارے کتنے اداس ہیں — رات بھر سنسان فضاؤں میں اکیلے ٹمٹماتے رہتے ہیں۔ میری زندگی بھی ستارے کی طرح اداس اور تنہا ہے"۔

جس جگہ میں چھپا بیٹھا ہوا تھا وہ ایسی تھی کہ اگر ذرا بھی ہلتا تو نظر آ جاتا اس لئے میں ان کا تعاقب نہیں کر سکا۔ اب وہ دونوں واپس آ رہے تھے۔ رضیہ کہہ رہی تھی — "اول تو آپ ان سب کو ستارے نہیں کہہ سکتے، ستارے وہ ہیں جو سیاروں کی طرح گردش نہیں کرتے، مثلاً سورج

"جلدی واپس چلے آؤ۔"

لڑکیوں نے شیطان کی اس حرکت پر اظہار افسوس کیا کہ اتنے اچھے خاندانی کتے کو بلاوجہ جھڑک دیا۔ شیطان جو غالباً کتے کو ابھی نہیں دیکھ سکے تھے بولے — "بات یہ ہے کہ آج تک کوئی کتا میری زندگی میں داخل نہیں ہوا۔"

جب لڑکیاں قہقہے لگا رہی تھیں شور مچا رہی تھیں اور آرکیسٹرا جاز کی گت بجا رہا تھا۔ تو شیطان نے چپکے سے مجھ سے عہد کرایا کہ میں کبھی انہیں عینک کے سلسلے میں نہیں ٹوکوں گا۔ اور ان کی کمزوری کو صیغۂ راز میں رکھوں گا۔

ہماری گفتگو کے موضوع صرف دو تھے۔ پہلا موضوع شادی تھا اور دوسرا موضوع بھی شادی تھا۔ شیطان کریمہ کے ساتھ لگے ہوئے اس کی بائیں آنکھ کو بڑی للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

وہ کہہ رہی تھی — "میں تو ایسے شخص سے شادی کروں گی جو دولتمند ہو، صاف گو اور دلیر ہو، صاحبِ عزت و صاحبِ دماغ ہو۔ نمایاں شخصیت کا مالک ہو — مشہور و معروف ہو —"

"تم نے دیر لگا دی —" شیطان بولے — "مسز چرچل اُس شخص کو کبھی کی ہتھیا چکی ہیں —"

"میرا انتخاب آخری ہوگا۔" جیسے انہوں نے شیطان کی بات ہی نہیں سُنی۔ "اور جسے میں نے پسند کیا اُس کے ساتھ جہنم میں رہنے کو بھی تیار ہوں گی —"

"تم نے ابھی اور اُس خوش نصیب کی منزل خوب چُنی ہے۔"

شیطان کچھ اور قریب ہو گئے۔ اتنے کہ جب وہ باتیں کرتے تو کریمہ کی عینک کے شیشے دُھندلے ہو جاتے اور اُسے بار بار صاف کرنے پڑتے۔

شیطان نے کچھ اور قریب ہو کر بجلی کے ایک بہت بڑے قمقمے کی طرف اشارہ کیا۔ جسے وہ غالباً چاند سمجھے تھے۔ میں نے جلدی سے اُن کا ہاتھ پکڑ کر چاند کی طرف کر دیا۔ جو درختوں سے طلوع ہو رہا تھا۔ اُنہوں نے چاند کی تعریف کی، نظارے کی تعریف کی اور کریمہ سے رائے طلب کی۔

"چاند اچھا ہے، تارے بھی بُرے نہیں ہیں اور پیسٹری بھی اچھی ہے صرف اس میں مکھن زیادہ ہے"۔ جواب ملا۔

شیطان نے بیرے کو بلایا اور ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر دیا۔ "یہ آرکیسٹرا والوں کو دے دو، ایسے حسین ماحول میں کوئی اچھا سا والز سننے کو جی چاہتا ہے۔"

"اور آتے وقت کچھ گرم گرم سموسے لیتے آنا۔" ایک لڑکی نے بیرے سے کہا۔

آرکیسٹرا والے شاید شیطان کے رقعے کے منتظر ہی تھے، ابھی بیرہ وہاں تک پہنچا نہ تھا کہ والز شروع ہو گیا۔ شیطان کریمہ کے کچھ اور قریب آ گئے۔

"کیا خیال ہے —؟" انہوں نے آگے جھک کر آرکیسٹرا والوں کی طرف اشارہ کیا۔ اور کریمہ کی عینک کے شیشے دُھندلے کر دیئے۔

"ذرا نمک زیادہ ہے آپ بھی چکھیئے —" اُس نے طشتری سامنے کر دی۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ ہم چاء پی رہے تھے یا رات کا کھانا کھا رہے تھے چاء کا تو وقت نہیں تھا اور کھانے میں روٹیوں کی کسر تھی، ویسے ایک لڑکی چاء کے ساتھ کوفتے کھا رہی تھی۔

ذراسی دیر میں دوسرا والز بج رہا تھا اور شیطان سفینہ سے گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔ وہ اپنے خاندان کے قصیدے سنا رہی تھی۔ کہ ان کے خاندان میں کوئی ستر فیصدی خان بہادر تھے، بیس فیصدی نواب زادے اور باقی صاحبزادے۔ بچپن یورپین گورنسوں کے ساتھ عمر بھر رہتے تھے۔ لڑکیاں کانونٹ میں پڑھتی تھیں۔ تعلیم ختم ہونے سے پہلے ہی ان کی شادی کسی امپیریل سروس والے سے ہو جاتی تھی جو انہیں سیدھا انگلینڈ لے جاتا تھا، اس کے بعد کیا ہوتا تھا۔ اس کا ذکر اس نے نہیں کیا۔

اس نے شیطان کے آبا و اجداد میں بھی دلچسپی ظاہر کی اور ان کے متعلق دریافت کیا۔ انہوں نے ٹال مٹول کر دی جب اصرار بڑھا تو بولے "جی ہمارا شجرہ نسب صدیوں پہلے لنگوروں سے جا ملتا ہے۔ غالباً ڈارون کی تھیوری میں تو آپ کا بھی اعتقاد ہوگا۔ لہذا آپ کے بزرگ اور ہمارے بزرگ اکٹھے ہی رہا کرتے تھے۔"

تیسرا والز شروع ہوا اور شیطان رحیمہ کے ساتھ آبیٹھے۔ کریمہ اور سفینہ آپس میں مجھ سے گفتگو کر رہی تھیں ——— باتیں وہ آپس میں کر رہی تھیں اور منہ میری طرف کر رکھا تھا۔

میں نے مغز کے کباب منگائے۔ اور ان کی طرف بڑھا کر کہا

—"لیجئے دماغ کھائیے —"

ایک کباب پر تھوڑا سا شوربا ڈال کر دوسری کی طرف بڑھا دیا۔

"لیجئے مغز چاٹیئے —"

وہ کچھ جھجکیں، میں مُصر رہا ——" اب کھائیے بھی دماغ —— دیکھئے آپ تکلف کرتی ہیں —— واللہ دماغ چاٹیئے —"

اب ریکارڈ بج رہے تھے۔ کروسو نہائت دلکش نغمہ الاپ رہا تھا رحیمہ اور شیطان نہایت ذہین قسم کی گفتگو کر رہے تھے

"اب مجھے ہی لیجئے۔ مجھ پر ایسے دورے اکثر پڑتے ہیں اور میں اس قدر پریشان ہو جاتا ہوں کہ جب سوتا ہوں تو جاگتا رہتا ہوں۔ پس ایک وہم مجھ پہ سوار ہو جاتا ہے اور بعض اوقات مجھے یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ میں اتنا عظیم انسان نہیں جتنا کہ ہوں۔"

"کروسو کو بھی احساس کمتری تھا، وہ بالکل چھوٹا سا ٹھگنا ہوا آدمی تھا تبھی اس کے گانے میں اتنا سوز ہے یا تو اس کا گلا اتنا سُریلا تھا یا اسے زکام کی شکائت رہتی ہو گی، غالباً وہ انگریزی کے پکے گانے گاتا تھا۔"

اب سناترا کا ریکارڈ بج رہا تھا۔

"سناترا کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

"یہ نہی منحنی سا فاقہ زدہ انسان ہے۔"

"اور مقصود صاحب —؟" میں نے مقصود گھوڑے کے متعلق پوچھا وہ بھی کبھی کبھی گایا کرتا تھا جسے لوگ ہنہنانا کہتے تھے۔

"آدمی تو فضول سے ہیں لیکن ان کے پاس کار نہائت عمدہ ہے۔" سفینہ بولی۔

شیطان کے کان کھڑے ہوئے۔ ان دنوں مقصود گھوڑے سے ان کے تعلقات خوش گوار نہیں تھے۔

"آپ کے وہ دوست آپ کے ساتھ کبھی نہیں آتے" کریمہ نے پوچھا

"یہ چائنیٹ کی ہسٹری نہیں لکھی آپ نے —" شیطان نے جواب دیا۔

"ان کی کار واقعی نہائت خوبصورت ہے، وہ ہمیشہ ہوتے بھی اکیلے

ہی ہیں ——"

"بیرہ! —" شیطان چلائے "تم کچھ سموسے کھاؤ گی ——؟"

"کافی کھا چکی ہوں، چلئے آپ کے لئے کھا دوں گی۔ دیر ہو گئی۔ کیا وقت ہو گا؟" کریمہ نے پوچھا۔

"دس بجنے میں بیس منٹ ہیں۔" میں نے بتایا۔

"پھر تو چلیں ——"

"نہیں —— تمہاری گھڑی آگے ہے" شیطان بولے "صرف نو بج کر چالیس منٹ ہوئے ہیں۔"

"اوہ۔ میں سمجھی دس بجنے والے ہیں۔"

جب ہم کیفے سے باہر نکلے تو شیطان کہیں غائب ہو گئے دیکھا تو ایک اور تانگے میں بیٹھے ہیں۔ چونکہ میں عہد کر چکا تھا کہ ان کی بیناٹی کا ذکر نہیں کرونگا۔ اس لئے خاموش رہا۔

× × × × × × ×

مقصود گھوڑا اپنی کار میں مجھ سے ملنے آیا، اور لڑکیوں سے متعارف ہونے کی خواہش ظاہر کی، میں نے کہا کہ شیطان سے پوچھو۔ شیطان بڑے خفا ہوئے کہ خبردار جو کسی نے میری لڑکیوں کی طرف دیکھا بھی ہے تو —— شاید وہ مقصود گھوڑے کی کار سے گھبراتے تھے۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولے۔ اور تم اپنا قرض کیوں نہیں چکاتے۔ لاؤ کہاں ہیں تین لڑکیاں۔

× × × × × × ×

ادھر جیسے حادثوں کی بارش شروع ہو گئی اور حادثے موسلا دھار برسنے لگے ——

شام کو کلب گیا دیکھتا ہوں کہ چند خلا سفر قسم کے معنگ حضرات شیطان کو گھیرے بیٹھے ہیں۔ ایسی گرما گرم بحث ہو رہی ہے کہ کمرے کا ٹمپریچر کافی بڑھ گیا ہے۔ ایک صاحب جنہوں نے اپنے آپ کو کامریڈ مشہور کر رکھا تھا۔ اور شاید کامریڈ تخلّص بھی کرتے تھے۔ شیطان کے چہرے میں اپنی عینک ٹھونسے ایک اور کامریڈ کی باتیں کر رہے ہیں جو کسی دوسرے براعظم سے تعلق رکھتے ہیں اور ان دونوں نہیں جلتے۔

"وہ چھوٹے ہیں موٹے ہیں اس لئے وسیع خیالات کے انسان ہیں۔" شیطان بولے۔

"وہ نہائت تجربہ کار انسان ہیں۔" کامریڈ بولے

"خاک تجربہ کار ہیں۔ اور تجربہ ہے کیا۔ غلطیوں کا دوسرا نام۔ میں تو انہیں اوّل نمبر کا قنوطی انسان سمجھتا ہوں، حالانکہ انہیں انسان سمجھنا بھی زیادتی ہے۔"

"وہ کیدڑوں مردوں کے پیش رو ہیں۔"

"یہی تو مصیبت ہے کہ وہ مردوں کے پیش رو ہیں اور عورتوں کے پیرو ——"

"قنوطی، قنوطی کیا لگا رکھا ہے۔ قنوطی ہوتا کیا ہے؟"

"قنوطی وہ ہے جو برائیں دیرانے تعمیر کرتا ہے، جو سکونِ قلب کے لئے اپنے آپ کو خوب ستاتا ہے، بیزار کرتا ہے اور جب کر چکتا ہے تب بھی مطمئن نہیں ہوتا۔"

"اور رجائی بھی تو بالکل فضول ہوتا ہے۔ وہ بھی تو صرف دوسروں کی مصیبتوں کے روشن پہلو دیکھتا ہے، ان کی تصویر نہیں دیکھی کیا —— واللہ کیا عجیب

ہے کیا وبدبہ — خاص طور پر وہ دھاریوں والے کوٹ والی تصویر۔"

"ہمیں تو اتنا معلوم ہوتا ہے کہ دھاریوں والا کوٹ پہن کر وہ زیبرا معلوم ہوتا ہے —"

"ہوتا ہے نہیں ہوتے ہیں کہیے" وہ چلائے۔

"ہوتا ہے — ہوتا ہے — ہوتا ہے —" شیطان نے میز پر مکا مارا۔ دونوں اٹھ کھڑے ہوتے اور تھر تھر کانپنے لگے۔

"میرے ساتھ ذرا باہر چلو" وہ شیطان کا بازو پکڑ کر دھاڑے۔

"میرے ساتھ ذرا باہر چلو" شیطان اُن کی گردن پکڑ کر چیخے۔

ہم اُنہیں باہر لے آئے۔ روشن سڑکوں سے دور ایک تاریک سے گوشے میں اس ڈوئیل کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ شیطان نے اُن کی عینک کی طرف اشارہ کر کے کہا — "یہ کیا تم نے پہن رکھا ہے اپنی ٹماٹر جیسی ناک پر۔ اسے اُتار دو۔ ورنہ میں تمہیں پیٹنے سے انکار کرتا ہوں۔"

انہوں نے عینک زمین پر دے ماری۔

اب لڑائی شروع ہوئی۔ ہم نے ان دونوں کو دُور دُور لے جا کر چھوڑ دیا۔ اچھا خاصہ اندھیرا تھا۔ غالباً کامریڈ صاحب کی بینائی بھی شیطان کی طرح بے حد کمزور تھی۔ پہلے انہوں نے آستینیں چڑھائیں اور پھر ہوا میں مکے لہرائے ایک دوسرے کے قریب سے گزر گئے۔ کامریڈ نے دفعتاً ایک نعرہ بلند کیا اور ایک درخت کے تنے کو پیٹ ڈالا۔

"کدھر دفع ہو گئے —؟" انہوں نے اپنا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔

"اور تم کہاں ہو؟" شیطان بالکل اُن کے قریب سے گزرے۔

پھر دیکھتے دیکھتے شیطان تڑپے اور ایک سمت میں بھاگے۔ ہوا میں ایک مکا جو گھمایا تو وہ اتفاق سے کامریڈ کی کمر میں لگا۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا اور طیش میں آ کر چلائے "یہ مکا مجھے کس نے مارا ہے؟ تماشائی ایک طرف رہیں، اگر میں نے کسی کو شرارت کرتے دیکھ پایا تو بُرا سلوک کرونگا!"

ایک صاحب نے اشارہ کیا اور ہم میں سے باری باری ہر ایک ان کے قریب سے گزرتا۔ ان دونوں کی توجہ ہماری طرف زیادہ تھی۔ ہر پانچ منٹ کے بعد وہ چلا چلا کر ایک دوسرے سے پوچھتے "تم کہاں ہو؟" جواب ملتا "میں یہاں ہوں اور تم کہاں ہو؟" اس کے بعد کبڈی سی شروع ہو جاتی۔ ایک مرتبہ تو وہ مختلف سمتوں میں اتنی دور چلے گئے کہ ہم پکڑ کر واپس لائے۔

غرضیکہ آدھ گھنٹے تک وہ گھمسان کی لڑائی ہوئی کہ دونوں نے درختوں کو پیٹ پیٹ کر اپنے ہاتھ لہو لہان کر لئے۔ ساری لڑائی میں صرف ایک مکا کارآمد ثابت ہوا — جو شیطان کا تھا۔ اور کامریڈ صاحب کی کمر میں اتفاقاً جا لگا۔

اس کے بعد دیر تک دیا سلائیاں جلا جلا کر کامریڈ صاحب کی عینک ڈھونڈتے رہے۔

× × × × × × ×

شیطان بدنام ہوتے جا رہے تھے، لوگ شکایتیں کرتے کہ مغرور ہو گیا ہے پہچانتا نہیں، سامنے سے نکل جاتا ہے۔ دیکھ لیتا ہے اور سلام تک نہیں کرتا۔ سلام کا جواب نہیں دیتا۔

گھر میں بڑے پر بحث ہو رہی تھی۔ شیطان کا خیال تھا کہ پردہ

سرد ملکوں کے لئے نہایت مفید چیز ہے۔ نزلے زکام وغیرہ کے بچاؤ کا نہایت اچھا ذریعہ ہے۔ لیکن گرم ملکوں کے لئے اتنا مفید نہیں۔ گرم ملکوں میں وہ صرف سردیوں میں کرنا چاہئے، گرمیوں میں ململ کے لباس میں بھی اتنا برا حال ہو جاتا ہے برقع پہن کر نہ جانے کیا حالت ہوتی ہوگی جو لوگ پردے کے زیادہ حامی ہیں اور بہت شور مچاتے رہتے ہیں اُن سب کو جولائی اگست میں برقعہ پہنایا جائے اور ستمبر میں رائے پوچھی جائے۔ انہوں نے پردے کی تین قسمیں بھی بتائیں۔ پہلی قسم ہے گھر سے برقع لے کر نکلنا اور برقع کار یا تانگے میں رکھ دینا۔ دوسری قسم ہے برقعہ ہر وقت ساتھ لئے رکھنا۔ کندھے پر یا ہاتھ میں۔ تیسری قسم ہے سچ مچ برقعہ پہننا مگر اس طرح کہ سارا جسم برقعے میں چھپا ہوا ہو۔ سوائے چہرے کے۔ نقاب اُٹھا ہوا ہو، اور برقعے کا سیاہ حاشیہ چہرے کی دلآویزی میں اضافہ کر رہا ہو۔

باتیں ہو رہی تھیں کہ شیطان کے خالو آ گئے، وہ کچھ مہینوں سے باہر گئے ہوئے تھے۔ ہم اُٹھ کھڑے ہوئے۔ شیطان اُسی طرح بیٹھے سگریٹ کے کش لگاتے رہے۔ اُن کے خالو ذرا دور کرسی پر بیٹھے تھے۔ شیطان نے اُن کی طرف بڑے غور سے دیکھا اور بولے "معاف کیجئے حضرت میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔"

"ضرور دیکھا ہوگا۔"

"آپ کا چہرہ کچھ مانوس سا معلوم ہوتا ہے۔"

"سچ مچ ——؟"

"لیجئے سگریٹ پیجئے —— معاف فرمائیے میں چہرے یاد رکھ سکتا ہوں، نام یاد نہیں رکھ سکتا۔" شیطان نے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں اور خالو کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ شیطان کے خالو جو خفا ہوتے ہیں تو بس۔

پھر ایک اور تماشا ہوا۔ رات کو شیطان سفینہ کو بلانے اس کے گھر گئے، اور غلطی سے پڑوس کے کسی ویسے ہی مکان میں جا گھسے۔ نمبر تو انہیں نظر ہی نہیں آتے تھے۔ بس اندازاً مکانوں میں چلے جایا کرتے تھے۔ پھاٹک، میدان، برآمدہ —— عبور کرتے ہوئے اندر پہنچے —— ابھی حدود اربعے سے اچھی طرح واقف نہیں ہوئے تھے کہ آواز آئی: "کون ہے؟" اُس کے بعد کھسر پھسر ہوئی اور قدموں کی چاپ سنائی دی۔ شیطان نے اپنی طرف سے سفینہ کی امّی کے کمرے کا رُخ کیا جو مقابلتاً محفوظ جگہ تھی۔ کمرے کی تصویریں دیکھ کر انہیں شبہ سا ہوا۔ کہ شاید کسی اور کے گھر چلے آئے ہیں۔ ایک خوبصورت سی لڑکی کی تصویر دیکھ ہی رہے تھے کہ زبردست چنگھاڑ سنائی دی۔ "اچھا تو تم ہو" ایک عمر رسیدہ بزرگ ہاتھ میں لٹھ نما نازک سی چھڑی لئے داخل ہوئے۔

"تو تم ہی وہ لڑکے ہو جس نے ہم سب کی زندگی تلخ کر رکھی ہے یہ بتاؤ کہ تم چاہتے کیا ہو ——؟"

"باہر جانا چاہتا ہوں۔" شیطان تکتے رہ گئے۔ انہوں نے بزرگ کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

"میں نے سنا ہے کہ تم ہر ایک سے کہتے پھرتے ہو کہ تم لڑکی کو دیکھنا چاہتے ہو۔ آج تمہاری یہ ضد بھی پوری ہوئی جاتی ہے —— اے بی ادھر تو لاؤ اُس مقصود کو یہاں ——"

جیسا نام تھا ویسی ہی ایک لڑکی کمرے میں آ گئی۔

"تو یہ ہے وہ۔ اب اسے دیکھ لو سیچے کیا دیکھ رہے ہو۔ اس کی

طرف دیکھو۔"

شیطان دیکھنے لگے۔

"دیکھ چکے کیا؟"

"جی ہاں!"

"کیسی ہے؟ صاف صاف بتاؤ۔ ہی ہی ہی کیا کرتے ہو۔ بتاؤ کیسی ہے؟"

"جی کل بتاؤں گا۔"

"اچھا تم جاؤ۔" شیطان چلنے لگے۔

"نہیں تم نہیں میں نے لڑکی سے کہا ہے۔ اور یہ بتاؤ کہ تم اپنے عزیزوں کی طرف سے پیغام کیوں نہیں بھجواتے، یوں بدنام کیوں کرتے پھرتے ہو، اس طرح چوروں کی طرح گھر میں گھسنا شریف آدمیوں کا کام ہے کیا؟"

"جی آپ کی بینائی کمزور تو نہیں؟ — یا کہیں عینک تو نہیں کھوئی گئی —"

"اِدھر اُدھر کی باتیں مت کرو۔ میرے سوال کا جواب دو۔"

"جناب میں اس اعزاز کے قابل نہیں ہوں، میں شریف آدمی ہرگز نہیں ہوں، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تو ان لوگوں میں سے ہوں۔ جو شرابی، کبابی، اور جواری ہوتے ہیں۔"

اور ایسے سرپٹ بھاگے کہ دس پندرہ منٹ تک کمروں کے اندر ہی دوڑتے رہے، بڑی مشکل سے باہر نکلنے کا راستہ ملا۔

مجھے سب کچھ سنایا تو میں نے پوچھا کہ تم نے جھوٹ کیوں بولا۔ شیطان نے کہا۔ کہ وِمٹو اور جنجر کی بوتلوں میں الکحل کی ذرا سی مقدار ہوتی ہے۔ کباب ہم خوب کھاتے ہیں۔ اور برج بھی کھیلتے ہیں جو سراسر جوا ہے، لہٰذا ہم سب شرابی کبابی اور جواری ہیں۔

× × × × × × × ×

میں نے بہت مجبور کیا کہ خدا کے لئے کہیں سے عینک لگوا لو اور شریفوں کی زندگی بسر کرنے لگو، وہ ہر بار یہی کہتے کہ تم مجھے برا بھلا کہہ لو ڈانٹ لو، لیکن بس عینک کا ذکر مت کیا کرو، میرے دل کو صدمہ پہنچتا ہے۔ بڑی بحث کے بعد وہ مانے اور ایک عینک ساز کو نمبر دے آئے اگلے ہفتے ہم عینک لینے گئے۔ دکان میں میزوں پر انسانی شبیہیں اور مجسمے رکھے تھے جن کے چہروں پر عینکیں لگی ہوئی تھیں شیطان سیدھے ایک بڑے سارے مجسمے کی طرف گئے اور مسکرا کر بولے "آداب عرض، میری عینک تیار ہو گئی یا نہیں —" میں نے جلدی سے ان کا منہ دکاندار کی طرف کیا جو بالکل دوسری طرف تھا۔

عینک لگا کر وہ ضد کرنے لگے کہ موٹر سائیکل چلائیں گے۔ مجھے پیچھے بیٹھنا پڑا ہم کچھ دور ہی نکلے ہوں گے کہ وہ چلائے ہٹو، ہٹو۔ ایک طرف ہو جاؤ۔ موٹر سائیکل جھومی اور بڑے زوروں سے جھاڑیوں میں جا گھسی، ہم دونوں دور دور گرے۔ شیطان کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھے اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگے۔ "قبلہ معاف کیجئے۔ میں نے ہارن نہیں دیا تھا۔ ویسے آپ کو فٹ پاتھ پر چلنا چاہئے تھا۔"

میں نے انہیں ڈانٹا کہ مجھ سے یہ سب کچھ کیا کہہ رہے ہو جس سے ٹکرائے ہو اس سے کہو۔ ہم نے اس شخص کو بہت ڈھونڈا جس سے ٹکر

ہوئی تھی۔ مگر بریف کیس خالی پڑا تھا۔ غالباً شیطان کسی غیر مادی چیز سے بنا ہوا گئے تھے۔ مجھے تجسس سا ہوا۔ میں نے ان کی عینک اتار لی۔ جو دیکھتا ہوں تو سادہ شیشے لگے ہوئے تھے۔ میں نے قسم کھائی کہ خواہ وہ اپنی آنکھوں پر کولہو کے بیل والا چشمہ چڑھا لیں میں انہیں کچھ نہ کہوں گا۔

کچھ دیر بعد جب میں نے رضیہ کو کار میں اکیلے جاتے دیکھا تو شیطان کو خبر تک نہ دی۔ رضیہ کا اکیلے دکھائی دینا ایک عجوبہ تھا۔ ان دنوں اس کے ساتھ ہمیشہ باڈی گارڈ ہوتا تھا۔ چچا، ماموں، ماموں زاد بھائی چچا زاد بہن ——— کوئی نہ کوئی ضرور ہوتا۔

× × × × × × ×

ساڑھے چار بجے میں چائے پینے جج صاحب کے ہاں گیا تو وہاں چار بج کر تیس منٹ ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ حکومت آپا موٹر سائیکل چلانا سیکھ رہی ہیں، پڑوس کے وسیع صحن میں مشق فرما رہی ہیں۔ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ سب کہیں گئے ہوئے تھے۔ جج صاحب اکیلے بیٹھے فائلیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے کچھ کہا انہوں نے چپکے سے کچھ جواب دیا۔ کوئی آدھ گھنٹے تک ہم اسی طرح بیٹھے رہے۔ جج صاحب فائلیں دیکھنے میں منہمک رہے اور میں انہیں منہمک رہتے دیکھنے میں منہمک رہا۔ دفعتاً وہ چونکے ——— "چائے پیو برخوردار ———"

اور کچھ نئی فائلیں اٹھا کر پڑھنے لگے۔

کچھ دیر کے بعد پھر چونکے ——— "چائے پیو ——— پیتے کیوں نہیں؟"

میں نے بڑی ساری چائے دانی کو زور سے اٹھایا، وہ یک لخت اوپر چلی گئی۔ معلوم ہوا کہ خالی ہے۔ کھولا تو اندر صرف چائے کی پتیاں تھیں۔

"آخر تم چائے کیوں نہیں پیتے ———؟" انہوں نے خفا ہو کر کہا۔

"جی چائے دانی خالی ہے۔"

"اچھا ———؟" انہوں نے عینک اتار کر میز پر رکھے ہوئے برتنوں کا جائزہ لیا ——— "تو اس میں دودھ ہوگا، دودھ پیو۔"

میں نے جھانک کر دیکھا۔ دودھ بھی نہیں تھا۔ "جی دودھ بھی نہیں ہے۔"

"تو پھر ———" انہوں نے شکر دانی کی طرف اشارہ کیا۔ "تھوڑی سی چینی چکھو۔"

فائلیں ختم کر کے وہ بڑے ملائم لہجے میں بیروں پر خفا ہوئے مجھ سے بولے "چلو کلب میں چائے پئیں گے۔" کلب میں نہائت عمدہ چائے رہی۔ شکار کی باتیں ہوتی رہیں۔ جج صاحب کے متعلق کلب میں مشہور تھا کہ اگر کوئی ان سے صرف اتنا کہہ دے کہ پچھلے مہینے جب میں فلاں تالاب کے پاس سے گزرا تو وہاں ایک مرغابی بیٹھی تھی۔ تو وہ فوراً بندوق لے کر اس تالاب پر جا پہنچیں گے اور اس وقت تک منتظر رہیں گے جب تک وہ مرغابی واپس نہیں آتی۔ ان کے دوست ان کی نئی بندوق کی تعریفیں کر رہے تھے کہ اس بندوق کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سلو موشن میں فائر کرتی ہے اور گولی جاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ پہلے بندوق چلنے کی آواز آتی ہے پھر نشانہ خطا ہونے کی آواز۔ کیونکہ اتنی دیر میں جانور یا پرندہ چوکنا ہو جاتا ہے اور پینترہ بدل کر صاف بچا جاتا ہے۔

واپسی میں ان کی کار خراب ہو گئی۔ مجھے کہا گیا۔ کہ میں ہینڈل

لگاؤں۔ کافی محنت کے بعد موٹر سٹارٹ ہوئی۔ ابھی میں ہینڈل ہاتھ میں لئے یہی سوچ رہا تھا کہ یہ بار بار پھسلتا کیوں تھا کہ قریب سے آواز آئی اور کار میرے سامنے سے غائب تھی۔ سڑک کافی ویران تھی اس لئے دور تک میں ہینڈل ہاتھ میں لئے پیدل چلا۔ گھر پہنچ کر نجم صاحب نے جرح شروع کر دی۔ "تم کہاں رہ گئے تھے، لڑکوں میں یہ اچھل کود کی عادت بہت بری ہے چلتی موٹر سے ہرگز نہیں اترنا چاہئے اور یہ ہینڈل تمہارے ہاتھ میں کیوں ہے؟"

× × × × × × ×

کوٹھی کے دوسری طرف جا کر دیکھا تو شیطان اور ننھے میاں کو محوِ گفتگو پایا۔ ننھے میاں برش لئے ایک گائے کو سبز رنگ رہے تھے۔ یہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس سے پہلے انہوں نے ایک سفید مرغے پر ایشیا کا نقشہ بنایا تھا اور ایک گدھے کو پکڑ کر اس کے سر میں سینگ لگا دیئے تھے پاس ایک بلی بیٹھی تھی، جس کی طائم جلد سے وہ برش پونچھتے، یہ بلی اکثر کیسی کلر میں رنگی ہوئی پائی جاتی، لوگ بڑے شوق سے اسے دیکھتے اور قیاس آرائیاں کرتے۔

ننھے آج تمہاری رضو آپا کیسی لگ رہی تھیں؟ شیطان نے پوچھا

"جیسی لڑکیاں لگا کرتی ہیں — فقط آج ان کی قمیص نہایت اچھی تھی —"

"ننھے تمہارے لئے اس اتوار کو کیا لاؤں —؟"

شیطان ہر اتوار ننھے کو رشوت دیتے۔ جو چیز دیتے اسے اگلے اتوار تک چپکے سے چرا لیتے اور پھر الٹا ننھے کو ڈانٹتے کہ کہاں گئی۔

"بتاؤ تمہیں کیا چیز پسند ہے؟"

ننھا سوچ کر بولا — "مجھے بیوک کا نیا ماڈل بہت پسند ہے۔"

بیگم آ رہی تھیں، ننھے نے برش ایک طرف پھینکا، رنگ چھپا دیئے، گلاس اور بلی کو شست کہہ کر بھگا دیا۔ اور کتاب کھول لی۔

"اُفوہ بیٹا پڑھ رہا ہے" بیگم بولیں۔ "روفی میاں تم اس سے کچھ سوال بھی تو کیا کرو۔"

جب بیگم آتیں ہمیں خواہ مخواہ ننھے کا امتحان لینا پڑتا۔

"ننھے اُلو کی جمع کیا ہے؟"

"اُلو ہا سئے"

"غلط"

"تو پھر اُلوجات، اُلواں، اُلیات —"

"غلط — اچھا اسے فقرے میں کیونکر استعمال کرو گے۔ فرض کیا تمہیں دو اُلو درکار ہیں، دکاندار کو خط لکھو۔"

ننھے نے یہ خط لکھا — جناب من!

بعد آداب کے عرض ہے کہ میں خیریت سے ہوں اور خیر و عافیت آپ کی خداوند کریم سے نیک مطلوب ہوں، دیگر احوال یہ ہے کہ مجھے ایک اُلو کی سخت ضرورت ہے اگر تکلیف نہ ہو تو مندرجہ ذیل پتے پر ایک عدد اُلو وی پی کر دیجئے۔

فقط

اور ہاں میں بھول ہی گیا تھا، اگر ہو سکے تو پہلے اُلو کے ہمراہ ایک اور اُلو بھی بھیج دیجئے۔

بیگم کو یہ خط پسند نہیں آیا۔ "اسے کچھ لکھنے کا کام دو۔" وہ بولیں۔

ہم نے اسے ترجمہ کرنے کو دیا سٹیفن لی کاک کی کتاب سے۔ ننھے نے نہایت سلیس ترجمہ کیا۔ یہاں تک کہ آخر میں مصنف کے نام کا بھی ترجمہ کر ڈالا اور لکھا "سٹیفن کی مرغ ـــ!"

"بیٹے بڑے ہو کر تم کیا بنو گے؟" بیگم نے بڑے فخر سے پوچھا

"جی میں پہلے تو ایم۔ اے کروں گا اس کے بعد پہلی جماعت میں پھر داخل ہو کر دوبارہ ایم۔ اے تک پڑھوں گا ـــ یعنی ڈبل ایم۔ اے کروں گا۔ اس کے بعد وکالت پڑھ کر خفیہ مشق کیا کروں گا۔"

"خفیہ مشق ـــ؟"

"ذاتی مشق!" ننھے میاں نے جواب دیا۔

"وہ کیا ہوتی ہے؟"

"پرائیویٹ پریکٹس! ـــ ترجمہ کیا ہے۔" ننھے میاں بولے

"کچھ مستورات آ رہی ہیں۔" ملازم نے بتایا

"بھائی جان مستورات کا واحد کیا ہوتا ہے؟"

"مستور۔"

"واہ ـــ یہ بھی کبھی سنا ہے کہ ایک مستور آ رہی ہے!"

خواتین آئیں جنہیں ہم نے تو پہچان لیا لیکن شیطان یونہی ہوائیں تکتے رہے ـــ "یہ کون لوگ ہیں؟" انہوں نے بڑی بے اعتنائی سے پوچھا۔

"پہچانتے نہیں؟ تمہارے خالو کی لڑکیاں ہیں ـــ" بیگم بولیں

بیگم جب کبھی شیطان کے خالو کی چھ لڑکیوں کو لے کر نکلتیں تو شیطان کہا کرتے "وہ آ رہی ہیں بیگم مع چھ تکبیروں کے۔" بیگم چاہتی تھیں کہ رات کا کھانا ہم وہیں کھائیں ـــ "آج تمہارے لئے حلوؤں کا انڈا پکا ہے۔"

سامنے باورچی خانے میں ایک بلی بڑے مزے سے دودھ پی رہی تھی اور شیطان کے خالو کی سب سے چھوٹی لڑکی پاس کھڑی اپنے رنگین ناخن دیکھ رہی تھی۔ بیگم چلائیں۔ "ارے بلی! ذرا پیچھے مڑ کر دیکھنا وہ ننھی دودھ پی رہی ہے۔"

وہ سب چلے گئے۔ تو شیطان نے ننھے سے رضیہ کی باتیں شروع کیں۔ ننھا ان دنوں بد تمیز ہوتا جا رہا تھا۔ اگر وہ رضیہ کا چھوٹا بھائی نہ ہوتا تو ہم ہر روز حسب توفیق اس کی مرمت کیا کرتے۔ شیطان نے بتایا کہ ہفتہ ہوا کسی شخص نے خواب میں ان کی ہتک کی ہے۔ انہیں برا بھلا کہا ہے، اور بڑے زور سے ان کے مکا بھی مارا ہے۔ وہ ہر رات یہ نیت کر کے سوتے ہیں کہ اگر وہ شخص انہیں خواب میں مل گیا تو مار مار کر اس کا ستیاناس کر دیں گے۔

"بھائی جان کیا بہت زور سے مکا مارا تھا اس نے؟" ننھے نے پوچھا۔

"ہاں بہت زور سے"

"اتنے زور سے کیا ـــ؟" ننھے میاں نے ایک مکا شیطان کی کمر میں رسید کیا۔ شیطان کچھ دیر اپنے ہونٹ چباتے رہے پھر ننھے کے قریب جا کر بولے "اتنے زور سے نہیں۔ اتنے زور سے۔" ادھر ننھے میاں نے ایک زبردست نعرہ بلند کیا۔ پیشتر اس کے کہ کوئی موقع

پہنچا شیطان نے زور زور سے ننھے کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ "اوپر چڑھ گئے اونچے درختوں پر پاؤں نہ پھسلے گا تو اور کیا ہوگا۔ اچھا ہوا گر پڑے۔" بیگم دوڑی دوڑی آئیں۔ ننھے کی ایک ٹھُسّی گئی اور اُسے خوب دھمکایا چمکایا گیا۔

× × × × × × ×

دن گزرتے جا رہے تھے۔ شیطان کا جوش و خروش جیسا اُن تینوں لڑکیوں کے لئے تھا ویسا ہی رضیہ کے لئے تھا۔ یا یوں کہ جیسا جوش و خروش رضیہ کے لئے تھا ویسا ہی ان تینوں لڑکیوں کے لئے تھا۔ ہر روز ان کے ارادے بدلتے رہتے۔ رضیہ مغرور ہے اور پروا نہیں کرتی اس لئے ٹریسا سے شادی بہتر رہے گی۔ خصوصاً جب اس کی بائیں آنکھ اتنی پیاری ہے ——— رحیمہ کے قہقہے نہایت سریلے ہیں اور ہمیشہ ہنستی رہتی ہے۔ وہ یقیناً بہتر بیوی ثابت ہوگی ——— پرانی محبت پھر بھی پرانی محبت ہے، جو جذبات رضیہ کے لئے ہیں وہ کسی اور کے لئے نہیں ہو سکتے ——— سفینہ کی بہنیں کتنی خوبصورت ہیں، سفینہ سے شادی کرنا کس قدر مفید ہوگا۔

ہر روز وہ غلط جگہوں پر چلے جاتے، غلط لوگوں سے اُلجھ جاتے صحیح لوگوں کے قریب سے گزر جاتے۔ سائیکل کے حادثے نہایت باقاعدگی کے ساتھ ہوتے۔ لیکن انہوں نے عینک لگوائی تھی نہ لگوائی۔

× × × × × × ×

ادھر وہ لڑکیاں شیطان کی اس کمزوری سے واقف تھیں وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ میں جان بوجھ کر خاموش رہتا ہوں۔ ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ وہ شیطان کے ساتھ آجاتیں، بقیہ شامیں اور لڑکوں کے ساتھ گزارتیں۔ جب کبھی کوئی خاص تقریب ہوتی تو وہ ان مشہور گرامی حضرت کے ساتھ نکلتیں جن کے پاس کار تھی۔ ان کے جاننے والوں میں سے ایک صاحب گویّے تھے جو ریڈیو پر پکے راگ گاتے تھے، ان کا رنگ بھی پکا تھا۔ سنا تھا کہ ان کی آنکھیں نشیلی تھیں، چونکہ وہ ہر وقت آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے رکھتے تھے۔ اس لئے ہم ان کی نشیلی آنکھوں سے مستفیض نہ ہو سکے۔ ایک بیمہ کمپنی کے ایجنٹ بھی تھے جو ہمیشہ تانگہ ساتھ لایا کرتے تھے اور بار بار جتاتے کہ وہ خود بیمہ شدہ ہیں، تانگہ بیمہ شدہ ہے یہاں تک کہ گھوڑا بھی بیمہ شدہ ہے۔ افواہ تھی کہ ان کے بال گھنگریالے ہیں۔ لیکن صد حیف کہ جب کبھی ہم نے انہیں دیکھا گنجا پایا۔ ایک صاحب طالب علم تھے جو سفینہ کے ہم جماعت تھے اور کرائے کی سائیکل پر آیا کرتے تھے۔ اور بار بار گھڑی دیکھتے رہتے۔

بعض اوقات سینما دیکھتے دیکھتے ایک لڑکی شیطان سے اجازت مانگتی کہ پچھلے درجے میں اُس کی خالہ بیٹھی اس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہیں اس لئے وہ اُن کے پاس جانا چاہتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد ہم اُسے کسی لڑکے کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھتے۔ یہ چیز بار بار دوہرائی جاتی۔ چائے کے وقت تو کیفے میں ضرور کسی نہ کسی کی امی یا ممانی آجاتیں۔ شیطان بڑی خندہ پیشانی سے انہیں رخصت کرتے اور اُن کی امی جان یا خالہ جان کی خدمت میں آداب بھی بھجواتے جس کی رسید اگلے روز ملتی۔

ان جاننے والوں کو وہ یا تو سہیلیاں کہہ کر یاد کرتیں اور یا کزن کہہ کر۔ ہمیں اکثر بتایا جاتا کہ آپ ابھی گھر چھوڑ کر نکلے ہی ہوں گے کہ ہماری ایک کار

والی سہیلی آگئی۔ یا یہ کہ ہم فلاں باغ میں گئے وہاں ایک سہیلی نے نہایت دردبھرا گانا سنایا۔ فلاں سہیلی کو ہم نے سائیکل پر بھیجا کہ فلاں دکان سے چاکلیٹ لائے۔ سفینہ کے گھر دن بھر تیسرے روز تانگہ لے آتے ہیں۔

کبھی کبھی شیطان کو یوں بھی شبہ ہو جاتا۔ "کل آپ کسی لڑکے کے ساتھ موٹر سائیکل پر جارہی تھیں"

"نہیں تو ۔۔۔ وہ لڑکا تو نہیں تھا وہ تو میرے چچا تھے، آپ نے ان کی فرینچ کٹ داڑھی نہیں دیکھی کیا"

شیطان شرمندہ نہیں، شاید لڑکے کے گلے کا سکارف دکھائی دیا تھا مسکرا دیتے اور کہتے "اوہ کیسی غلط فہمی ہونے لگی تھی" پھر کسی اور سے پوچھتے "پرسوں شام کو آپ ایک لڑکے کے ساتھ کار میں جارہی تھیں ۔۔۔؟"

"لڑکے کے ساتھ؟" وہ بڑے تعجب کے ساتھ کہتی: "لڑکا کہاں تھا، لڑکی تھی۔ میری چچازاد بہن۔ بڑی آپا۔ وہ دوپٹہ کبھی سر پہ نہیں رکھتیں۔ اور اُن کے بال بھی تراشیدہ ہیں"

"میں بھی کیا ہوں ۔۔۔؟" شیطان ایک لعوا کے ساتھ کہتے۔ "اور پھر ان دونوں لڑکوں اور لڑکیوں میں فرق کیسے معلوم ہوتا ہے۔ ایک سے چست رنگین لباس، ایک وضع کے بنے ہوئے بال، ویسی ہی خوشبو کی لپٹیں، یہاں تک کہ ناموں سے بھی پتہ نہیں چلتا کہ رفعت، شوکت حشمت، اور طلعت میں لڑکے کون سے ہیں اور لڑکیاں کون سی"

× × × × × × ×

جج صاحب کے ہاں بھی ان لڑکیوں کا ذکر آجاتا۔ ایک دفعہ بیگم نے پوچھا: کہ تمہارے ساتھ وہ تین لڑکیاں کون ہوا کرتی ہیں؟

"جی وہ میری سہیلیاں ہیں:" شیطان نے جواب دیا۔

جج صاحب نے بھی پوچھا: "سنا ہے کہ تم آجکل کچھ لڑکیوں کے ساتھ دیکھے جاتے ہو"

"جی ہاں! ابھی تک تو صرف تین لڑکیاں ہیں۔ شاید کچھ دنوں تک آدھ کا اور اضافہ ہو جائے"

وہ پائپ کے کش لگاتے رہے: "جب میں یورپ میں تھا تو میں بھی لڑکیوں کو ساتھ لے جایا کرتا تھا لیکن ایک وقت صرف ایک لڑکی ہوتی تھی، تمہاری طرح ریوڑ لے کر نہیں نکلتا تھا"

پھر کچھ دیر سوچ کر بولے: "یہ بتاؤ کہ تم اس ملک میں لڑکیوں سے دوستی کیونکر کر لیتے ہو۔۔؟"

شیطان دیدے مٹکا کر بولے: "جناب یہ گر میں ہر ایک کو نہیں بتا سکتا۔ یہ اُستادی شاگردی کا معاملہ ہے"

"اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ آہم۔ وہ ذرا ۔۔ تمہاری گھڑی میں کیا بجا ہے ۔۔؟" وہ گلا صاف کرتے ہوئے بولے۔

حکومت آپا نے پہلے تو لڑکیوں کو دیکھا پھر شیطان کی طرف دیکھ کر بڑی حقارت سے بولیں: "جیسی روح ویسے فرشتے"

رضیہ کو علم تھا لیکن اس نے کبھی ذکر تک نہیں کیا۔

کبھی رضیہ شیطان سے اچھی طرح باتیں کر لیتی تو وہ کئی دنوں تک یہ شعر بار بار پڑھتے۔

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں ۔۔۔ تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

ہر اتوار کو تینوں لڑکیوں کو علیحدہ علیحدہ یہ شعر سنایا جاتا۔

انجامِ محبت ہے ہر حال میں رسوائی
کچھ اس کا سبب چُھپ کے کچھ اس کا سبب باتیں

ایک دن شیطان کو نہایت شدید رومانی دورہ اٹھا اور انہوں نے عجیب الٹی سیدھی حرکتیں کیں۔ پہلے تو جج صاحب کے سامنے اکبر کا یہ شعر پڑھ دیا۔

میں ہوا رخصت اُن سے اے اکبر
وصل کے بعد تھینک یو کہہ کر

ابھی وہ اچھی طرح خفا بھی نہ ہوئے تھے کہ بیگم کے سامنے بہک گئے۔ بیگم چالیس سال پہلے کے قصے سنا رہی تھیں کہ لڑکپن میں وہ ایسی تھیں، چہرہ یوں جگمگایا کرتا، آنکھیں ایسی تھیں، زیور اس طرح پہنا کرتی، شاعری کا بھی شوق تھا۔ یہ تھا وہ تھا۔

شیطان ایک ٹھنڈا سانس کھینچ کر بولے "کاش کہ میں آپ سے پہلے ملا ہوتا۔"

اس کے بعد رضیہ کا نمبر آیا۔ میں چھپ کر سن رہا تھا۔ پہلے رضیہ کی تعریفیں ہوئیں، زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ پھر لگے ہاتھوں اظہارِ محبت بھی کر ڈالا، اور بالکل وہی الفاظ دہرائے جنہیں رضیہ چند سال پہلے سن چکی تھی۔

"میں محبت کے تمام معیاری طریقے آزما چکا لیکن تم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔"

رضیہ حسبِ معمول اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی کہ موسم پہلے سے بہتر ہو گیا ہے، فلمیں فضول سی لگی ہیں۔ چاکلیٹ کہیں نہیں ملتے۔ جب شیطان کا اصرار بڑھا تو اس نے کہا کہ لڑکے آج کچھ کہتے ہیں اور محض چند برسوں میں بدل جاتے ہیں۔

"میں بھلا کیونکر بتا سکتا ہوں کہ اگلے سال میرے خیالات کس قسم کے ہوں گے۔ مستقبل کے متعلق تو صرف ولی اللہ ہی پیشین گوئی کر سکتے ہیں۔ البتہ میرا ماضی تم جانتی ہی ہو۔ رہا حال، سو وہ تم پر عیاں ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے رضیہ کا ہاتھ پکڑ کر پامسٹری کی اور دیگر کی باتیں کر چکنے کے بعد کہا "مگر یہ سارا ہاتھ تو میرا ہے۔"

"لیکن آپ مجھے بہت تھوڑا جانتے ہیں۔"

"میرے خیال میں میں تمہیں کافی جانتا ہوں۔ تم قبول صورت ہو، سگھڑ ہو، امورِ خانہ داری میں ماہر ہو، سلیقہ شعار ہو، پیتے کھاتے خاندان کی لڑکی ہو۔ تم سے بہتر لڑکیاں بھی میں نے دیکھی ہیں مگر دنیا میں رضیہ صرف ایک ہی ہے۔"

"اُف وہ! مغرب کی اذان ہو چکی ہے۔" رضیہ بولی۔

"اور تمہارے نظریے مولویانہ ہیں۔ تم غلط ملک میں آ گئیں تمہیں عرب میں ہونا چاہیے تھا۔ خیر اب بھی دیر نہیں ہوئی، جا حج کرو، شرعی کپڑے پہنو، حافظ ہو، نمازیں پڑھاؤ، اذانیں دو۔

وہ اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں"

شیطان بڑے خوش خوش ملے، پوچھا کیسے رہے؟ بولے۔ جو کچھ دل

میں تھا کہہ دیا، پوچھا۔ ہاں ہوئی یا نا۔؟ بولے۔ یقیناً نا ہوئی۔

× × × × × × ×

شیطان کی سالگرہ آئی۔ پک نک کا پروگرام بنا کہ شہر سے باہر جو جھیل ہے اور باغ ہے وہاں دن گذارا جائے۔ ان تینوں لڑکیوں کی تین اور سہیلیاں آ رہی تھیں۔ اس لئے شیطان بڑے مسرور تھے۔ ہم گراموفون ریکارڈ چھننے لگے انہوں نے اصرار کیا کہ "وائی ہیوز کِک ووِمن" والا ریکارڈ ضرور ساتھ لے چلیں۔

"کل وہاں تینوں چیزیں ہوں گی موسیقی ہوگی خمار ہوگا اور لڑکیاں ہوں گی۔"

نوکر ہاتھ میں فہرست لئے حساب لگا رہا تھا "چار درجن سینڈوچ ہوں گی اور تین بڑے کیک۔"

"اور لڑکیاں ہوں گی۔" شیطان آسمان کی طرف دیکھ کر بولے

"دو سیر مٹھائی، پندرہ انڈے اور تین درجن مالٹے ہوں گے۔" نوکر پنسل سے لکھتا جا رہا تھا۔

"— اور لڑکیاں ہوں گی۔" شیطان نے ٹھنڈا سانس لیا۔

صبح صبح ہم انہیں لینے گئے تینوں نئی لڑکیاں بھی معتک نکلیں۔ پہلے انہوں نے بغیر فریم کی عینکیں لگا رکھی تھیں۔ سب لڑکیوں کے چہروں پر بلا کا نکھار تھا غضب کی تازگی تھی۔ چہرے خوب چمک رہے تھے عینکیں بھی چمک رہی تھیں۔ آسمان پر بادل تھے، ہمارے پہنچتے پہنچتے ایک دو مرتبہ بارش ہوئی، پھر بڑی تیز دھوپ نکلی۔ ہم کچھ بھیگے کچھ پسینہ آیا۔ اب جو غور سے انہیں دیکھتے ہیں تو عجب حلیہ بنا ہوا تھا۔ سارا میک اپ اتر چکا تھا۔ پہلی مرتبہ ان کی اصلی شکلیں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کریمہ کی ہلکی ہلکی مونچھیں نظر آ رہی تھیں۔ رحیمہ کے ہلکے ہلکے گل مچھ تھے جیسے تصویروں میں مغل بادشاہوں کے ہوتے ہیں۔ سفینہ بھویں اکھیڑتی تھی۔ چنانچہ اس کی خود ساختہ بھوؤں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ نئی لڑکیوں کے چہروں پر بھی کئی ایسے نقوش ابھر آئے تھے جو پہلے پوشیدہ تھے۔ بہار اگرچہ کچھ سرکس سا معلوم ہو رہا تھا جس میں ہر نمبر اور ہر سائز کی شخصیتیں موجود تھیں۔ لڑکیوں میں جس کی شکل بہت اچھی تھی وہ دبلی بہت زیادہ تھی اور قد نہایت لمبا تھا جس کی مسکراہٹ حسین تھی وہ فربہ بہت تھی۔ جو سمارٹ معلوم ہو رہی تھی وہ ویسے بجھی بجھی ہوئی تھی۔ جس کی باتیں بہت اچھی تھیں وہ بہت ہی چھوٹی تھی۔ غرضیکہ ایک لڑکی بھی نارمل نہیں تھی۔

ادھر شیطان بار بار مجھے تاکید کرتے کہ ہر ایک سے باتیں کرو، ہر ایک کی طرف باری باری متوجہ ہو۔ میں نے انہیں بتایا کہ اس طرح اپنی توجہ پانچ پر تقسیم کر کے برابر برابر بانٹنا کسی انسان کے لئے تو نہایت مشکل ہے البتہ ایک حقہ یہ فرض بخوبی سرانجام دے سکتا ہے۔

ہم مچھلیاں پکڑنے بیٹھے لڑکیاں شور مچا رہی تھیں۔ کسی نے خاموش ہونے کو کہا کہ کہیں مچھلیاں نہ بھاگ جائیں۔

"آپ ضرور شور مچائیے۔" شیطان نے جھیل میں اپنے خدوخال دھوتے ہوئے کہا۔ "ان کمبختوں کو کسی طرح تو پتہ چلے کہ ہم انہیں پکڑنے آئے ہیں۔"

بارش کا ایک اور چھینٹا پڑا۔ ہم سب درختوں کی طرف بھاگے۔ شیطان صبح سے ایک نئی لڑکی کو بڑی عجیب طرح سے دیکھ رہے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ تھے۔

"یہ آج تو بالکل مون سون کی قسم کی بارش ہو رہی ہے۔" وہ بولی

"مون سون میں بھی مون کیسا ہوتا ہوگا۔" شیطان کچھ اور نزدیک ہو گئے۔ "چلئے وہاں چلیں، یہ درخت تو ٹپک رہا ہے۔ لائیے میں آپ کا بٹوہ تھام لوں۔ بوجھل معلوم ہو رہا ہوگا۔"

اس نے بٹوہ دیدیا۔

"یہ درخت بھی لیک کر رہا ہے چلئے" شیطان نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ "شکریہ، مجھے اپنا ہاتھ بوجھل نہیں معلوم ہو رہا۔"

بارش رُکی، تو شیطان نے چیزیں گرم کرنے کے لئے لکڑیوں کا چولھا بنایا۔ جب آگ جلائی گئی تو چولہا بھی جل گیا اور کئی چیزیں بکھر گئیں۔ شیطان کو سالگرہ کی مبارک باد ملی۔ چھوٹے موٹے تحفے بھی ملے وہ کہنے لگے کہ کل تک وہ صرف اتنے سال کے تھے اور آج اتنے سال کے ہو گئے، صرف ایک رات میں سال کا فرق پڑ گیا۔ یہ خوشی کا نہیں افسوس کا مقام ہے۔ پھر اس نئی لڑکی کی طرف دیکھ کر بولے "میں دنیا میں ہر چیز سے گریز کر سکتا ہوں، سوائے ترغیب کے گستاخی معاف آپ کی شادی کب ہو رہی ہے؟"

"میری منگنی ہو چکی، میرے کزن کے ساتھ۔"

"وہ کیا کرتے ہیں۔"

"ان کے والد لکھ پتی ہیں۔"

"اخوہ! تو کیا آپ نے محض دولت کے لئے۔"

"اخوہ! ہاں میں نے محض دولت کیلئے ——— اور پھر اس ملک میں رومانی، مثالی، زبردستی کی، اپنی پسند کی۔ خواہ کیسی بھی ہوں سب شادیاں دو تین سال کے بعد ایک جیسی ہو جاتی ہیں۔"

"اور آپ شادی کب کر رہی ہیں؟" شیطان نے دوسری نئی لڑکی سے پوچھا۔

"میں شاید کبھی نہیں کروں گی۔"

"کیوں؟"

"مجھے نوکروں، گھر کے حساب کتاب، دھوبیوں اور بچوں سے سخت نفرت ہے۔"

"بچوں سے کیوں نفرت ہے؟"

"اس لئے کہ مجھے پالتو جانوروں اور پرندوں سے بھی نفرت ہے"

"اور آپ کی شادی کب ہو رہی ہے؟" کریم نے شیطان سے پوچھا۔

"ہاں ہاں بتائیے کب ہو رہی ہے؟" سب ایک دم بولیں

"پہلے اپنے ایک کان میں انگلی ڈال لیجئے پھر بتاؤں گا۔"

"وہ کیوں؟"

"کیونکہ بات ایک کان سے سنی جاتی ہے اور دوسرے سے اُڑائی جاتی ہے۔"

"نہیں یہ تو ہم کسی کو بھی نہیں بتائیں گے۔"

دراصل یہ راز شیطان انہیں بتاتے تو چند دنوں میں ہر جگہ مشہور ہو جاتا۔ اگر کسی اور کو نہ بتانے کی تاکید کی جاتی تو اور بھی جلدی بات اُڑتی. ایک دفعہ شیطان نے غلطی سے لڑکی کی امی کی بجائے لڑکی کو یہ پیغام بھیج دیا کہ مجھے اپنی فرزندی میں قبول فرمائیے۔ لڑکی بے حد خفا ہوئی۔ شیطان نے یہ

بات کریمہ کو بتائی اور تاکید کی کہ کسی ا... کو مت بتانا۔ اس نے رحیمہ کو بتائی اور کہا کہ ہرگز کسی اور کو مت بتانا۔ چلتے چلتے یہ بات شیطان تک پہنچی اور جس عقل مند نے شیطان کو بتائی اس نے انہیں بھی تاکید کی کہ کسی اور کو مت بتانا۔

"میں مستقبل سے نہیں گھبراتا بلکہ مستقبل مجھ سے ڈرتا ہے۔" شیطان منہ پھلا کر بولے "مگر حقیقت یہ ہے کہ شادی اور چیز ہے اور محبت اور چیز۔ ادھر شادی کے بعد عاشق کی حالت نہایت خستہ ہو جاتی ہے۔ ناناً فرتولیس نے کہا ہے کہ عاشق پہلے بوسے کے لئے جدوجہد کرتا ہے، دوسرا بوسہ جیتتا ہے، تیسرے کے لئے منت سماجت کرتا ہے، چوتھا قبول کرتا ہے، پانچواں چھٹا ساتواں، آٹھواں اور باقی کے سب بجبر برداشت کرتا ہے۔"

"بالکل غلط ہے" سفینہ بولی "اور رحیمہ وہ تمہارا کزن"

"میرا کزن کیوں ہوتا تمہارا ہوگا"

"واہ ملنے تو وہ تم سے آیا کرتا ہے۔ کریمہ کے دونوں کزنوں کے ساتھ۔"

"تعجب ہے" ایک نئی لڑکی بولی "کریمہ کا تیسرا کزن سفینہ کے کزن کو بھی کریمہ ہی کا کزن سمجھتا ہے اور وہ اسے یہی سمجھتا ہے۔"

"خواتین! خواتین!!" شیطان بولے "ہم سب ایک دوسرے کے کزن ہیں۔ ہم حضرت آدم کی اولاد ہیں۔"

اتنے میں نوکر نے مژدہ سنایا کہ چائے کی پتیاں گھر رہ گئیں۔ شیطان نے نوکر کو تلاش میں ایک سمت روانہ کیا اور خود دوسری سمت نکلے۔ میں پگڈنڈیاں چن رہا تھا۔ لڑکیاں گھاس پر بیٹھی باتیں کر رہی تھیں میرے کان ان کی طرف تھے۔

نئی لڑکی کہہ رہی تھی "یہ روفی بالکل یونہی ہیں۔ خاک بھائی نہیں دیتا، آج کریمہ دیر تک سامنے کھڑی ہو کر منہ چڑاتی رہی انہیں پتہ ہی نہیں چلا۔ بس یونہی دیکھتے رہے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ سنی سنائی باتوں کا یقین نہیں کرتے اور چشم دید واقعات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"اور جو یہ دوسرے صاحب ہیں۔ کتنے عجیب سے ہیں بس اپنی ہی دنیا میں بستے ہیں۔"

"خیر۔ عجیب تو نہیں ہیں" نئی لڑکی نمبر دو بڑے ترقی پسند انداز میں مسکرائی۔

"یہ سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ روفی کسی جج وج کے ہاں جاتا ہے یہ بھی کسی مجسٹریٹ کے ہاں جاتا ہوگا۔ یہ سب اول نمبر کے ہرجائی لوفر ظالم ہوتے ہیں، ہر لڑکی سے فلرٹ کرنے کو تیار ہیں بس کسی طرح موقع مل جائے لیکن عاشق صرف اس پر ہوتے ہیں جو ان کی پہنچ سے باہر ہو۔ ان کا رویہ بالکل وہی ہوتا ہے کہ ووٹ دیتے وقت غلام محمد صاحب کا خیال رکھے لیکن ووٹ میاں محمد حسین ہی کو دیجئے اور محبوب پر بھی تب تک عاشق رہتے ہیں جب تک وہ پہنچ سے باہر ہو، پھر جب شادی کا موڈ آتا ہے تو سب کو چھوڑ چھاڑ کر کسی خان بہادر کے ہاں پیغام بھجواتے ہیں اور ایسی بھیگی بلی بن جاتے ہیں۔ جیسے پہلے کسی لڑکی سے بات تک نہیں کی۔"

"تم روفی کی برائیاں کیوں کرتی ہو، اگر یہ اتنا ہی برا ہے تو اس کے

ساتھ کیوں پھرا کرتی ہو۔؟"

"اس لئے کہ یہ بے حد دلچسپ ہے۔ بس اس میں صرف یہی ایک خوبی ہے۔"

"اور وہ تمہارا کار والا، وہ گویا، اور وہ تانگے والا۔"

"کار والا مغرور اور خود پسند سا ہے، اس کے ساتھ ہم صرف کار کی وجہ سے جاتی ہیں ورنہ وہ ہمیں کچھ زیادہ پسند نہیں۔ اگر موڈ اچھا ہو تو وہ گویا بہت اچھا رفیق بنتا ہے اور اگر اداس ہوں تو وہ تانگے والا خوب ہے کم بخت اور بھی اداس کر دیتا ہے۔ وہ طالب علم بیوقوف ہے ادھر ادھر کے کام بخوشی کر دیتا ہے۔ بازار سے چیزیں سستی خرید لاتا ہے۔"

شیطان چاء کی جگہ نہ جانے کس نشہ آور چیز کی پتیاں لے آئے پی کر خمار سا چڑھ گیا۔ جب واپس روانہ ہوئے تو سب ایک دوسرے سے بیزار تھے۔ شیطان بیزار بھی تھے اور تھکے ہوئے بھی۔

"میرے داہنے پاؤں میں درد ہو رہا ہے۔" سفینہ بولی۔

"میرے بھی داہنے پاؤں میں درد ہے۔" شیطان نے جواب دیا۔

"میرے کان میں کچھ عجیب سا ہوتا ہے۔" نئی لڑکی بولی

"میرے کان میں بھی بالکل ویسا ہی ہوتا ہے۔"

"میرے ---" رحیمہ نے شروع کیا۔

"جی میرے بھی ---" شیطان جلدی سے بولے

گھر پہنچ کر میں نے شیطان سے کہا کہ یہ چھوٹے موٹے سیکنڈ ہینڈ معاشقے انہیں زیب نہیں دیتے۔ انہوں نے قصوروار رضیہ کو ٹھہرایا۔ ہر لڑکی پر وہ اس لئے عاشق ہو جاتے ہیں کہ انہیں رضیہ کی محبت نہیں مل سکی۔ دراصل ہر معاشقے میں انہیں رضیہ ہی کی محبت جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے نہایت دلدوز انداز میں یہ شعر پڑھا۔

تجھ سے چھٹ کر اوروں سے بھی جھوٹا سچا پیار کیا
وہ بھی تیرے عشق کے حیلے یہ بھی تیرے غم کے بہانے

× × × × × × × ×

جج صاحب کے ولائت جانے کی افواہ خبر میں تبدیل ہو چکی تھی۔ پھر کسی نے بتایا کہ وہ عنقریب پاسپورٹ بنوانے والے ہیں انہوں نے اپنی بڑی کار فروخت کر دی ہے کہ باہر سے کوئی نیا ماڈل لائیں گے بیگم کے لئے ایک نہایت چھوٹی سی کار خریدی گئی تھی۔ جو دراصل اسسٹنٹ کار تھی۔ ننھے میاں ضد کر کے اسے سائیکل سٹینڈ پر کھڑا کرتے اور گیراج میں بھینس بندھوا تے۔ ان کا یہ بھی اصرار تھا کہ اس کار کے لئے ایک سائڈ کار بھی خریدی جائے۔

شیطان کا دن بدن برا حال ہوتا جا رہا تھا۔ انہیں یقین ہو چلا تھا کہ جج صاحب جائیں نہ جائیں رضیہ ضرور ولائت جائے گی اور پھر وہیں رہ جائیگی۔ انہوں نے بڑی منتوں کے بعد مجھے سراغ لگانے بھیجا۔ بیگم کمرے صاف کروا رہی تھیں --- "سارے روشن دین کھول دو تاکہ گرد نکل جائے، یہ بوروں کی کوئی بھی اٹھاؤ اور یہ خالی بوتلیں کی سوڈا لیں یہاں کیا کر رہی ہیں --- یہ سب کچھ یہاں سے نکالو چھنگا کہاں وہ لڑکا آیا تھا ابھی --- ؟"

اور میں چپکے سے پردے کے پیچھے ہو گیا۔ رضیہ کے کمرے میں

پہنچا۔ سُنا ہے "تم ولائیت جا رہی ہو؟"

"ولائت تو نہیں عرب جانے کا ارادہ ہے۔"

"اور ہم؟ ہم یہیں رہ جائیں کیا؟"

"میرے مولا مُجھے مدینے بُلا لیجیئے۔"

"اور عرب کے بعد کیا پروگرام ہوگا؟"

"نمازیں پڑھا کروں گی، اذانیں دوں گی، وعظ کیا کروں گی۔"

"ارے! مغرب کی اذان ہو رہی ہے" میں نے کہا۔

"یہ لڑکا کہاں چلا گیا؟" بیگم کی آواز آئی۔

"لڑکا مراقبے میں ہے" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

× × × × × × ×

جب میں رات گئے شیطان کے کمرے میں پہنچا تو وہ اونگھ رہے تھے جب اُن پر نیند کی غنودگی طاری ہوتی ہے۔ تو وہ ہمیشہ سچ بولتے ہیں ان سے اگر سنجیدہ گفتگو کرنی ہو تو میں ہمیشہ یہی وقت چُنتا ہوں۔

مجھے دیکھتے ہی انہوں نے تینوں لڑکیوں کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ شاید شام کو انہیں کرنل کے ساتھ دیکھ آئے تھے یا اُن کی باتیں سُن آئے تھے

"لیکن اس کے باوجود ہم اُن سے راہ و رسم رکھیں گے۔ مجھے تم سے بڑی شکائت ہے۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"عہد جو کر چکا تھا۔"

"خیر۔ رضیہ کی خبر سنائیے۔"

"وہ کہیں نہیں جا رہی۔"

"سچ مچ؟" انہوں نے آنکھیں ملیں، اور جیب سے عینک نکالی،

میں فوراً پہچان گیا یہ وہی پرانی عینک تھی جو کھوئی گئی تھی۔

"ایک مرتبہ رضیہ ہی نے تو کہا تھا کہ آپ عینک کے بغیر اچھے معلوم ہوتے ہیں۔"

"اس نے تو یہ کہا تھا۔ کاش کہ آپ عینک کے بغیر اچھے معلوم ہوتے تم نے اچھی طرح سُنا نہیں۔"

انہوں نے عینک صاف کر کے لگائی۔ "لوگ کہتے ہیں کہ محبت نام ہے غلط فہمی کا کہ ایک لڑکی دوسری لڑکی سے مختلف ہے۔ مگر رضیہ کے لیئے میرے دل میں وہی خیالات ہیں جو چند سال پہلے تھے۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا کہ یہ کہیں سمندر پار نہ چلی جائے۔ یہاں کم از کم اسے دیکھ تو لیتے ہیں اور اب کہ بہار ختم ہو رہی ہے، خوشیاں بھی ختم ہو رہی ہیں۔ جب بہار ختم ہونے لگتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بڑھاپا آ رہا ہے۔"

"مگر تمہارا چہرہ تو۔"

"یہ چہرے کا نہیں دل کا بڑھاپا ہے۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ کچھ دیر خاموش رہے، پھر آنکھیں موند لیں اور بڑبڑانے لگے "اور اگر میرے پاس کار ہوتی یا تانگہ ہوتا، کوٹھی ہوتی، بائیسکل ہوتی میرے بال گھنگریالے ہوتے۔ آنکھیں نشیلی ہوتیں تو وہ تینوں لڑکیاں مجھ پر عاشق ہو جاتیں۔ لیکن اگر یہ ساری خوبیاں مجھ میں ہوتیں تو میں کسی بہتر لڑکی کو اپنے اوپر عاشق کر واتا۔ مجھے ان سے کوئی شکائت نہیں۔ اگر یہ جھوٹ بولتی رہی ہیں تو میں کون سا سچ بولتا رہا ہوں اگر انہوں نے فلرٹ کیا ہے تو میں نے بھی تو فلرٹ کیا ہے۔ مجھے ان کی پروا کب تھی۔ بس ذرا افسوس ہے تو اس بات کا۔ کہ یہ مجھ سے زیادہ چست نکلیں اور جو سلوک میں ان سے آخر میں کرتا وہ انہوں نے مجھ سے ذرا پہلے کر دیا۔

ہم لوگ کیسے عجیب ہیں، سیدھی سادی لڑکیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے، صرف شوخ و شنگ لڑکیوں کے پیچھے بھاگتے ہیں — دراصل ہم خود چاہتے ہیں کہ وہ چالاک بن جائیں، جھوٹ بولنا سیکھ جائیں، ہم خود انہیں ایسا بناتے ہیں...... ہم خود انہیں فلرٹ کرنا سکھاتے ہیں۔ ہمارے عیب ہمارے بنائے ہوئے ہیں۔ اور جب وہ سب کچھ سیکھ جاتی ہیں۔ تو ہم انہیں برا بھلا کہتے ہیں اور کچھ دنوں کے لئے پھر سیدھی سادی لڑکیوں کے قصیدے گانے لگتے ہیں —"

مجھے علم تھا کہ بہار ختم ہو چکی ہے، شبیعہ ان کی کھوئی ہوئی عینک مل گئی ہے، ان کی غنودگی بھی کبھی کی دور ہو چلی ہے، لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ شاید سچ بول رہے تھے۔

× × × × × × ×

حادثۂ اسیری

کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف۔ فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے، میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا۔ اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔ سیشن جج باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کا برتاؤ برتتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا اس نے بھی اغماض اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا گیا۔ مگر کسی نے نہ سنا۔ اور وہی حکم بحال رہا۔ پھر معلوم نہیں کیوں، کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گزر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی کا آگیا۔ اور حکام صدر نے ایسی رپورٹ بھیجنے پر اس کی بہت تعریف کی۔ سنا ہے کہ رحم دل حاکموں نے مجسٹریٹ کو بہت نفرین کی اور میری خاکساری اور آزادروی سے اس کو مطلع کیا۔ یہاں تک کہ اس نے میری رہائی کی رپورٹ بھیجدی۔ اگرچہ میں اس وجہ سے کہ ہر کام کو خدا کی طرف سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا۔ جو کچھ گزرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے اس پر راضی ہوں۔ مگر آرزو کرنا آئین عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں۔ روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے۔ یہ بھی جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانۂ رحمۃ للعالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھیے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جانفرسا ہے نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی منزل مقصود قرار دوں۔ سر بصحرا نکل جاؤں۔ یہ ہے جو کچھ کہ مجھ پر گزرا اور یہ ہے جس کا میں آرزومند ہوں۔"

(غالب)

کرتار سنگھ دُگّل

کالو

کالو پھر بھاگ گئی تھی۔ صبح سے سب اُسے تلاش کر رہے تھے۔
شیہاں سنگھ دوپہر تک ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک کر چُور ہو چکا تھا۔
"اسے چور لے جائیں۔ آج ایک مرتبہ مل جائے۔ بس مل جائے مجھے!"
وہ اٹھتے بیٹھتے دانت کٹکٹاتا۔ جب ذرا سائے ڈھلے۔ تو وہ پھر تلاش کو
نکل کھڑا ہوا۔ پوچھتے پوچھتے اس نے کیا دیکھا، کہ کالو ملٹری کی ایک لاری
کے سائے میں سڑک کے کنارے بیٹھی جگالی کر رہی ہے۔

کالو آئی تھی تو گلی میں، محلے میں، اڑوس پڑوس چاروں طرف
اُس کا بہت چرچا ہوا تھا۔ بوٹی بوٹی پڑی تھرکتی۔ اپنے بدن پر مکھی تک
نہ بیٹھنے دیتی۔ اس کے گداز جسم پر سے نظریں پھسل پھسل جاتی تھیں۔ اس
کا انگ انگ پیارا اور خوبصورت تھا۔ پتلی سی، لمبی سی، سیدھی تیر سی دُم
جو ایک موٹے سے گچھے پر جا کر ختم ہو جاتی۔ جلد ریشم کے مانند باریک اور
ملائم اور ماتھے پر چاند ستارہ۔

"پنج کلیان ہے" شیہاں کی ماں نے اُسے دیکھ کر کہا تھا۔ گول اور
کنڈل سینگ۔ سگھڑ اور سوشیل۔ نہ کسی کو دیکھ کر سر جھٹکتی، نہ لات اٹھاتی
چھوٹے چھوٹے بچے اس کے قدموں میں لوٹتے رہتے اس کے تھن چھیڑتے

مگر وہ خاموش رہتی۔
شیہاں سنگھ بڑا خوش تھا جیسے اسے کوئی سوغات مل گئی ہے۔
کالو کو دیکھتے دیکھتے اس کا جی نہیں بھرتا تھا۔ وہ دن میں کئی کئی بار اُسے
نہلاتا دھلاتا، مالش کرتا، اُس کے بیٹھنے کی جگہ سنوارتا۔ باقی مویشیوں
کی طرف سے وہ بالکل غافل ہو گیا۔ گائیں اس کی جانب اٹھا اٹھا کر تکا
کرتیں۔ وہ تو بس کالو ہی کا ہو گیا تھا۔
شروع شروع میں جب وہ آئی تو اپنا منہ اٹھائے احاطے کے اس
پار دیکھتی رہتی۔ ڈکرا ڈکرا کر کسی کو پکارتی رہتی۔ جیسے کسی کو بلا رہی ہے۔
گلے شکوے کر رہی ہے۔

وہ لوگوں سے کہتا۔ "اداس ہے۔ جلد ہی گھل مل جائے گی۔
رئیس گھر کی ہے۔ پھولوں کی سی طبیعت ہوتی ہے ایسے مال کی۔
خود بخود عادی ہو جائے گی۔ ہم سے زیادہ مدارات اور کون کر سکتا ہے؟"
اور پھر وہ چن چن کر پتلی پتلی کومل کومل گھاس اُس کے منہ میں دیتا جاتا کبھی
کالو کھا لیتی اور کبھی اُگل دیتی۔
دن گذرتے گئے۔ کالو نے کھانا پینا اور ڈھنگ سے اٹھنا بیٹھنا

شروع کر دیا۔ اس کا دودھ بڑھنے لگا۔ دونوں وقت دلٹوہیاں بھر بھر کر دیتی۔ دودھتے دوھتے پشہال سنگھ کی مضبوط باہیں بعض اوقات تھک جاتیں۔

دو مہینے گذر گئے۔ لیکن اس کے باوجود شہال سنگھ کو کالو کے لئے محتاط رہنا پڑتا۔ جونہی کبھی موقع ملتا۔ وہ کھسک جاتی۔ اور اکثر تیز تیز ڈگ بھرتی، سر اٹھائے اسی سڑک کی طرف جا رہی ہوتی۔ جدھر سے وہ آئی تھی۔

شہر کے دس میل کے فاصلے پر ایک ندی ہے جس کے کنارے پر شہال سنگھ نے کالو کو خریدا تھا۔ اس وقت جیب میں صرف ایک اٹھنی تھی۔ جس کے بدلے میں کالو کے مالک نے اُسے بیچ دیا۔ بات یوں ہوئی کہ اس ندی کے کنارے پر مسلمان مہاجروں کا ایک کیمپ تھا۔ چار ہزار مرد عورتیں، بچے، ڈھور ڈنگر، گائیں، بھینسیں، گھوڑے کچھ دنوں سے وہاں رکے ہوئے تھے۔ اگلے شہر کے ہندو اور سکھ ذرا شوخ تھے اس لئے جب بھی اس شہر سے کوئی قافلہ گذرنا ہوتا تو سرکار کرفیو نافذ کر دیتی۔ سڑک کے کنارے بندوق بردار پولیس کو پہرہ دینا پڑتا۔ دوسری سڑک سے ایک پیدل قافلہ پچھلے دس دنوں سے گذر رہا تھا۔ کہیں پندرہ دنوں کے بعد ان لوگوں کی باری آئی تھی۔ یہ لوگ ندی کنارے پڑے رہے۔ ایک دن بارش ہوئی۔ دن بھر بارش ہوتی رہی، رات بھر ہوتی رہی۔ دوسرے دن، دوسری رات۔ اور اسی طرح متواتر چار دن تک پانچویں روز صبح سویرے ہی چاروں طرف ہاہاکار مچ گئی۔ پل ٹوٹ گئے

سڑکیں ٹوٹ گئیں۔ کھمبے الٹ پڑے۔ تار بہہ گئے۔ اور جب لوگ اس ندی کے کنارے پہنچے۔ تو وہاں صرف چار ننگ دھڑنگ آدمی کھڑے تھے۔ جہاں سی آئی ڈی والے پچھلی شام کو چار ہزار مرد، عورتیں اور بچے شمار کر کے آئے تھے۔ وہاں صرف چار ننگ دھڑنگ آدمی کھڑے تھے۔ نہ انہیں اپنے زندہ ہونے کا یقین تھا اور نہ دیکھنے والے مان سکے کہ وہ زندہ ہیں۔ کوسوں تک چاروں جانب کیچڑ ہی کیچڑ دکھائی دیتی۔ اور اس کیچڑ میں چپے چپے پر پھولتی ہوئی موٹی موٹی لاشیں تھیں آدمیوں کی عورتوں کی، بچوں کی، مویشیوں کی، کتوں کی۔ اور آسمان گدھوں سے بھر گیا تھا۔ کیچڑ میں کہیں کہیں پایاب پانی کھڑا تھا۔ جس میں پیتل اور المونیم کے برتن تیر رہے تھے۔ چتکبرے دوپٹے تیر رہے تھے۔ چھکڑے اوندھے پڑے تھے پہیوں میں گردنیں پھنسی ہوئی تھیں۔ سامنے ریل کا پل ٹوٹا پڑا تھا۔ اور اس کی پٹڑی لٹک لٹک کے نیچے آ رہی تھی۔ پل کے اس کنارے کی ایک محراب میں ان گنت لاشیں مکڑیوں کی طرح پھنسی ہوئی تھیں۔ کسی کی گردن اندر دھنس گئی تھی ٹانگیں اوپر کو اٹھ گئی تھیں۔ کسی کا ٹوٹا ہوا بازو توری کی طرح جھول رہا تھا۔ عورتوں کی ننگی ننگی چھاتیاں غیر مردوں ان جانے ناآشنا مردوں کے ساتھ چپکی ہوئی تھیں۔ پھول سے بچے کیچڑ میں لت پت پڑے تھے۔ اُن کے منہ سے، ناک سے گدلا پانی آ جا رہا تھا۔۔۔

اور۔۔۔ چار ننگ دھڑنگ آدمی ہکا بکا کھڑے تھے۔ لوگوں نے ان سے کہا ہمارے ساتھ چلو۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ کسی سکھ پر کوئی مہاجر کیسے اعتبار کر سکتا ہے۔ آخر جب لوگ چلنے لگے۔ تو ان

ہی میں سے ایک نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "میری یہ بھینس لے جاؤ۔ میں نے اسے عمر بھر بچوں کی طرح رکھا ہے۔ آج اسی نے ہم چاروں کی جانیں بچائی ہیں۔ اس قیامت سے ذرا ہی پہلے یہ بھاگ کھڑی ہوئی تھی ——— اور ہم چاروں بھائی اس کے تعاقب میں نکل پڑے۔ اور اس کے بعد یہاں طوفان آگیا جو سبھوں کا صفایا کر گیا۔"

کالو چنانچہ جب بھی موقع ملتا۔ پل کی طرف بھاگ نکلتی۔ کبھی کبھی ایسا لگتا جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہے۔ کبھی کبھی آنکھیں پھاڑ کر سامنے دیکھتی رہتی۔ کبھی چارہ کھاتے کھاتے چھوڑ دیتی۔ چارہ یونہی پڑا سوکھ جاتا اس کے منہ پر مکھیاں بیٹھنی شروع ہو جاتیں۔ اس کی آنکھوں اور اس کی نتھنوں اور اس کی لمبی لمبی دم سے چمٹ جاتیں ——— شیہاں سنگھ کو یہ بات اچھی نہیں لگتی تھی۔

اگر کبھی ——— آٹھ دس چھکڑے ایک ساتھ سڑک سے گذرتے تو بیلوں کے گلوں میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی آواز سن کر وہ رسہ تڑانا شروع کر دیتی۔ زور زور سے ڈکارتی، سر کو جھٹکتی، بڑی بیقرار ہو جاتی اور اگر اُسے کھول دیا جاتا تو وہ فوراً بھاگ کر چھکڑوں میں جا ملتی۔ اور اندھا دھند ان کے ساتھ چلتی رہتی۔ جیسے ان کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ ہے، کوئی وابستگی ہے۔

شیہاں سنگھ کالو کی ان حرکتوں پر بڑا حیران ہوتا اور سوچتا۔ گذشتہ دنوں اس نے بڑے بڑے گرانڈیل مسلمانوں کا خاتمہ کر دیا۔ پر یہ بھینس ابھی تک اُس کے قابو میں نہیں آتی۔ چھلاوے کی طرح نکل کر آتے دن اُسے پریشان کرتی رہتی ہے،

شیہاں سنگھ اکثر اپنے فسادات کے کارنامے سنایا کرتا تھا۔ اپنے گاؤں میں اُس نے کس طرح مسلمانوں کو الٹا لٹکا لٹکا کر مارا۔ ان کی مسجدوں کی بے حرمتی کی۔ ان کی فصلیں تباہ کیں۔ اور پھر کس طرح اُس کی پارٹی اُن کی گاڑیوں پر جا ٹوٹی۔ کس طرح انہوں نے خون کی ندیاں بہائیں۔ کس طرح چن چن کر مسلمانوں کو قتل کیا۔ اور نیلے برقعے والی اور گول گول عینکوں والی، اور گٹ مٹ گٹ مٹ کرتی ہوئی خوبصورت لڑکیوں کو پکڑ کر لے آئے۔ کس طرح چھوٹی چھوٹی بچیوں کو انہوں نے بڑے بڑے پتھروں پہ دے پٹخا۔ کس طرح بوڑھوں کو اذیت دے دے کر اُن کا بند بند کاٹا۔ کس طرح جوانوں کو ہلاک کیا۔ لیکن شیہاں سنگھ کو اس بات کا علم نہیں تھا۔ کہ اس نے کتنے مسلمانوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے تھے اُسے تو صرف بیس تک گنتی آتی تھی۔

کالو کی اُس کے سامنے کیا ہستی تھی۔ اُسے تو وہ دو دنوں ہی میں رام کر لیتا۔ ایک دن کسی نے اُس سے پوچھا۔ "کیوں بھائی شیہاں سنگھ! تم نے ان فسادات سے پہلے بھی کسی کو مارا تھا؟"

"واہگورو کا نام لو جی! رب دی سونہہ! مجھ سے تو کبھی کسی چیونٹی پر بھی پیر نہ رکھا جاتا ———" شیہاں سنگھ نے ایک سادہ سے آدمی کی موٹی سچائی کے ساتھ جواب دیا۔

"اور اگر ——— شیہاں سنگھ! اب تمہیں کسی کو مارنا پڑے تو؟"

"نہیں سردار جی! گورو کی سوگند! جانے اس وقت کیا ہو گیا تھا۔

اب تو کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ باتیں ہی نہیں رہیں اب؟"

اب تو چاہے شہاں سنگھ کو کوئی دس صلواتیں سنا دیتا۔ تو بھی وہ غصہ پی جاتا۔ وہ خود حیران تھا۔ کہ اس وقت اُسے کیا ہو گیا تھا۔ جیسے کوئی کسی معمولی سے کیڑے کو مار دے۔ جانے وہ کس طرح دوڑ دوڑ کر بھاگ بھاگ کر، گھیرے ڈال کر مسلمانوں کو قتل کرتا رہا۔

شہاں سنگھ کالو کی مالش کرنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ گھاس چن چن کر اس کے منہ میں دیتا جاتا۔ مالش کرتے کرتے اُس کے سینگوں کو چمکاتا۔ اُس کی آنکھیں صاف کرتا، اُس کی دم کو سنوارتا —— اور شام بھر چنوں کا ایک ایک دانہ چن کے، رتی رتی کھلی چھانٹ چھانٹ کر اُس کے لئے تیار کرتا

کالو کی خاطر مدارات ہوئی تو اس کا دودھ بڑھتا گیا اور شہاں سنگھ اس کا اور بھی شیدائی ہوتا گیا۔ بڑھتے بڑھتے اس کا دودھ پچیس سیر ہو گیا۔ تیرہ سیر ایک وقت، بارہ سیر دوسرے وقت۔ دلٹوہیاں بھر جاتیں۔ ڈول بھر جاتے۔

جو بھی سنتا اُسے اعتبار نہ آتا۔ صوبہ بھر میں اُس جیسی بھینس کسی کے پاس نہیں تھی۔ مویشیوں کی منڈی میں کالو کو دیکھ دیکھ کر افسر حیران ہوتے۔ کالو کو ایک ہزار روپیہ انعام ملا۔ اگر شہاں سنگھ اُسے بیچنا چاہتا تو ملٹری، ڈیری فارم والے تین ہزار تک دینے کے لئے تیار تھے۔

لیکن شہاں سنگھ کالو کی طرف کسی کی ہلکی نظر بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ منڈی سے لوٹتے وقت ایک کوئیں سے اس نے کالو کو ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پلایا۔ اور دم لینے کے لئے ایک آم کے درخت کی چھاؤں میں دونوں ٹھہر گئے۔ تنے کے ساتھ پیٹھ لگا کر کھڑے کھڑے شہاں سنگھ کالو کی طرف تکتا رہا۔ اور اس طرح درخت سے ٹیک لگائے وہ سو گیا۔

آدھ گھنٹے کے بعد شہاں سنگھ ہڑبڑا کر جاگا۔ کالو غائب تھی۔ چاروں جانب اُس نے نظر دوڑائی۔ لیکن وہ کہیں بھی دکھائی نہ دی۔ آخر پاؤں کے نشانات پر وہ اُس کے پیچھے بھاگا۔ بڑے بڑے ڈگ بھرے ہوئے دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا۔ کہ کالو نہایت تیزی کے ساتھ بھاگی تھی۔

دم بھر کی نیند میں شہاں سنگھ نے کتنا برا خواب دیکھا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کی لڑائی ہو رہی ہے۔ اور کالو پاکستان والوں کو اس دیس کی تمام خبریں پہنچا رہی ہے۔ رات کو وہ رسہ تڑا کر پاکستان بھاگ جاتی اور پھر مخبری کر کے صبح سویرے کھونٹے پر لوٹ آتی ——

شہاں سنگھ بھاگتا رہا، لیکن نشانات ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں اُس کا انگ انگ پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ اور کالو بھاگی بھی تو جھاڑیوں میں سے، نالیوں میں سے، کھیتوں میں سے

آخر کار پیروں کے نشانات بڑی اور پختہ سڑک پر جا کر ختم ہو گئے۔ اس کے بعد پتہ لگانا بڑا مشکل تھا۔ سڑک پر ملٹری کی لاریوں کا جیسے ایک قافلہ جا رہا تھا۔ ایک ایک منٹ میں دس دس لاریاں گذر رہی تھیں۔ شہاں سنگھ نے سن رکھا تھا۔ کہ کہیں کشمیر دیس میں لڑائی چھڑی ہوئی ہے۔

تھکا ہوا، ہارا ہوا، مضمحل شہاں سنگھ سڑک کے کنارے چلتا گیا۔ شام

ہوگئی تھی۔ آخر اسے ایک ملٹری کی لاری کھڑی دکھائی دی۔ جو شاید خراب ہوگئی تھی۔ اور لاری سے دس قدم کے فاصلے پر کالو ایک کیکر تلے بیٹھی جگالی کر رہی تھی۔ جیسے وہ اپنے گھر، اپنے صحن میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اور ایسے اطمینان سے، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

بشہاں سنگھ کا گاؤں آٹھ کوس پیچھے رہ گیا تھا۔

"ارے بھائی! یہ کونسی سڑک ہے بھلا؟" بشہاں سنگھ نے لاری کو درست کرنے والے ڈرائیور سے پوچھا

"اسے جرنیلی سڑک کہتے ہیں دوست!" اُس نے جواب دیا۔

"اور یہ کدھر کو جاتی ہے؟" اپنا صافہ اتار کر بشہاں سنگھ نے کالو کی گردن میں ڈالتے ہوئے پھر پوچھا۔

"یہ؟ —— یہ؟" —— "یہ تو سیدھی پاکستان کو جاتی ہے۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔ اور اپنی فوجی ٹوپی اتار کر ایک جانب رکھ دی۔

"ہنہ! تو یہ سڑک پاکستان کو جاتی ہے۔" بشہاں سنگھ نے غضبناک ہو کر کالو کو اپنی طرف کھینچا۔ "یہ سڑک پاکستان کو جاتی ہے!" وہ رہ رہ کر منہ میں بڑبڑاتا۔ جواب ہتھوڑوں کی طرح اُس کے دماغ میں بج اُٹھتا۔ "یہ سڑک پاکستان کو جاتی ہے۔"

بشہاں سنگھ کو یاد آیا کہ جن مسلمانوں کو فوجیوں نے آکر بچا لیا تھا۔ وہ ملٹری کی لاریوں میں لاد لاد کر پاکستان بھیج دیئے گئے تھے۔ فوجی ٹرک آج کل بھی مسلمانوں کے کیمپوں میں سے انہیں نکال نکال کر پاکستان لے جا رہے تھے۔ اور یہی لاریوں والے فوجی اس کے گاؤں میں رہتی بستی مسلمان لڑکیوں کو بھی نکال کر لے جاتے تھے۔

سوچتے سوچتے جیسے بشہاں سنگھ کی کڑیل باہوں میں جھنجھناہٹ سی ہونے لگی۔ اُس کے بڑے بڑے ہاتھ فولادی بن گئے۔ اور اُس کی بھری ہوئی چھاتی میں سے سانس یوں آنے جانے لگا، جیسے کوئی دھونکنی پھیلتی اور سکڑتی ہے۔ ہر قدم پر اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے پیروں کے دباؤ سے زمین بیٹھتی چلی جاتی ہے۔

بشہاں سنگھ چلتا رہا، —— ایک نظر اٹھا کر بھی اس نے کالو کی طرف نہ دیکھا۔ اور جب وہ اپنے گاؤں کے قریب پہنچا۔ تو اندھیرا کافی بڑھ چکا تھا۔ بس ایک نالہ پار کرنا تھا۔ اور پھر اس کے گاؤں کی بتیاں سامنے دکھائی دینے لگیں گی ——

نالے کے کنارے پر پہنچ کر بشہاں سنگھ نے اپنا صافہ کالو کی گردن میں باندھ دیا۔ پھر اپنا تہبند اتارا۔ سو سو کے دس نوٹ گر پڑے۔ جو بشہاں سنگھ کے بھاری جوتے تلے دب گئے —— اس نے تہبند کے دو ٹکڑے کئے ایک ٹکڑے سے کالو کے اگلے پیروں کو جکڑا اور دوسرے سے پچھلی ٹانگوں کو پھر اس نے اپنی تلوار میان سے باہر نکالی اور انتہائی غضبناک ہو کر اور دانت کٹکٹا کر اس نے کہا: "چل تجھے پاکستان کی سڑک پر ڈال دوں" اور بشہاں سنگھ نے تلوار چلانی شروع کر دی۔ کالو کی گردن مسلمانوں کی گردنوں سے کہیں زیادہ موٹی تھی۔ اس کی تلوار جیسے تھک کر رہ گئی۔ اُسکے بازوؤں میں جیسے گلٹیاں سی پڑ گئیں۔ بشہاں سنگھ لہو کے جوہڑ میں کھڑا تھا۔ خون کے چھینٹوں سے وہ لت پت ہو گیا تھا۔ اور ادھ کٹی گردن لٹکائے کالو تڑپتی ڈکارتی سڑک کی جانب بھاگ رہی تھی۔ جو سیدھی پاکستان کی طرف جاتی ہے۔

عزیز احمد

تصورِ شیخ

جاڑوں کے دن تھے۔ میاں واجد نے کرتے کے دامن سے اپنی سُڑ سُڑ بہتی ہوئی ناک پونچھی۔ صدری کا بیچ کا بٹن ٹوٹ گیا تھا۔ ایک ہاتھ اپنی صدری کے اندر ڈال کے جسم کھجانے لگے۔ دوسرے ہاتھ سے خشخشی بالوں سے بھرا ہوا۔ کالا کیسر ور سر کھجایا۔ میاں واجد کی عمر اب کوئی چودہ سال کی ہوگی۔ مگر اُن کے کالے چیچک زدہ چہرے پر جوانی کی بہار صرف کالے بدنما رونگٹوں کی شکل میں نمودار ہو سکی تھی۔

آمنہ باجی ان کی بڑی پھوپھی زاد بہن کی آواز باورچی خانے سے آئی "واجد ذرا منہ ہاتھ تو دھو لو آدمی بنو۔ تمہارے بھائی درگاہ شریف سے آتے ہونگے۔۔۔۔ ارے سکینہ او سکینہ چل بٹیا جلدی سے دسترخوان بچھا۔"

میاں واجد نے آنکھیں ملیں۔ صبح اُٹھنے اور حوائج ضروری سے فارغ ہونے کے بعد سے اب تک وہ برابر سر کھجاتے اور آنکھیں ملنے میں مصروف تھے۔ پھر باورچی خانے جاکے انہوں نے آمنہ باجی سے گرم پانی مانگا۔ اُس نے اپنے میلے بادامی دوپٹے سے کیتلی پکڑ کے تھوڑا سا پانی انکے لوٹے میں ڈال دیا۔ یہ باورچی خانے کے آگے ہی موری کے کنارے پیڑھی بچھا کے دانت مانجھنے لگے۔ اور کوئلے کی سیاہی سے تھوڑی ہی دیر میں ان کے دانتوں کی رنگت بھی ان کے چہرے کی سی ہوگئی۔

یہ موری گھر کے اندرونی آنگن میں بڑی خصوصیت رکھتی تھی — باورچی خانے، غسل خانے، پاخانے سب کی غلاظت اسی سے ہوتی ہوئی بہتی تھی۔ اور اس کا رنگ بدلتا جاتا تھا۔ گرمیوں میں تو خیر اس کی بدبو ناقابل برداشت ہوتی۔ لیکن جاڑوں میں بھی سوائے اس گھر کے رہنے والوں، مکھیوں اور کلبلاتے ہوئے کیڑوں کے کوئی اس موری کو نظر بھر کے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ غزل کے پہلے اور دوسرے مصرعوں کی درمیانی خالی جگہ کی طرح یہ آنگن کے بیچوں بیچ بہتی تھی۔ اور گرمیوں میں جب پلنگ باہر ڈالے جاتے تو کبھی یہ کسی کے سرہانے بہتی کبھی کسی کے پائینتانے۔ اس گھر کے رہنے والوں کو اس سے مفر نہیں تھا جس طرح شاعر کو قافیے اور ردیف سے نجات نہیں۔

گھر کی ساخت وہی تھی جو وسط یو۔ پی کے دیہاتوں میں عام ہے سڑک کے کنارے دو کمرے تھے۔ جن پر چونا پڑا تھا۔ دونوں صاف تھے۔ دونوں میں تخت بچھے تھے۔ اور تختوں پر گاؤ تکیہ اور چاندنی کا فرش تھا۔ ان میں سے ایک دیوان خانہ تھا۔ دوسرا مہمان خانہ۔ دونوں کے بیچ میں ایک بڑا سا دروازہ تھا۔ اور اندر آنے کی گلیاری۔ ان کمروں کے بعد بڑا سا صحن

ہتا تھا، جس میں ایک چبوترہ تھا جس پر گرمیوں میں گرم گرم خاک رہتی، اور برسات میں لانبی لانبی گھانس اور طرح طرح کے کیڑے۔ اور کبھی کبھی ایک آدھ گرگٹ۔ سیدھے ہاتھ پر ایک بڑا سا کمرہ تھا۔ اس کے بعد ایک اور کٹھیاری جس پر ٹاٹ کا پرانا پھٹا ہوا پردہ پڑا رہتا۔ اس پردے کے بعد زنانہ آنگن تھا جس میں یہ مشہور و معروف موری بہتی تھی۔ زنانے صحن میں تین طرف دالان تھے۔ اور ہر دالان کے ساتھ دو دو کوٹھریاں۔ اور ایک طرف جدھر ٹاٹ کا پردہ تھا۔ اُدھر باورچی خانہ، غسل خانہ وغیرہ۔ اسی گھر میں چوبیس سال پہلے میاں واجد نے آنکھیں کھولی تھیں۔ ان کی زچگی ایک ان پڑھ گنوار سی دایہ نے کی تھی۔ کسی نے اُن کی آنکھوں میں سلور نائٹریٹ نہیں ڈالا۔ ان کی ماں اسی زچگی میں سیپٹی سیمیا ہو کے ختم ہو گئیں۔ گھر بھر کی عورتوں کا عقیدہ تھا کہ اُدھر باہر کے آنگن میں جو سوکھا، مردار سا انار کا درخت ہے یہ اس پر رہنے والی پریوں کی کارستانی تھی۔ واجد کے چچازاد بھائی سید نسیم اللہ شاہ معروف پریوں سے زیادہ مشیت ایزدی کو اپنی بیوی کی نمانی کی اس بے وقت موت کا ذمہ دار قرار دیتے تھے۔ اُس گھر میں یا خدا پر عقیدہ تھا یا پریوں بھوتوں اور جناتوں پر۔ ابھی تک کوئی انسان سے واقف نہ ہونے پایا تھا۔

درگاہ شریف میں محض پریوں کا نہیں چڑیلوں کا بھی علاج ہوتا تھا۔ بیسیوں عورتیں دیوانیوں کی طرح قبروں کو پھلانگتی ایک دیوار سے دوسری دیوار تک دوڑتیں۔ اور دیواروں پر دو ہتڑ مارتیں۔ جو زیادہ "چڑیل" قسم کی چڑیلیں تھیں۔ وہ دیواروں اور قبروں سے سر پھوڑتیں۔ یہ سب عورتیں اپنے ظالم خاوندوں یا ظالم ترساسوں اور نندوں سے بھاگ بھاگ کر آئی تھیں۔ بعض ڈھونگ رچائے تھیں بعض کا ڈھونگ ہسٹیریا بن گیا تھا۔ کہیں کہیں وہ ہلکا سا خط عبور ہو گیا تھا جو ہوش اور سچ مچ کی دیوانگی کے درمیان ہے۔ بہت سی عاشقوں کی تلاش میں گھروں سے بھاگ بھاگ کر آئی تھیں۔ یہاں سب کی مراد پوری ہوتی تھی، مشرقی دیوار کے قریب "کڑھائی" تھی۔ یہ ایک گڑھا سا تھا۔ جب کوئی چڑیل اس کڑھائی میں جا گرتی۔ تو حضرت صاحب کے غضب سے جل کر راکھ ہو جاتی۔ اور جس عورت پر اس نے قبضہ کیا تھا۔ وہ تھکی تھکائی لیکن بھلی چنگی ہو کر نکلتی۔

سید نسیم اللہ شاہ ——— حنائی ریش، دوپلی ٹوپی، انگرکھا، چست پاجامہ ہاتھوں میں ارض مقدس کی تسبیح لئے ہوئے درگاہ شریف میں فاتحہ اور اوراد پڑھ کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں گھسیٹے نے ہاتھ جوڑ کے گھر والی کا حال کہا۔ "ہجے رتا دیج گھول کے پلایا۔ اب تو سسری جرا ٹھیک ہے۔" سید نسیم اللہ شاہ نے تسبیح پڑھتے پڑھتے سر کے اشارے سے "اچھا" کہا۔ اور اسی طرح وظیفہ میں مشغول گھر کی طرف بڑھتے گئے گھسیٹا اپنا لٹھ لئے، جس کے سرے پر تار کول چڑھا ہوا تھا۔ مودبانہ پیچھے پیچھے چلا۔ تسبیح پر وظیفہ ختم کر کے سید نسیم اللہ شاہ معروف اس سے مخاطب ہوئے۔ "اچھا گھسیٹے۔ جا دو رکعت نماز شکرانہ ادا کر۔ دو پیسے کی کھٹیا دو پیسے کے بتاشے فاتحہ دے کے درگاہ شریف میں چڑھا آ۔"

جب گھر پہنچ کے سید نسیم اللہ شاہ ناشتہ کرنے دسترخوان پر بیٹھے اور پراٹھے اور گائے کے گوشت کے کوفتے سر جھکائے کھا رہے تھے، تو ان کی بیوی آمنہ نے چھوٹے ماموں زاد بھائی واجد کی شکایت کی "خدا

کے لئے۔ اسے آدمی بنائیے کچھ پڑھائیے، لکھائیے۔ صاحبزادے ماشاءاللہ سے اتنے بڑے ہو گئے، کب تک اس طرح ہلیمے لگاتے رہیں گے۔ نرے نل بتر۔ نہ بات کرنے کی تمیز نہ اور کسی بات کا سلیقہ۔"

واجد سر جھکائے پراٹھے اور کوفتے کھاتا رہا۔ اور جب اس کے حصے کے پراٹھے ختم ہو گئے تو اس نے باسی چپاتیوں سے باقی ماندہ کوفتے کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ آمنہ کے اس طرف سکینہ چپ چاپ بیٹھی لقمے توڑ رہی تھی۔ اس کی گہری سانولی رنگت اور چھوٹے سے دہانے پر پسینے کے قطرے نمودار تھے۔ وہ میاں واجد کی بیوی بننے والی تھی۔ اُسے میاں واجد سے گھن نہیں آتی تھی۔ شرم ضرور آتی تھی۔ اپنی بڑی آپا سے میاں واجد کی یہ شکایت سن کر اس کے ملگجے لہریا دوپٹے کے نیچے اسکے سینے میں خفیف سا ہیجان پیدا ہوا، جس کا مقصد کچھ نہ تھا، محض اعصابی ہیجان تھا۔

سید بسم اللہ شاہ نے اس روز سے ارادہ کر لیا کہ اب میاں واجد کی واقعتاً تربیت ہونی چاہیئے۔ ان کو تربیت دینے کے دو طریقے تھے۔ ایک تو یہ کہ بس اب شادی کر دی جائے۔ سکینہ کا تیرھواں ہی سال تھا مگر خیر وہ ایک مہینے میں جوان ہو جائے گی۔ ذرا پاؤں میں بیڑی پڑے تو خود میاں واجد کو ذمہ داری محسوس ہو۔ دوسرے یہ کہ ان کی روحانی تربیت ہو۔ حقے کی دو تین چلمیں خالی کر کے سید بسم اللہ شاہ معروف نے طے کیا کہ اب میاں واجد ان کی بیعت کر سکتے ہیں۔ ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ سجادگی انہیں بیوی کے خاندان سے ملی تھی۔ اب اچھا یہی ہے کہ یہ بیوی ہی کے خاندان کو واپس چلی جائے۔ لیکن اس کے لئے انہیں میاں واجد پر کتنی کڑی محنت کرنی ہو گی۔ کتنی توجہ کرنی ہو گی۔ اس کا بھی حضرت سید بسم اللہ شاہ معروف کو پورا احساس تھا۔

حقہ پی کر انہوں نے لانبا پیچ دار نیچہ ایک طرف رکھ دیا۔ اور ملازم سے جو ان کے پیر دبا رہا تھا کہا "کلو۔ حقے کو تازہ کر کے لائیو، اور طاق میں اُدھر جو دو تین پتلی پتلی کتابیں رکھی ہیں نا، ذرا مجھے لا دیجیو۔"

کلو نے دارا شکوہ کے رسائل حضرت سید بسم اللہ شاہ معروف کو لا دیئے۔ وہ ان رسائل کا رد لکھ رہے تھے کہ ان میں بجز الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہ تھا۔ انہوں نے قلمدان سے قلم کی نوک ٹھیک کی۔ بادامی کاغذ سامنے رکھ کے بسم اللہ کہہ کے عینک لگائی اور شاہزادہ دارا شکوہ کی مجمع البحرین کو پڑھنا شروع کیا۔

"فقرائے ہند کے نزدیک برہما یعنی جبرائیل علیہ السلام کی عمر اور برہمانڈ کے باقی رہنے کی مدت دنیا کے اٹھارہ انج سال ہے۔ ہر ایک انج ایک ہزار سال کا ہوتا ہے . . . . ."

سید بسم اللہ شاہ نے "نعوذ باللہ" کہہ کے بادامی کاغذ پر اس فقرے کے رد میں دو تین سطریں لکھیں۔ اور پھر وہ سوچ میں پڑ گئے۔ اب اُن پر بسط کا عالم طاری ہونے کو تھا۔ قبض کی کیفیت دور ہوتی جا رہی تھی۔ کلو نے حقہ لا کے رکھ دیا۔ بے خیالی میں انہوں نے اٹھائی . . . . اور ایک ہلکا سا کش لیا۔ اب اردو اور فارسی اساتذہ کے اشعار ذہن کے ایک لاجوردی بحرِ ذخار میں آبدار موتیوں کی طرح چمک جاتے، اور روح کی گہرائیوں میں جوت سی جگا جاتے۔ مجاز کے تمام پردے چاک چاک تھے

یہ "پری محل والے داراشکوہ" کے اٹھارہ انچ اور اٹھارہ ہزار سال۔ اس کا فرق صوفی نے وقت کی ابدیت کی کیا تحقیر کی ہے۔ دہر کو برا مت کہو' دہر خدا ہے۔ دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں۔ آزاد کی آبحیات والے مرزا مظہر جان جاناں ابدیت کے لاجوردی بحر بیکراں میں معلوم نہیں کہاں غرق ہو گئے۔ ان کا ایک شعر البتہ آغوش صدرت سے جھانک رہا تھا۔ جیسے سانپ کا مہرہ جیسے اندھیرے میں کوہ نور۔

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

اپنے گھٹنے پر ہاتھ مار کے سید نسیم اللہ شاہ معروف تڑپ گئے۔

"ہا۔ ہا۔ کیا بات کہدی ظالم نے۔ کیا بات کہہ گیا ظالم۔ کیا شعر ہے غضب ہو گیا۔" اور اس کے بعد اس عالم نسبط میں خود ان پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اب وہ سید نسیم اللہ شاہ گم تھے، اور حضرت معروف۔ بجولوی زیادہ قافیوں کا سیلاب تھا کہ آتا چلا جا رہا تھا۔ آمد ہی آمد تھی۔ وجد ہی وجد تھا۔ بسمل رہا ہے' دل رہا ہے' قاتل رہا ہے' محفل رہا ہے' خاموشی ساحل رہا ہے' دوری منزل رہا ہے' آب وگل رہا ہے۔ ہر طرف انبساط ہی انبساط تھا۔ نشاط ہی نشاط۔ روح کا رقص اور وجدان۔ ردیف اور قافیے اور عروض اور تشبیہات اور لف ونشر مرتب کے ذریعہ ذرہ آفتاب سے' قطرہ دریا سے ہمکنار ہو رہا تھا۔ فنا تھی۔ لیکن اس میں بھی کیف نشاط تھا۔

حضرت سید نسیم اللہ شاہ صاحب کو بجولی شریف کی درگاہ کے سجادہ نشین کی حیثیت سے صرف کانپور کے آس پاس کے قصبوں کے شرفا جانتے ہوں گے لیکن بحیثیت شاعر جہاں کہیں اردو بولی اور دو غزل گائی جاتی تھی، ان کا نام سب کی زبان پر تھا۔ ان کا شمار چوٹی کے شعرا میں تھا۔

آٹھ دس ماہ بعد میاں واجد کی شادی سکینہ سے ہو گئی۔ یہ سکینہ جو شادی سے پہلے آمنہ باجی کی طرح ان کی پھوپھی زاد بہن تھی' ان سے عمر میں سال بھر چھوٹی تھی۔ چیچک نے میاں واجد کے مقابل اس پر رحم کیا۔ اسے لڑکی سمجھ کے صرف اپنے ہلکے سے لمس سے ایک دو چھوٹے بڑے نشان چھوڑ کر چل دی۔ کیسی ارضی اور سماوی آفت نے اس چھوٹی سی میٹھی میٹھی، سانولی بلکہ ذرا کالی کالی صورت کو بگاڑا نہ تھا۔ جب شادی ہو گئی تو سکینہ کے سلمے ستارے کے بھاری کام کے پائینچے دار غرارے اور لچکے سے لدی ہوئی ریشمی اوڑھنیاں میاں واجد کے لئے علم جمالیات کا دفتر کھولنے لگیں۔ اب تمام تر حسن ایک ریشمی غبار تھا' جس میں ریشم ہی ریشم تھا، ملبوس کا، جلد کا ریشم' آواز کا' نفس کا ریشم' پسینے کی ٹھنڈک کا' دل کی دھڑکن کا ریشم۔ اب میاں واجد کا شعور بیدار ہوا، حواس خمسہ بیدار ہوئے' ان کی ناک جو آنگن کی گندی موری کی طرح بہتی تھی۔ اب اطمینان سے اکیلے ہی میں سٹر سٹر کر لیتی ورنہ وہ بھی اب محتاط اور متین ہو گئی تھی۔

میاں واجد کو اپنی چھوٹی ننھی سی دلہن سے عشق تھا۔ اگرچہ اب تک عشق کا ذکر انہوں نے زیادہ تر شعرا کے دیوانوں ہی میں پڑھا تھا۔ جن کا حضرت سید نسیم اللہ شاہ صاحب معروف کے دیوان خانے کے ہر طاق پر انبار لگا تھا۔ یہ عشق کیا تھا، اگر کوئی میاں واجد سے پوچھتا

تو وہ شاید کھسیانے ہو کر ہیں ہیں کرنے لگتے۔ مگر انہیں یقین تھا کہ اس قسم کی محبت میں جو انہیں اپنی چھوٹی سی ریشمی بیوی کے ساتھ ہے اور باقی ہر طرح کی محبت میں بڑا فرق ہے۔ ان پر خطوط اور رنگ کے آہنگ کا راز منکشف ہونے لگا تھا۔ انہیں محسوس ہونے لگا تھا کہ جسم سے وابستہ اور جسم سے ماورا ایک کشش ہوتی ہے جو آگ ہی آگ ہوتی ہے اور اپنے آپ کو اس آگ کا مطلب اچھی طرح سمجھانے کے لئے انہوں نے دیوانہ وار اردو اور فارسی اساتذہ کے دیوان پڑھنا شروع کئے۔ اور ان پر اور سارے گھر پر ایک اور سربستہ راز منکشف ہوا کہ انکے گلے میں بلا کا جادو، ان کی آواز میں بلا کا سریلا پن ہے۔ اپنے شاگرد اور ہم زلف میں سوز و گداز کی یہ ابتدائی نشانیاں دیکھ کے سید بسم اللہ شاہ معروف نے طے کر لیا کہ اب تربیت کا وقت آ گیا ہے۔

خانقاہ میں قوالی کی مجلس تھی، جو عرس شریف کے ختم پر ہر سال ہوا کرتی تھی۔ شیخ حسین قوال نے بڑے غضب کی آواز پائی تھی وہ گا رہا تھا "تجلی ہے یا تاجدارِ مدینہ"۔ سید شریف کو حال آیا۔ سید بسم اللہ شاہ معروف تسبیح پڑھتے رہے اور جھومتے رہے اور کبھی کبھی ان کی زبان سے بے اختیار "ہا" نکل جاتا۔ قوالوں کے گلے بیٹھ گئے۔ چاندنیوں کا فرش باسی ہو گیا۔ گاؤ تکیے میلے ہو گئے۔ تبرک تقسیم ہوا۔ اور حضرت سید بسم اللہ شاہ معروف گھر واپس آ گئے۔ ان کی بیوی آمنہ نے ان کے سر میں ناریل کا تیل ڈالا اور آہستہ آہستہ دبانا شروع کیا۔ ان کے دماغ میں تازگی اور سرور سرایت کر گیا۔ ان نازک ہتھیلیوں اور ناریل کے ٹھنڈے تیل کا سرور، اور پھر اس کیف کے عالم میں آرزو ہی آرزو تھی۔ آرزو جو اشعار بنتی چلی جا رہی تھی۔ وہ طرح کی آرزو تھی۔ آرزو کی دو متضاد کیفیتیں تھیں۔ حرکت و نمو کی آرزو اور سپر فنا کی آرزو۔

ہر جنبشِ مژہ میں نہاں تیرِ آرزو
دل میں جگر میں بس گئی تصویرِ آرزو
ہستی شہیدِ غم سہی دل محوِ دید ہے
وہ سحرِ آرزو تھی یہ تکبیرِ آرزو

پھر قافیوں کا سیلاب آیا، اور حضرت معروف بجولوی کو بہا لے گیا۔ انکی بیوی نے سر پر تیل کی مالش ختم کرنے کے لئے تیل کے کٹورے میں آخری مرتبہ اپنی انگلیاں ڈبوئیں۔ اور ان سے انکے سر کی جلد کو اور کھوپڑی کی ہڈی کو دبا کے پوچھا "بس؟"

انہوں نے کہا "ہاں بس" اور اٹھ کے باہر مردانے میں چلے گئے اور بیاض نکالی۔ کلو نے حقہ بھر کے رکھ دیا۔

اندر آمنہ نے تیل کا کٹورہ طاق پر رکھا بیسن سے ہاتھ دھوتے اسکے چہرے کی جھریاں اور اسکے سفید ہوتے ہوئے بال تھک کر اس کے چہرے پر ساکن ہو گئے جیسے کسی مرے ہوئے کیڑے سے چیونٹے چمٹے ہوتے ہوں اسے زندگی میں کوئی خاص تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ وہ اسی گھر میں پیدا ہوئی اسی میں اس کے ماں باپ مرے۔ اسی میں اس کی شادی ہوئی۔ بس ایک اولاد کی تمنا تھی۔ خدا نے اولاد نہیں دی۔ لیکن اس نے اپنی چھوٹی سی بہن سکینہ کو اولاد کی طرح پالا۔ وہ پیڑھی پر پراٹھے پکاتی رہی۔ شامی کبابوں میں مسالہ بھرتی رہی نان خطائیاں بیلتی رہی۔ شب برات میں حلوے پکاتی رہی۔ زندگی کی صبح دوپہر ہو گئی۔ پھر سہ پہر آئی۔ اور اب شام قریب تھی۔ اس نے بہت کم اس گھر سے

باہر قدم نکالا تھا۔ ڈولی میں بیٹھ کے وہ عزیزوں اور برادری والوں کی تقریبوں میں شریک ہونے ضرور جاتی رہی۔ لیکن اُس نے کبھی آزاد تازہ ہوا کی خنکی محسوس نہ کی۔ آسمان کی شکل اس کی نظروں میں اُس کے صحن کی سی تھی۔ اور ڈولی پر باہر جاتے ہوئے اگر کہیں سے آسمان کا کوئی کونا نظر آجاتا تو اُسے حیرت ہوتی کہ آسمان اتنا بڑا ہے۔ اُس نے کبھی لہلہاتے کھیت نہیں دیکھے تھے۔ وہ گنگا سے زیادہ دور نہیں رہتی تھی، لیکن کبھی اُس نے گنگا کی پرشوکت روانی نہیں دیکھی تھی۔ جس کے کنارے اُس کے آباؤ اجداد کا کارواں آکر اُترا تھا۔

اور رفتہ رفتہ جیسے جیسے زندگی کی سہ پہر ڈھلتی گئی، شام آتی گئی۔ اُس کے پیٹ میں درد بڑھتا گیا۔ بجولی میں شروع میں دعاؤں اور منتوں کے ذریعہ علاج کیا جاتا تھا، پھر یونانی علاج ہوتا تھا۔ اور جب حالت بالکل بگڑ چکتی۔ تو انگریزی علاج شروع ہوتا۔ نظریہ یہ تھا کہ یہ سب وقت کی بات ہے، وقت آتا ہے تو خاک کی چٹکی سے شفا ہو جاتی ہے۔ وقت نہیں آتا تو ارسطو کے علاج سے بھی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی اُس وقت کے نظریئے میں کبھی کبھی تدبیر کی اہمیت کا خیال آجاتا۔ اور جب دعاؤں اور منتوں اور یونانی علاج سے فائدہ نہیں ہوا۔ تو کانپور سے ڈاکٹر سلیم کو بلایا گیا جنہوں نے پہلی نظر ہی میں یہ تشخیص کی کہ یہ سرطان ہے۔ ابھی وقت تھا اور انہوں نے حضرت سید بسم اللہ شاہ معروف کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی بیوی کو پٹنہ لے جائیں۔ لیکن آمنہ کسی طرح راضی نہیں ہوئی۔ "کتنا خرچ ہوگا کتنی زیرباری ہوگی۔ ڈاکٹر یوں ہی بکا کرتے ہیں آپ خیال نہ کیجئے۔ آپ پریشان نہ ہوئیے"

بسم اللہ شاہ پریشان تو ضرور تھے۔ پریشان کیسے نہ ہوتے شریف آدمی تھے لیکن وہ بھی تقدیر کے قائل تھے۔ مشیت ایزدی بجولی میں اور پٹنہ میں یکساں کام کرتی ہے۔ پھر آوارہ گردوں کی طرح بی بی کو دنیا بھر میں علاج کے لئے لے کے پھرنے سے کیا حاصل۔ پھر ان کے نقطۂ نظر سے ازدواجی محبت میں ایک حد تک نفس دوں کی چاشنی تھی۔ جس کی سرکوبی ضرور تھی۔ کبھی کبھی یہ خیال بھی آجاتا کہ انسان کی زندگی کی کچھ قیمت ہوتی ہے خواہ وہ عورت ہی کیوں نہ ہو۔ مگر وہ یہ کہہ کے دل کو تسلی دے لیتے کہ بیوی ہی کی تو ضد ہے کہ پٹنے نہیں لے جانے دیتیں۔ غرض پھر ڈاکٹری علاج چھوڑ کے یونانی علاج ہوتا رہا۔ حضرت سید بسم اللہ شاہ معروف اپنے مریدوں پر توجہ کرتے رہے، سیر افلاک کرتے رہے۔ مقامات کی سیر فرماتے رہے سلوک و معرفت کے جادے طے کرتے رہے اور آمنہ میں اتنی بھی سکت نہ رہی کہ وہ اُٹھ کے باورچی خانے میں آلو ہی چھیل سکتی یا اپنے میاں کے سر میں تیل ڈالتی۔ اب ہر فرض سکینہ کے سپرد تھا۔ اور میاں واحد کو ذرا ذرا کوفت تھی کہ اُن کی اپنی جوان چھوٹی سی دلہن صبح سے لیکے شام تک باورچی خانے میں پھنکنی پھونکتی رہے۔ مگر یہ بہرحال ضروری تھا کہ کھانا پکے۔ پیٹ کے دوزخ کا پُر ہونا ضروری تھا۔ اور پھر آمنہ نے خوشامد کی "بیٹا ذرا اپنے دولھے بھائی کے سر پر تیل کی مالش کر دیا کرو۔ اُن کی ساری عمر کی عادت ہے۔ اب مجھ کمبخت سے بستر سے اُٹھا نہیں جاتا۔ ان کے قدموں کے نیچے میری جنت ہے میں قیامت کے روز خدا کو کیا منہ دکھاؤں گی؟"

بسم اللہ شاہ معروف کو اپنے تقویٰ پر بڑا اعتماد تھا۔ بیوی کی بیماری کی وجہ سے انکے آرام میں ہر طرح خلل پڑ رہا تھا۔ لیکن وہ سوائے صبر و شکر کے کبھی ایک کلمۂ شکایت زبان پر نہ لاتے۔ ننھی سی سالی سکینہ، جو انکی شادی کے وقت صرف دو سال کی تھی، اب ماشاءاللہ سے بڑی ہو گئی تھی۔ وہ انکے

سر میں تیل لگاتی تو زم زم ہتھیلیوں اور ناریل کے تیل کی خنکی کا سرور تو ضرور محسوس ہوتا لیکن معلوم ہوتا تھا یہ ماں کی اپنی بیٹی جیسی ہے۔

وہ دنیا کے تمام مصائب و آلام سے بے نیاز تھے۔ جو غم تھا، وہ غم عشق، عشق حقیقی میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ ایک بے خبری تھی جو غم روزگار پر حاوی تھی۔ جو کچھ درگاہ سے مل جاتا تھا کافی تھا۔ اگر مرید کچھ دے جاتے تو یہ مزید نعمت تھی۔ بیوی بیمار بھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کی تکلیف سہی لیکن میر تقی میر اور فانی کے برعکس حضرت معروف کے کلام میں یاسیت و قنوطیت کا فقدان تھا۔ ان کے نزدیک عشق میں یاس کی فراوانی میں غم روزگار کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ اسی لئے انہوں نے تمام تر توجہ نشاط، کیف اور انبساط پر کی تھی۔ اس نشاط، کیف، انبساط کی بنا حیرت اور بے خبری پر تھی شبنم کا نزول، پھولوں کی نمود، طیور کے نغمے، یہ سب حیرت ہی حیرت کا سامان تھے۔ کسے فرصت تھی کہ وہ غم دنیا، اپنے اپنے متعلقین یا اپنے اردگرد کے انسانوں کی مصیبتوں کی طرف توجہ کرے۔

اس درمیان میں سید بسم اللہ شاہ معروف میاں واجد کو سلوک و طریقت کے ابتدائی مراحل طے کرا رہے تھے۔

بڑا سوال اور مرحلہ یہ ہے کہ پیر طریقت اپنے مرید کے دل سے ماسوا کے نقوش محو کر دے۔ اس کے بغیر حقیقی تو نہیں لگ سکتی۔ بسلسلہ نقشبندیہ میں پیر طریقت اپنے مرید کو ایک عارضی بت پرستی کے دور سے لے کے گذرتا ہے آہستہ آہستہ انسان کا دل پرانے یاروں، عقیدوں، مرکزوں سے ٹوٹتا ہے بسلسلہ نقشبندیہ میں یہ پیر اپنے مرید کے دل سے ماسوا کے خطرات نکالنے کے لئے اپنا تصور بند ھوتا ہے۔ یہ تصور شیخ ہے۔ اس میں مرید کا دل نقرہ و فرزند و زن کی بجائے مرشد کے تصور سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر جب مرید انہماک اور توجہ کی کیفیت حاصل کر لیتا ہے تو مرشد آخری بت شکنی کرتا ہے اور اپنے مرید کے دل سے خود اپنا نقش مٹا دیتا ہے شیخ خود مرید کے دل میں تصور شیخ کو پاش پاش کر دیتا ہے۔ اور پھر اسے منازل افلاک کی سیر کرانے لے جاتا ہے۔ اس کی توجہ کی گرمی بڑھتی جاتی ہے۔

تصور شیخ کے مرحلے سے کچھ عرصہ قبل میاں واجد نے شاعری شروع کی تھی اس شاعری میں بڑا ترنم اور بڑی (مجازی) سوز و گداز کی کیفیت تھی۔ اب تک یہ لہر یا دوپٹے والی، عطر حنا میں بسی ہوئی نوجوان ننھی سی دلہن کا عشق تھا۔ غالب نے سہل ممتنع کو بیدل کا تصور اور اس کا طرز بیان توڑ کے حاصل کیا۔ میاں واجد کو کانپور کے اطراف کی آب و ہوا، اردو زبان، دلہن کے عشق، اور حافظ شیراز نے شروع ہی سے تحفتاً سہل ممتنع میں کمال عطا کر دیا۔ اس کی پانچویں یا چھٹی غزل پر اصلاح کرتے ہوئے سید بسم اللہ شاہ معروف نے لکھا "یہ خدا کی دین ہے۔ یہ انداز بیان بڑے بڑے کہنہ مشقوں کو نصیب نہیں ہوتا۔ ذالک فضل اللہ یعطی من یشاء۔"

میاں واجد کی یہ ابتدائی شاعری وصل کی شاعری تھی۔ وصل کا ذکر تو ذرا کم تھا، مگر وصل کی کیفیت نمایاں تھی۔ اس میں ان آنکھوں کا ذکر تھا جن کا طریقہ سب سے جداگانہ ہے۔ جو جھکی رہتی ہیں۔ مگر اس سمت دیکھ لیتی ہیں، جدھر وہ دیکھنا چاہتی ہیں۔ یہ اپنے اور "اس کے" عشق کی شاعری تھی کہ دل سامنے لا کر رکھ دیا۔ اب اس کے بعد نظر کا اختیار ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ ان آنسوؤں کا تغزل جو مژہ تک آتے آتے خشک ہو گئے تھے۔ یہ

مرے کی شاعری تھی۔ وصل میں بھی فراق کی لاعلاج بے قراری کی شاعری، وہ کیفیت جس کو بیدلؔ نے بڑے کمال سے بیان کیا ہے۔

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنج خمارِ ما
چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنارِ ما بہ کنارِ ما

شاعری میں یہ نگاہِ ناز اور ذوقِ جاں نثاری کا زمانہ تھا۔ ابھی عاشقی خام ہی تھی۔ جمال ہر دم جمالِ نو بنتا جاتا تھا، تازہ خیال استوار نہیں ہونے پاتے تھے معشوق کا وقت تو زیادہ تر باورچی خانے میں روٹیاں سینکتے، دھوبن کو کپڑے دیتے، دوپٹوں کو رنگتے، آنچلوں پر گوٹیں ٹانکتے، صرف ہوتا تھا اُسے اپنے میاں (جواب بجولی میں صرف گھسیٹے وغیرہ کی زبان پر واجد میاں باقی رہ گئے تھے۔ لیکن جو یو۔پی۔ بلکہ ہندوستان بھر میں حضرت واجد بجولوی کے نام سے مشہور ہونے لگے تھے) —— کی ساری شاعری میں صرف انکا ترنم پسند تھا۔ اور ایک مبہم سا خوشی کا احساس تھا۔ کہ اس کے میاں کا یہ کہنا تھا کہ وہ ان کی شاعری کی بھی محبوبہ ہے۔ میاں سے محبت ایک طرح کا فرض تھا جس کی وہ روحانی، ذہنی اور جسمانی طور پر پابند تھی۔ لیکن سکینہ کو "عشق" کے معنی سکھانا ناممکن تھا۔ اس کی یہی ناسمجھی میاں واجد (معاف کیجئے گا حضرت واجد بجولوی) پر اُس کی عشقِ ناز، اُس کی جفا، اسکا ستم، اس کی بے نیازی سب کچھ تھی۔ روایت رودکی کی جوئے مولیاں حافظ کے رکنا باد و مصلیٰ اور آتش کی "کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ" سے ہوتی ہوئی۔ اس گھر میں گھس آئی تھی۔ جس میں گندی موری بہتی تھی۔ اور آمنہ باجی بچاری سرطان میں مبتلا زندگی کے آخری چند روز کاٹ رہی تھی۔ لیکن واجد کو اپنی ہر لغزش سے عشق کا لطف یقین پیدا تھا۔ ہر موجِ تبسم یعنی سکینہ کے پان کھاتے ہوئے سانولے ہونٹوں کی مسکراہٹ برقِ طور تھی۔ اسکا روئے آتشیں (جو دراصل بہت سانولا تھا) صبح دلبری کی طرح روشن تھا۔ اس کی رنگت کالی بھی شاعری میں وہ سیمیں اندام تھی۔ کمر اس کی البتہ پتلی تھی۔ اس لئے موئے کمر کو طرح طرح باندھا جا سکتا تھا زلفیں (یعنی تیل میں چپڑی ہوئی چوٹی) تو سیاہ تھیں ہی۔ لب لعلیں صرف پان کی سرخی سے لال ہو جاتے مگر اس سے کیا۔ جوانی ہے، جوانی ہے جوانی اگر کبھی نظر کی حقیقت کا مقابلہ واجد دل کی حقیقت سے کرتا تو کہتا اِس سے کیا۔ میں نے اُسے اپنے دل میں جو کچھ سمجھا وہ ویسی ہی ہے نظر تو محض فریب ہی فریب ہے نظر تو محض فانوس کی گردش ہے۔ اصلی نظر تو باطنی نظر ہے، چشمِ مجنوں۔ اسی سے لیلیٰ کو دیکھنا چاہئے۔ حضرت جامیؔ کا کیسا بے مثل شعر ہے۔

موجبِ حُسنِ تو تنہا نہ خد و خال فتاد
عشقِ ما نیز ز اسبابِ جمال است ترا

غرض واجد کا "مجازی" عشق اور ان کی "مجازی" شاعری اُبھی شباب کے ساتھ ابھی اس والہانہ مرحلہ پر تھی کہ حضرت سید بسم اللہ شاہ معروفؔ نے انہیں راہِ طریقت میں تصورِ شیخ کے مرحلے میں داخل کیا۔ اب خود حضرت معروفؔ کے تصور کے سوا انہیں تمام نقوش یہاں تک کہ سکینہ اس کی جوانی اس کے لہریے دوپٹوں اور اُس کے ریشمی حسن کا تصور بھی۔ حرفِ غلط کی طرح مٹانا تھا۔ عشق میں یکسوئی کی ضرورت ہے۔ تمام "باطل" نقش مٹ جاتے ہیں عورت محبت کی چیز نہیں رہتی۔ وہ تو صرف بچے پیدا کرنے کے لئے ہوتی ہے اسی لئے تو فارسی شاعری نے عورت کا پیچھا چھوڑا (معاذ اللہ) رودکی کی سمرقندی

نے انارِ پستان کا ذکر کیا ہے۔ کس قدر سوقیانہ مضمون ہے۔ مگر حضرت معروف بجولوی کا یہ بھی کہنا تھا کہ غالباً یہ کتابت کی غلطی ہے دراصل انارِ پستان ہوگا۔ کسی شریر النفس کاتب نے دو نقطے اور بڑھا دئیے) فارسی شاعری نے عورت کا پیچھا چھوڑا اور تصورِ شیخ کی ہو رہی ہے۔ جہاں تصورِ شیخ سمجھ میں نہیں آیا امرد پرستی ہو گیا۔ غرض اس مرحلے پر حضرت معروف بجولوی واحد کی ساری توجہ اپنی شبیہِ مبارک پر منعطف کرانا چاہتے تھے۔ اور اس سلسلے میں اور سب نقوش کے ساتھ سلمیٰ کا نقش بھی مٹانا ضروری تھا۔ اس نقش کا مٹانا اتنا آسان نہ تھا۔ یہ جنس کو روحانیت ...... رومان کو عرفان بنانا تھا۔ لیکن بہرحال یہ عظیم الشان کشمکش شروع ہو ہی چکی تھی۔

سرطان بڑا موذی مرض ہے۔ سب سے اچھی موت وہ ہے جو ہمیشہ کیلئے حرکتِ قلب بند ہونے سے واقع ہو۔ یہ ہندوستانی شریف عورتوں کو پردے کے اندر نصیب نہیں کیونکہ وہ عموماً عارضۂ قلب سے بازی لے جاتا ہے سرطان کی وجہ تو معلوم نہیں۔ لیکن وہ بھی ٹاٹ کے پردے اور چہار دیواری سے گھرے ہوئے مکانوں میں اکثر آتا ہے۔ جہاں منڈیر پر بیٹھے ہوئے کاؤں کاؤں کرتے ہوئے کوؤں کے سوا اور کوئی مہمان نہیں آتا۔ اور خانۂ دل اگر کبھی خدانخواستہ خداوندِ مجازی کے عشق سے خالی رہا تو ہمیشہ خالی رہ جاتا ہے۔ خیر بچاری آمنہ کو تو اپنے خداوندِ مجازی حضرت سید نسیم اللہ شاہ معروف سے بڑی محبت تھی۔ تمام عمر وہ فرض کی پابندی کرتی رہی۔ اس نے کبھی اپنی طرف سے کسی فرض میں کوتاہی نہیں کی۔ جاڑوں میں وہ راتوں کو اٹھتی

تھی اور پانی گرم کرتی تھی تاکہ اس کے میاں گرم پانی سے نمازِ تہجد کیلئے وضو کر سکیں۔ تمام عمر وہ خدمت کرتی رہی۔ اور مرتے وقت بھی افسوس کرتی مری کہ وہ اچھی طرح میاں کی خدمت نہ کر سکی جن کے قدموں کے نیچے اس کی جنت ہے۔

تابوت عود کا نور لگن سب جل کے ٹھنڈے ہو گئے۔ حضرت سید نسیم اللہ شاہ نے اس صدمۂ جانکاہ کو اسی صبر کے ساتھ برداشت کیا جو بزرگوں کا شیوہ ہے۔ رفیقۂ حیات کی جدائی کے غم میں ایک دو آنسو تو ضرور ریشِ مقدس پر چھلکے۔ لیکن اس کے بعد دیکھنے والوں کو ان کا صبر و تحمل اور وقار دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اور میاں وابند تو انکے اس ضبط اور اس تسلیم و رضا کا کچھ اتنا اثر ہوا کہ اس کی عقیدت کہیں زیادہ بڑھ گئی۔

لیکن کچھ ہی عرصے بعد درگاہ شریف کی خانقاہ کے نمازیوں نے .. جن میں سے اکثر حضرت سید نسیم اللہ شاہ کے مرید تھے ... یہ محسوس کیا کہ حضرت کا جلال بہت بڑھ گیا ہے۔ نماز کے لئے صفیں ایستادہ ہوتیں۔ نیت باندھنے سے پہلے حضرت نسیم اللہ شاہ صاحب دفعتاً شیر کی طرح پلٹتے۔ اور فرماتے "اس کو نکال دو" "اس کو نکال دو" دو دو تین تین آدمی صفوں میں سے نماز سے ہٹا کر دیئے جاتے۔ اور نماز ختم ہونے کے بعد وہ اپنے ساتھیوں سے اعتراف کرتے کہ بے شک اُن کے دل میں خیالات آتے تھے۔ شبراتی حلوائی نے اقبال کیا "بھیا، ہمرے حضرت صاحب ٹھیک کہین ہمرے دل میں آوت رہے کہ جلیبین کے گو بان تھوڑا سا میٹھا تیل ملا دیئے

دین۔" میاں گھسیٹے نے جواب دیا: "بھیا آ کھیر پیر جا دسے ہیں۔ گھد ہر ہیں۔ بجُرگن کی ہر بات سچی ہوت ہے۔"

اپنے اِس جلال سے —— جو کیفیتی پر مبنی تھا —— اگر کسی کو اطمینان نہیں تھا تو خود حضرت سید نسیم اللہؒ شاہ صاحب کو۔

اِدھر اپنے شیخ، اپنے رہبر کامل سے واجد کی والہانہ عقیدت، پرستش اور عشق بنتی جا رہی تھی۔ سکینہ کے لہریا دوپٹہ اور اس کی نیم باز آنکھڑیوں میں جمال ہی جمال تھا۔ لیکن شیخ کی نرگس مستانہ میں جلال کی ایک شان تھی۔ یہ جلال جمال کی تکمیل اور اس کی شدتِ ظہور ہے۔ شیخ کے گھنگھریالے بال، اُن کی چوڑی پیشانی کے نیچے ان کی دو طاقتور آنکھیں غضب۔ اِن آنکھوں میں کس غضب کی ساحرانہ جاذبیت تھی۔ بالکل تلوار کی دھار کی طرح ایک ایسی تلوار کی دھار جو ساری دنیا سے اُس کا رشتہ منقطع کرنا چاہتی تھی معلوم ہوتا تھا یہ آنکھیں اُسے کھینچ لیں گی۔ اپنے آپ میں جذب کر لیں گی جیسے روشنائی جاذب میں جذب ہو جاتی ہے۔ اور اِن آنکھوں کے نیچے ہی سے باجبروت حنائی ریش شروع ہوتی تھی۔ شیخ کا، رہبر کامل کا چہرہ مز برِ بنشہ طریقت کا چہرہ تھا۔ اس کی آن بان، اس کی شوکت، اُس کا جلال حضرت معروف بجوہوی کی شخصیت نے واجد کے ذہن اور اُس کے قلب کے گوشے گوشے کو مسخر کر لیا اور معلوم ہوتا تھا کہ سکینہ اب محض اس کے جسم کی مہمان ہو کر رہ گئی ہے۔ اب بھی شعر سکینہ کا ذکر کرتے مگر اب شعر کے معانی اور مطالب دو سطحوں پر حرکت کرتے۔ مجازی معنوں میں تو سکینہ اب بھی محبوبہ تھی

لیکن وہ تو محض تفصیل تھی مقصودِ اصلی کچھ اور تھا جس کا پہلا مرحلہ حضرت معروف کا تصور تھا۔ مجاز اور حقیقت کا تضاد اندر سے واجد کی ہستی کو کھائے جا رہا تھا۔ کاش برقِ جمال اُس قیدِ تعین کو پھونک دیتی جس میں سکینہ اسے گرفتار کیے ہوئے تھی۔ تصورِ شیخ دل کو تو مجازی محبت سے آزاد کر رہا تھا۔ مگر نگاہیں ابھی تک زلفِ معنبر اور شانہ میں اُلجھ رہی تھیں۔ اِس کشمکش میں ایک نظر کعبہ پہ جمی تھی تو دوسری بت خانے پہ۔ شیخ کا ادب تھا۔ شیخ کا تصور تھا۔ شیخ کی آنکھوں کا سحر تھا مگر آغوش سکینہ کی یاد اور سکینہ کی طلب سے بھرپور تھی۔ دونوں طرف سے مجبوری تھی۔ ایک طرف جان کی مجبوری۔ ایک طرف جسم کی مجبوری۔ ایک قیدِ جسم تھی، اور دوسری طرف قیدِ جان۔ شیخ کی توجہ سے کبھی کبھی ایسے مرحلے اور مقامات آتے جو مجاز سے بہت دور کسی بے نام حقیقت کی طرف بہا لے جاتے۔ کوئی واجد کی طرف دیکھتا۔ اور زمان و مکان دونوں معدوم ہو جاتے۔ سخن رواں کی طرح دل اسے کسی ایسے مقام پر لے جاتا جہاں کوئی اور موجود نہ ہوتا۔ لیکن کون؟ اور ان تجربوں کے بعد دل میں غم کی ہلکی میٹھی کسک باقی رہ جاتی۔

یہ تجربہ گزر جاتا۔ کھانا مزے کا نہ ہوتا، کوئی اور چھوٹی سی بات ہوتی۔ واجد اور سکینہ میں لڑائی ہوتی۔ وہ منہ پھلا کے، بان کے پلنگ کے پائتانے دوپٹے سے منہ چھپا کے پڑ رہتی۔ لڑائی کے بعد منانے کی منزل آتی۔ واجد اُسے لاکھ مناتا، وہ نہ مانتی۔ وہ اور زیادہ لدتی جاتی۔ تب وہ نسوانیت جو شاعر کے مزاج میں ہوتی ہے۔ اپنی بیوی سے کہتی، دیکھو اگر تم نہ مانو تو ہمارا جنازہ دیکھو۔ یہ ایک بڑی عالم انفعالی روحانی کیفیت تھی۔ جو واجد محسوس کرتا۔ یہ کہ وہ مر گیا ہے، اُس کی بیوی نے چوڑیاں توڑ ڈالی ہیں۔ بال

بکھرے ہوئے ہیں۔ ہرے رنگوں کی جگہ سفید دوپٹہ ہے۔ بیوہ کا سوگ۔ اور یہ کیفیت شاعری بن جاتی۔ اچھا جتنا ناز کرنا ہے کر لو۔ مگر جب ہم دنیا سے اٹھ جائیں تو کیا کرو گی۔ راتوں کو بستر سے اٹھ اٹھ کے آہیں بھرا کرو گی۔ پہروں داس رہو گی۔ برسوں تمہارے چہرے کا رنگ اترا اترا رہے گا۔ اور جب تم کو اس کا پورا احساس ہو جائیگا کہ مرنے والے واپس نہیں آتے تو رو رو کے مغفرت کی دعا کرو گی۔

پھر ایک مرحلہ ایسا آتا کہ گھر، صحن کی غلیظ موریں، دانت مانجھنے کا منجن بیوی کے چمکتے ہوئے دانت جو سلکِ گہر تھے، دُرِ دندان تھے سب کچھ تھے سب باطل معلوم ہوتے۔ حرفِ غلط کی طرح مٹتے ہوئے۔ حضرت سید نسیم اللہ شاہ معروف، رہبرِ کامل شیخ کا باجبروت چہرہ جلتے ہوئے آفتاب کی طرح سامنے آجاتا۔ سوا نیزے پر آفتاب۔ جلال الدین رومی کے قلم سے دیوانِ شمس تبریز کی بارش ہونے لگتی۔ ایک ایسا عالم نظر آتا کہ دو جہاں کا حسن نظروں سے گرنے لگتا۔ کسی نے پہلے تو چراغ جلا کے دو جہاں کا حسن دکھایا اور پھر پھونک مار کے چراغ بجھا دیا۔ اب اس ظلمت میں نور ہی نور تھا۔ جمال ہی جمال۔ خود اپنی ہستی اس جمال کی نبض بن گئی۔ اور دھڑکنے لگی۔ اپنی ہی ہستی شمع بن گئی اور جگمگ جگمگ کرنے لگی۔ کبھی بے خودی ہوتی۔ کبھی ہوش آتا۔ اور وہ باجبروت، باشوکت چہرہ اپنی طرف کھینچ رہا ہوتا۔ اوپر کی طرف افلاک کی سیر کو لے جانے کے لئے، مقامات کی جانب رہنمائی کے لئے۔

ادھر رہبرِ کامل نسیم اللہ شاہ معروف کا جلال بڑھتا جا رہا تھا۔ جوں

جوں ان کا جلال بڑھتا جا رہا تھا، دیہاتیوں کے اعتقاد میں اضافہ ہوتا جاتا تھا ایک عجیب بات یہ تھی کہ وہ کبھی واجد کو سخت سست نہ کہتے۔ ایک مرتبہ بھی انہوں نے اُسے نماز کی جماعت سے نہیں نکالا۔ یہ سب تھا مگر اپنے جلال کی اس زیادتی کی وجہ سے خود حضرت معروف کو اطمینان نہ تھا۔ انہوں نے تقویٰ میں بہت شدت کے ساتھ اضافہ کیا تھا۔ اب اکثر وہ ساری ساری راتیں جاگ کر اوراد و وظائف میں صرف کر دیتے۔ انہوں نے بجائے تکیے کے اینٹوں پر سر رکھ کے سونے کی مشق شروع کی تھی۔ اپنا کفن سلوا لیا تھا۔ خانقاہ میں بہت وقت صرف کرنے لگے تھے لیکن شاعری کا چشمہ دفعتاً خشک ہو گیا تھا۔ جس طرح ان کی شاعری میں نشاط کی کیفیت منتقل ہو گئی تھی، جلال کی کیفیت منتقل نہ ہو سکی۔ وہ ایسا کلام زیادہ پڑھنے لگے تھے جس میں جلال کا ظہور تھا۔ خواہ وہ کلام ائمۂ تلبیس ہی میں سے کسی کا کیوں نہ ہو

نخلِ شمعیم کہ در شعلہ دود ریشۂ ما

عافیت سوز بود سایۂ اندیشۂ ما

سکینہ ان کی چھوٹی سی سالی ان کے سر میں تیل دباتی تو پہلے تو اس لمس سے نفس پر کوئی اثر نہ پڑتا۔ مگر بیوی کے انتقال کے بعد اس لمس میں ایک طرح کی کشش پیدا ہو گئی۔ یہ لڑکی کسی اور کی منکوحہ بھی تھی۔ میاں واجد کی۔ میاں واجد اب تصورِ شیخ کے مرحلے میں اپنے مرشد کامل کو سب ہی کچھ سمجھتے تھے۔ حضرت سید نسیم اللہ شاہ معروف بجز اوی کو اپنے تقویٰ پر بڑا اعتماد تھا لیکن انہوں نے پایِ سن و سال اپنی ہستی کے اندر نفس دوں کی شورش سنی۔ انہیں ایک گھنٹہ پہلے سے انتظار تھا کہ اب تیل دبانے کا وقت آنے گا عناب سکینہ آکے ان کے سر میں تیل دبائے گی۔ نازک نازک جوان نسوانی انگلیاں

معلوم ہوتا تھا اندر ہی اندر ان کے دل میں گھسی جا رہی ہیں۔ ان کی روشن پیشانی سے سجدوں کے نشان مٹا رہی ہیں۔ پھر ضمیر ملامت کرتا کہ معروف یہ لڑکی تمہارے سامنے گھٹنوں چلتی تھی۔ تم نے اسے اپنی گود میں کھلایا ہے اپنی بیٹی کی طرح پالا ہے کیا سالہا سال کا تقویٰ شیطان اپنی ایک جنبشِ ابرو سے مٹا دے گا۔ یہ سب تھا مگر اب انہیں چوبیس گھنٹے تیل دابتے ہوئے نازک نازک ہاتھوں کا دھیان رہنے لگا۔ اس دھیان کو دل سے نکالنے کے لئے انہوں نے تقویٰ میں زیادتی شروع کر دی۔ اشراق اور تہجد پہلے بھی بہت کم ناغہ ہوتی تھیں۔ اب وہ ساری ساری رات اوراد و وظائف میں گذارنے لگے مگر ایک ہیجان تھا۔ جو ان کے اور توجہ قلب کے درمیان حائل تھا۔ انہیں اس کا اطمینان تھا کہ یہ ہیجان نفسانی نہیں لیکن اتنا ضرور تھا کہ سکینہ جو پہلے محض دختر تھی اب نیم دختر نیم دلبر بن گئی تھی۔ اس عمر میں، اور اس قدر زہد و اتقا کے بعد طریقت کے ان تمام مراحل طے کرنے اور دوسروں کی رہنمائی کر چکنے کے بعد نسوانی شباب کا اس قدر اثر لینا، یہ خود جہنم کی بشارت تھی۔ وہ لاکھ معشوقِ حقیقی سے لَو لگانا چاہتے، سکینہ کی تیل دباتی ہوئی انگلیاں اس کی نازک حنا سے لال لال ہتھیلیاں، انگلیوں کی پوریں جن میں مہندی رچی ہوئی تھی۔ ان کے اور اس اعلیٰ عشق کے درمیان حائل ہو جاتیں جس میں پہلے کیف ہی کیف تھا۔ نشاط ہی نشاط تھا۔

پھر رفتہ رفتہ نیم دختر نیم دلبر کی دلکشی محض مہندی رچی ہوئی پتلی انگلیوں کی دل کشی نہ رہی۔ اب سکینہ کی آواز کا اتار چڑھاؤ . . . . اور اس کے سینے کا اتار چڑھاؤ دونوں قیامت ڈھانے لگے۔ شاعری کا سرچشمہ جو سوکھ چلا تھا اس میں مجاز کی لہریں پیدا ہوئیں۔ حضرت معروف مجذوبی نے کئی غزلیں لکھیں۔ اور پھاڑ ڈالیں۔ اور توبہ و استغفار کیا۔ لیکن سکینہ جب نظر آ جاتی، باورچی خانے میں، دسترخوان پر، تیل دباتے وقت اس کے سینے کا تموج ساری دنیا کو غرق کر دیتا۔ حالانکہ اس کا سینہ دوپٹے کی دوہری تہہ سے ڈھکا رہتا۔ ان نسوانی آتش فشانوں کے تموج میں کوہِ طور نظر سے اوجھل رہا تھا۔ حضرت کا جلال بڑھتا جا رہا تھا۔ عبادت اور تقویٰ میں شدت ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن حضورِ قلب غائب ہوتا جا رہا تھا وہ خطرات کا الزام لگا کے اپنے مقتدیوں کو نمازیوں کی صف سے نکلوا دیتے لیکن ان کے اپنے دل میں خطرات کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

تصورِ شیخ کمال پر تھا۔ اب اگر سید بسم اللہ شاہ میں حقیقی رہنمائی کی صلاحیت باقی ہوتی، یا اگر وہ حقیقی رہنمائی کر سکتے تو ان کا فرض تھا کہ واجد کے قلب میں اپنے تصور کو پاش پاش کر دیں، اور توجہ کر کے اسے اعلیٰ مقامات کی سیر کرائیں۔ لیکن اُن کی اپنی روح مفلوج ہو چکی تھی معلوم نہیں اُنہوں نے اپنا تصور پاش پاش کرنے کی کوشش بھی کی یا نہیں لیکن واجد کی گرویدگی کا یہ عالم تھا کہ اُسے ساری کائنات اپنے مرشد کامل اپنے شیخ کی نورانی صورت سے وابستہ معلوم ہوتی تھی۔ اُسی سے تمام جذبے، تمام کیف پیدا ہوتے تھے۔ وہیں مناظرِ قدرت، گل و بلبل و دراج و سار، برشگال و بہار کا حسن انتہا کو پہنچتا تھا۔

اور پھر ایک دن آیا

فجر کی نماز کے بعد حضرت سید بسم اللہ شاہ خلافِ معمول واجد پر

برس پڑے۔ اسے مقتدیوں کی صف سے نکال دیا۔ ان کے جلال کا یہ عالم تھا کہ منہ سے کف جاری تھا۔ پھر جب انہوں نے نماز پڑھائی تو ان کی آواز میں حد درجہ رقت تھی۔ وہ نماز پڑھ کے بہت دیر وظائف پڑھتے رہے۔ گھر آئے بھی تو واجد سے بات نہ کی۔ ڈر کے مارے واجد نے ناشتہ ساتھ نہیں کیا۔ اور اپنے پلنگ پر تکیہ میں منہ چھپائے روتا رہا۔ ظہر کے قریب حضرت سید بسم اللہ شاہ حوائج ضروری سے فارغ ہو کے، گھڑے سے وضو کے لئے لوٹے میں پانی بھر رہے تھے۔ اس نے دوڑ کے لوٹا ان کے ہاتھ سے لے لیا، اور پانی بھرنے لگا۔ حضرت نے غصے کا اظہار نہیں فرمایا۔ خاموش رہے۔ اس پر ہمت کر کے واجد نے ان کے قدموں پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ حضرت نے اسے اٹھا کر سینے سے لگایا۔ اس نے بھی وضو کر کے ظہر کی نماز ان کے ساتھ ادا کی۔ اور اس کے بعد حضرت نے اسے اپنے سامنے بٹھا کے سمجھانا شروع کیا۔ "واجد میں نے تجھے اوپر کھینچنے کی، اعلیٰ تر مقامات تک پہنچانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن تیرا دل دنیا میں اٹکا ہوا ہے۔ تجھ میں طریقت کے راستے پر چلنے کی طاقت نہیں۔"

واجد روحانی وحشت اور ادب سے خاموش سنتا رہا۔ اور حضرت کہتے رہے۔ "عشق حقیقی سے پہلے دنیا کی تمام محبتیں، آرزوئیں، تمام تعلقات مٹانا پڑتے ہیں۔ تجھ میں اس کی طاقت نہیں۔ تیرا دل اپنی بیوی میں اور اپنی جوانی میں اتنا الجھا ہوا ہے کہ تو طریقت کی راہ چلنے کے قابل نہیں۔"

معلوم ہوتا تھا کسی نے واجد کے دل کا چور پکڑ لیا۔ کیا یہ واقعہ نہیں تھا کہ اس کے حواس بیوی کے رنگین ملبوس، اس کی عطر میں بسی ہوئی جوانی میں اسیر تھے۔

اس نے کہا "حضرت! یہ واقعہ ہے۔ کوئی بات، میرے دل کی کوئی واردات آپ کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن خدا کے واسطے مجھے بے یار و مددگار تنہا نہ چھوڑیئے۔ میری مدد فرمایئے کہ کس طرح میں اپنے نفس کے اس جال سے چھوٹوں۔"

حضرت نے گردن جھکا لی۔ ان کی آنکھوں میں ریا کی وہ غیر معمولی چمک نمودار ہوئی جو واجد کے سوا غالباً ہر ایک کو نظر آ جاتی۔ ان کے چہرے پر خون دوڑ گیا۔ ان کے گلے سے جو آواز پیدا ہوئی اس میں حیوانیت کا ذرا سا شائبہ تھا۔ لیکن واجد تو شیخ کے تصور کا غلام گردن جھکائے ہوئے اس کا منتظر تھا کہ حضرت کا اشارہ ہو اور وہ اپنی جان قربان کر دے۔

دفعتہً حضرت نے بزرگانہ اور مشفقانہ انداز سے اس کے سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ معلوم ہوتا تھا اس لمس سے جنت کے دروازے کھل گئے۔ انہوں نے کہا "میاں واجد ایک صورت ہے مگر اس کے لئے بڑی نفس کشی اور بڑے صبر کی ضرورت ہے۔ تم اس امتحان میں پورے نہیں اترو گے۔"

"میں جان تک نثار کرنے کو تیار ہوں۔" واجد کی آواز میں بڑا جذبہ اور تاثر تھا۔ اور اس کی آنکھیں اس جذبے کا اظہار کر رہی تھیں۔

"یہ قربانی جان کی قربانی سے بھی زیادہ سخت ہو گی۔" حضرت کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔

"میں ہر قربانی کے لئے حاضر ہوں۔"

"تو سنو، تمہیں سکینہ کو طلاق دینا ہو گی۔ مگر میاں واجد یہ کافی نہیں۔ وہ اس گھر میں رہے گی۔ ظاہر ہے اس کا اور کون ہے۔ اور وہ

جا کہاں سکتی ہے۔ طلاق کے بعد بھی کہیں اسی میں تمہارا دل نہ اٹکا رہے۔ اس لئے عدت کے زمانے کے فوراً بعد اس کا نکاح ثانی ضروری ہے۔ اگر کسی اور سے نکاح ہو تب بھی تمہارے دل سے مجازی عشق کی خلش نہیں جائے گی۔ وصل جب فراق بن جاتا ہے تو اور زیادہ مہلک ہو جاتا ہے۔ محض تم کو اس عذاب سے بچانے کے لئے میں تیار ہوں کہ عدت کے بعد سکینہ سے نکاح کر لوں.....،،

معلوم ہوتا تھا کہ میاں واجد پر بجلی سی گری۔ یہ بجلی اور سب کچھ جلا گئی لیکن تصور شیخ اپنی جگہ قائم تھا۔

،،میں بوڑھا ہوں۔ میرے لئے ہوس کا زمانہ گذر گیا۔ میں اپنے نفس کو بیس برس پہلے مار چکا ہوں۔ میرا نکاح تمہیں دنیا کے پھندے سے نجات دلانے کا محض ایک وسیلہ ہوگا۔ میں تمہاری خاطر یہ قربانی کرنے کو تیار ہوں۔ محض تمہاری خاطر۔ اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں۔ تمہیں میری جگہ سجادہ نشین ہونا ہے، اور تمہاری اصلاح اتنی مشکل ہے۔ یہی ایک صورت باقی تھی اور یہ میں نے بیان کر دی،،

میاں واجد کی ہستی کا ذرہ ذرہ اس برق سے جل اٹھا تھا، جو ان پر کچھ عرصہ پہلے گری تھی۔ یہ برق اس کے نفسِ دوں کو جلا گئی تھی۔ اب تحت الثریٰ سے ثریا تک شیخ ہی کا تصور تھا۔ زہے قسمت کہ اس کی نجات اور فلاح کے لئے شیخ نے خود یہ قربانی قبول کی تھی۔ وہ شیخ کے قدموں پر گر پڑا اور کہا ،،حضرت جو آپ کا حکم ہو۔ مجھے بسرو چشم منظور ہے۔ میں آپ کے حکم کی بنا پر اپنی بیوی کو تین بار طلاق دیتا ہوں،،

اِس روحانی لین دین میں کسی نے بیچاری سکینہ سے نہیں پوچھا کہ اس کی مرضی کیا ہے۔ سب بھول گئے کہ وہ بھی جاندار ہے۔ اور اخلاق اور شریعت نے اسے بھی کچھ حق دیا ہے۔ پہلی اطلاع اُسے یہی ملی کہ واجد نے اسے طلاق دے دی ہے۔ اس کے لئے مسئلہ بہت سیدھا سادا تھا۔ وہ طریقت کے پیچ و خم اور تصور شیخ کے طلسمی اثر سے ناواقف تھی۔ اس کے نزدیک واجد، بدشکل اور چیچک رُو نہیں بلکہ دنیا کا سب سے حسین آدمی تھا کیونکہ وہ جوان تھا، اور اس کے جسم کو اُس نے اپنے قبضے میں لیا تھا۔ حضرت سید بسم اللہ شاہ معروف بوڑھے تھے۔ اس نے انہیں کبھی مرد سمجھ کے دیکھا نہیں تھا۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا وہ انہیں دوڑھا جاتی کہتی آئی تھی۔

یہ انقلاب، یہ لین دین، یہ روحانی خرید و فروخت جو اس کے نزدیک محض جسمانی خرید و فروخت تھی اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ رات بھر واجد اندر نہیں آیا۔ اور وہ آتا کیسے، سکینہ اب اس کے لئے نامحرم تھی۔ لیکن رات بھر وہ بھی روتا رہا۔ اور فجر کی نماز کے لئے حضرت کے ساتھ خانقاہ نہ جا سکا۔ سکینہ صبح کو اس کے کمرے میں گھس آئی اور اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ ،،میرے پیارے۔ میری جان تمہیں کیا ہو گیا؟ کہیں شریفوں میں آج تک طلاق ہوئی ہے۔ اس بڈھے کا جنازہ نکلے۔ وہ اپنی حرص میں تم کو مجھ سے چھڑانا چاہتا ہے،،

واجد نے اس کے ہاتھ اپنے گلے سے ہٹا کے اسے دھکیل دیا، ،،سکینہ کیا بک رہی ہو؟ تمہیں حضرت کے متعلق یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ تمہاری آنکھ کا پانی بالکل مر گیا ہے۔ اب میں تمہارے لئے

نامحرم ہوں۔ تمہیں میرے سامنے بھی نہ آنا چاہئے تھا۔ صبر کرو۔ جو کچھ ہے، خدا کے حکم سے ہے۔"

کچھ ایسی بیدردی سے واجد نے اُسے دھکیلا تھا کہ وہ دیوار سے لگ کر روتی رہی۔ لیکن جب واجد کمرے کے دروازے سے باہر جانے لگا تو وہ راستہ روک کے کھڑی ہو گئی: "میں تو تمہیں نہ جانے دوں گی۔ تم میرے شوہر ہو۔ میں بھی دیکھتی ہوں کون مجھے تم سے چھڑا سکتا ہے۔ میں زہر کھا کے مر جاؤں گی مگر اس بڈھے کھوسٹ سے شادی نہ کرونگی۔"

واجد نے اسے للکار کے ڈانٹا: "خبردار مردار! اگر تو نے حضرت صاحب کو کچھ کہا۔ ہٹ مجھے جانے دے۔"

اور وہ سہم کے ہٹ گئی۔ واجد کمرے کے باہر نکل آیا۔ مگر اب کوہِ طور بھی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ سکینہ نے حضرت سے جو بدتمیزی کی تھی۔ اس پر دو تین منٹ خون کھولا گیا۔ پھر کسی نے دفعتاً بحرِ منجمد شمالی کو اس کے خون میں حل کر دیا۔ طریقت، سیرِ افلاک، مقامات، جذب، کشف سلوک، توجہ کے ساتھ تمام راستے بند ہو گئے۔ تصورِ شیخ بے شک باقی رہا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ سکینہ کی صورت تھی۔ مظلوم، بے کس، بے بس، روحانی شاعری اور کیف کا دروازہ بند ہوا۔ مجازی شاعری کا دروازہ کھل گیا۔ وصل کا نہیں، فراق کا: "میں تو تمہیں نہ جانے دوں گی۔ تم میرے شوہر ہو۔ میں بھی دیکھتی ہوں کون مجھے تم سے چھڑا سکتا ہے..."

بے خبر چھچک رُو نوجوان جواب تک اپنی بیوی کی جوانی، اور اس کے لہریا دوپٹہ کی ترنگ میں شاعری کرتا تھا، اس کو کبھی یہ خیال بھی نہیں گذرا تھا کہ بیوی بھی جاندار ہے۔ اور وہ بھی محبت کر سکتی ہے۔ وہ اب تک اس کو اپنی "حسن" کا مظہر سمجھتا تھا۔ اور عشق کو اپنی میراث سمجھے بیٹھا تھا، جس کا رُخ وہ جدھر چاہے پھیر دے مجازی طرف یا حقیقت کی طرف۔ اُسے جدائی کے لمحے میں سکینہ کے "حسن" کی بغاوت اس کی بے بسی، اس کا "عشق" یاد آ گیا، اور شعر کا سرچشمہ جاگ اٹھا۔ اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اس سے محبت کی گئی ہے۔ وہ محض عاشق نہیں محبوب بھی ہے۔ کوئی چشمِ تر اس کے لئے بھی رو رہی ہے۔ اس کے لئے کوئی زلف پریشان اور اُلجھی اُلجھی تھی۔ کسی کے نفس کا زیر و بم اسے بلا رہا تھا۔ کسی کی نظریں اُس کی منت کر رہی تھیں۔ اُس کی طلب میں کوئی اپنی گھٹی ہوئی تربیت عقول کے لغزش کر رہا تھا۔ کوئی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے، اور پھر چاروں طرف دیکھ کے آہیں بھر رہا تھا۔ یہ آنکھیں خشک ہو جائیں گی۔ مگر جب اس کی یاد آئے گی ان سے آنسوؤں کا سیلاب اُبل پڑے گا۔ جوشِ غم جوشِ حیا پر بھاری تھا۔ نازک نازک شفاف سینہ نالوں سے زیر و زبر تھا۔ ایک آغوش خالی تھی، جو اس کے آغوش کے لئے بے تاب تھی۔ خدنگِ نظر، دردنداں، شعلۂ رُخ، تیرِ مژگاں، لب لعلین سب میں معشوقانہ علامات عاشقانہ صفات بن گئے تھے۔ آنکھوں سے شبنم آگ بن کے ٹپک رہی تھی۔ اور حسن کا دل دھڑک رہا تھا۔ اور آخر میں حسن کی وہ شکست وہ تلوار کی دھار جس کا نام فراق ہے، جس سے مفر نہیں۔

اور اس کے بعد اندھیرا ہی اندھیرا۔

وہ نسوانی کشش کی شمع گل کر کے کوہِ طور کی طرف بڑھنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ جس نے کوہِ طور بنایا ہے: اس نے اُسے ہمیشہ کے لئے

اُس کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔ اب ایک کی جگہ دو مورتیں تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد ایک مُرشدِ کامل کی صورت، تصورِ شیخ اور دوسرے سکینہ کی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی بے بس صورت اسے دہکتی ہوئی۔ ان دونوں کی مقناطیسی کشش برابر برابر تھی۔ وہ نہ ادھر جا سکتا تھا نہ ادھر۔ اور اس کے لئے ایک ہی راستہ باقی تھا۔ اس گھر سے باہر۔ ان دونوں کی پرستش میں ان دونوں سے دُور۔

اس آپ کی زمین سے الگ آسمان سے دور۔

اس نے جلدی جلدی دو تین جوڑے کپڑے نکالے، کچھ روپے اس کے پاس تھے، وہ جیب میں ڈالے اور گٹھری پیٹھ پر لاد کے چل کھڑا ہُوا۔ تین کوس پر ریلوے اسٹیشن تھا۔

میاں گھسیٹے راستے میں ملے اور انہوں نے پوچھا بھی: "میاں کا ہوا۔ کاہے اتنے سبیرے سبیرے اسٹیشن جات ہو؟ ہم تم کا پہنچا ئے آئیں؟"

اس نے آنسو روک کے انکار میں سر ہلایا۔ اور آگے بڑھ گیا۔

بیس برس گذر گئے۔ اس درمیان میں اس نے پنجاب کے ایک شاعر اقبال کا بھی ذکر سُنا اور اُس کا کلام بھی جستہ جستہ پڑھا۔ لیکن اس شعر کے معنی اس کی سمجھ میں نہیں آئے ؎

کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات

ایسے شعر پڑھ کے وہ کہتا: "ہاں۔ ان پنجابی ڈھگوں کو کبھی شاعری نہیں آئے گی"۔ اس کے برخلاف حضرت معروفؔ بجولوی کا ایک ایک شعر اس کے حرزِ جاں تھا۔ ایک مرتبہ گھر سے نکلنے کے بعد پھر وہ کبھی ان کے سامنے نہیں آیا۔ کسی شہر میں وہ ہوتا اور حضرت آنے والے ہوتے ——— یوں تو حضرت درگاہ شریف کو چھوڑ کر باہر جاتے ہی بہت کم تھے ——— تو وہ وہاں سے چل دیتا۔ لیکن اس نے گھر سے نکلنے کے کچھ ہی روز بعد بڑا دردمیں ڈوبا معذرت نامہ لکھا۔ اور حضرت نے اسے تہ دل سے معاف فرما دیا۔ یہ بھی لکھا کہ "ہدایت منجانب اللہ ہے۔ کسی کو نصیب ہوتی ہے کسی کو نہیں۔ ہدایت تمہاری قسمت میں نہیں تھی"۔

اس بیس برس کے عرصے میں شاعری میں اس کا اپنا نام حضرت معروفؔ بجولوی کے برابر ہی برابر مشہور ہو گیا۔ اس کی شاعری رندی کی شاعری تھی۔ رندی اور بے نام، بے مقصد عشق کی شاعری۔ ہر جگہ حُسن کی پرستاری۔ حُسن کے "عین" کی پرستاری۔ ایسا معشوق جو ہر معشوق میں موجود ہے۔ اور اس کا اپنا بجز غزل اور جذبۂ شعر کے کہیں مقام نہیں۔

وہ شراب پیتا رہا۔ حافظؔ کی طرح غالبؔ کی طرح۔ یار لوگوں نے کہا کہ اس کے شربِ مدام کے دھوکے میں نہ آنا۔ اس نے بھی پیالے میں عکسِ رُخِ یار دیکھا ہے۔ وہ خود بھی شک کے عالم میں تھا ممکن ہے ایسا ہو۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے عشق میں حقیقت کس قدر ہے، اور مجاز کس قدر، خبر کس قدر ہے اور بے خبری کس قدر بے خبری بہر حال زیادہ تھی۔ اور ایک حد تک افشردۂ انگور تھی۔ یہ

نسخہ شاعروں کے لئے افیون سے کسی قدر افضل ہے۔ اور اس سے حُسن کی عجیب عجیب کیفیتیں نظر آتی ہیں۔

دہر جز جلوۂ یکتائیٔ معشوق نہیں

یار لوگوں نے غالب کو صوفی بنا دیا۔ تو پھر واحد کی شاعری کو کیوں حُسنِ حقیقت یا حقیقتِ حُسن کا پرتو نہ سمجھا جائے۔ پھر اُس نے غالب سے زیادہ "ترنم" سے حُسنِ حقیقت کا مشاہدہ کیا تھا۔ شراب میں مدہوش، تنگ دھڑنگ، سر اور پیر کا ہوش نہیں۔ صرف حُسنِ حقیقت سامنے تھا۔ شعری ترنم، قافیوں، بندشوں، استعاروں اور ترکیبوں سے جھلکتا ہوا حُسنِ حقیقت۔ حُسن ہر طرف سے اُمڈا چلا آتا تھا۔ نظر نظر میں، نفس نفس میں سماتا جاتا تھا۔ ایک پردہ اُٹھتا تھا تو لاکھوں پردے گرتے تھے۔ لیکن یہ حُسن بہرحال بے جہت تھا۔ کبھی اِدھر سے نمایاں ہوتا کبھی اُدھر سے۔ اس حسنِ حقیقت نے انسان کو اُلوہیت بخشی، ملکوتیت بخشی، کیف دیا، سرمستی دی، سب کچھ دیا، سب کچھ سکھایا، انسان بنانا نہ سکھایا۔ اُدھر سے آنسو بہہ رہے تھے، اِدھر سے آنسو بہتے رہے۔ اور دو رسالہا سال کے اس پار مرشدِ کامل حضرت معروف بجولوی کا شاندار پُرنور چہرہ، اور اس کے پاس ہی سکینہ کا بے بس، محبت میں اور نفرت میں بے بس چہرہ سب ایک خلائے پُرنور میں حل ہو جاتے۔ کئی سال ہوتے حضرت معروف بجولوی کی سکینہ سے شادی ہو چکی تھی لیکن کیا ان دونوں کا وصل ان دونوں سے اس کا اپنا روحانی وصل نہیں تھا۔ اسے تمام عالم ایک ہمہ گیر مسلسل آغوش معلوم ہوتا۔ زندگی آغوش در آغوش معلوم ہوتی۔ جیب میں اگر دام ہوتے تو وہ کسی

ورنہ دیسی ٹھرا۔

اس کا کوئی خاص پیشہ نہ تھا۔ اس نے کئی پیشے اختیار کرنا چاہے۔ مگر شاعری کے سوا اور کسی پیشے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ مشاعروں کے لئے سکنڈ کلاس کا کرایہ۔ اور کبھی کبھی معاوضے کے روپیے آجاتے، پچاس سے لیکر ڈھائی سو تک۔ یہ زیادہ تر شراب پر خرچ ہو جاتے۔ کبھی بچ جاتے تو کوئی دوست زبردستی کپڑے بنوا دیتا۔ اس کا اپنا کوئی مکان نہ تھا۔ یو پی بھر میں ایک شہر سے دوسرے شہر، ایک قصبے سے دوسرے قصبے، ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں، وہ کسی کا نہ کسی کا مہمان ہو کے ہفتوں مہینوں رہتا، پھر میزبان یا اس کے نوکروں کی کوئی بات ناگوارِ خاطر ہوتی اور کہیں سے پیسے آجاتے تو وہ چل دیتا۔

بیس سال بیت گئے۔ حضرت معروف بجولوی کا انتقال ہو گیا۔ وہ ہفتوں روتا رہا۔ اور بالآخر سب کے کہتے سننے سے انکے مرقدِ مبارک کی زیارت کے لئے اس نے بجولی شریف کا ارادہ کیا۔ وہ گھر نہیں گیا جہاں سکینہ تھی۔ سیدھا خانقاہ شریف پہنچا۔ یہاں اپنا مختصر سا سامان ایک حجرے میں رکھوایا۔ غسل کیا۔ عطر لگایا۔ پہلے درگاہ شریف میں فاتحہ پڑھا۔ پھر اپنے مرشدِ کامل حضرت سید نسیم اللہ شاہ معروف کی قبر پر حاضر ہوا۔ وہاں پہنچنا تھا کہ زندگی کے آثار معلوم ہوئے۔ وہی رعب دار نورانی چہرہ سامنے تھا۔ تصورِ شیخ۔ کوئی اُسے گلے لگا رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا: "میں نے تیری تمام نالائقیوں کو معاف کیا۔" بیتاب ہو کے وہ مرقد سے لپٹ کے رونے لگا جس پر حال ہی میں گچی کا منقش کام ہوا تھا، اور نئی نئی ہری چادر چڑھائی گئی تھی۔

وہ اتنا رویا، اتنا رویا کہ اس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ پھر وہ اٹھا۔ میاں گھسیٹے نے کہا "بھیا! بی بی بلاوت ہیں۔ تھکے مانے اتنے برس بعد گھر آئے ہو۔ جرا کھانا کھائے لو"۔

اس نے انکار کیا۔ کہا "حضرت کے مرقد کی زیارت کر لی۔ اب واپس جاؤں گا۔ میری طرف سے سلام عرض کر دینا"۔ لیکن میاں گھسیٹے کے ہاتھ سکینہ کا پیغام پھر آیا "آخر تم میرے ماموں زاد بھائی بھی تو ہوتے ہو۔ ایک وقت کا کھانا کھاتے جاؤ تو کیا بگڑ جائے گا؟"

وہ گھر آیا۔ باہر کا صحن طے کر کے، اس نے ٹاٹ کا وہ پردہ اٹھایا جو زنانے دروازے پر پڑا رہتا ہے۔ صحن کی موری کے بیچ آنگن میں سکینہ کھڑی تھی۔ اس کے بالوں پر سفیدی غالب آ چکی تھی۔ اس سفیدی پہ دھوپ جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ فراق کی گھڑی کی وہ بیتابی اور بیقراری نہیں تھی۔ اس کی جگہ ایک ایسا غم تھا جو بیس سال تک دل کی گہرائیوں میں بس چکا تھا۔ لیکن اس ضبط کے پیچھے اب بھی نظر بیقرار تھی، ہونٹ کانپ رہے تھے، آنکھوں سے خاموش آنسوؤں کا سیلاب بہا چلا جا رہا تھا۔ سر سے قدم تک رعشہ تھا، لرزش تھی۔ لہریا دوپٹہ کی جگہ سفید بیواؤں جیسا دوپٹہ تھا۔ ہاتھوں کی چوڑیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ یہ وہ رومانی تصویر تھی جو واحد کو اپنی شادی اور اپنی شاعری کے زمانے میں اکثر نظر آیا کرتی تھی۔ وہ زندہ تھا۔ مگر سکینہ آنسو بہا رہی تھی۔ اور باوجود اس تمام عقیدت کے جو تصورِ شیخ سے وابستہ تھی، ایک لمحہ کے اندر واحد پہ یہ منکشف ہو گیا کہ یہ رعشہ، یہ لرزش سب اس کے لئے ہے، حضرت معروف پھلولوی مرحوم کے لئے نہیں۔

ایک بار پھر عدت کا زمانہ گزرا۔ ایک بار پھر سکینہ سے اس کا نکاح ہوا۔ اور وہ سنبھل گیا۔ اس کی رندی ذرا ذرا کم ہوئی۔ اس کی شاعری میں نشاط اور کیف کی کیفیت پھر سے پیدا ہوئی۔ سکینہ کے منع کرنے اور اس کی زبردستی کے باوجود وہ شراب پھر بھی چوری چھپے پی ہی لیا کرتا۔ کیونکہ کہتے ہیں ؎

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

حسن کے احترام نے مارا — عشق بے ننگ و نام نے مارا
وعدۂ ناتمام نے مارا — روز کی صبح و شام نے مارا
عشق کی سادگی تو ایک طرف — شوق کے اہتمام نے مارا
عشق مرتا نہ اپنی موت سے آہ — عاشقانِ کرام نے مارا

جگرؔ

قرۃ العین حیدر

میں نے لاکھوں کے بول سہے

خالدہ توفیق درختوں کے جھرمٹ میں سے نمودار ہو کر سیدھی میری جانب چلی آ رہی تھی۔ اس کے بال شانوں پر بکھرے پڑے تھے جن میں اس نے زرد رنگ کے دو جنگلی پھول اڑس رکھے تھے۔ دور سے وہ شانتی نکیتن کی کوئی بنگالی طالب علم معلوم ہو رہی تھی جو آمی کوشی موشی قسم کی باتیں کرتی ہو۔ لیکن جب وہ قریب پہنچی تو پتہ چلا کہ وہ خالدہ توفیق تھی۔ اور کوشی موشی بولو کرنے کے بجائے بہت ہی بڑھیا قسم کی ولائتی زبان بولتی تھی۔ اور جلدی جلدی اس طرح گویا اگلے لمحے اسے ٹرین یا ہوائی جہاز پکڑنے کے لئے بھاگنا ہے۔ مجھ سے اپنا تعارف کرا رہی تھی۔ "میں خالدہ توفیق ہوں۔ میں تمہیں جانتی ہوں۔ تمہیں بھی مجھے جاننا چاہئے۔ علاوہ اور سب باتوں کے آجکل قدیم اردو ادب پر ریسرچ کر رہی ہوں۔"

"بیٹھ جاؤ میرے پاس میری پیاری خالدہ توفیق۔" میں نے اس سے نہایت گرمجوشی کے ساتھ کہا۔ "اور مجھے اپنے قدیم اردو ادب کے متعلق بتاؤ۔ اور مجھے تمہارے بالوں کے یہ زرد خودرو پھول بے حد پسند آئے ہیں۔" وہ بالوں کو پیچھے سمیٹ کر میرے قریب تالاب کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ اور میں نے غوطہ لگانے کے تختے پر لیٹے لیٹے پہلی نظر میں، جیسا کہ لڑکیوں کا قاعدہ ہوتا ہے، اس کا مکمل اور مفصل جائزہ لے لیا۔ کہ کس طرح کے کپڑے پہنے ہے۔ ساڑھی کیسی ہے۔ بال کس وضع کے بنائے ہیں۔ اس اثنا میں یقیناً اس نے بھی میرا پورا پورا جائزہ لیا ہوگا۔ لیکن اس وقت اس کے جائزے کے لئے میرے پاس زیادہ چیزیں نہیں تھیں۔ کیونکہ میں تو لیے کے گہرے سبز رنگ کے ڈریسنگ گاؤن میں لپٹی غوطہ لگانے والے تختے پر اوندھی لیٹی تھی۔ پیر اوپر آسمان کی طرف اٹھائے تھے۔ اور سوچ رہی تھی کہ کالج اگر اس قدر جلد نہ کھلتا تو کیا برائی تھی اور اگر سرے سے کھلتا ہی نہیں۔ جب تو اور بھی کوئی حرج نہ تھا۔ لیکن واقعہ ہے کہ نئی ٹرم شروع ہونے والی تھی اور مجھے جلد ہی اپنی ہرے جنگلوں اور روپہلی جھیلوں والی اس خوبصورت اور پرسکون وادی کو چھوڑ کر شہر واپس بھاگنے کی تیاری کرنی تھی۔ ہوا کے جھونکے سے پیچیوں اور دیوداروں کے اس جھرمٹ کے پتے آہستہ آہستہ ہل رہے تھے جس کے وسط میں وہ شفاف نیلے پانی اور رنگ برنگے سنگریزوں والا تالاب تھا جس کے غوطہ لگانے کے تختے پر میں الٹی لیٹی تھی اور پیر اوپر آسمان کی طرف اٹھا رکھے تھے۔

خالدہ توفیق بے حد ترکی قسم کا اور اسمارٹ سا نام تھا۔ مجھ پر تھوڑا سا رعب پڑ گیا۔ اور میں نے تختے کے سرے پر اکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا۔ "بڑی

پیاری خالدہ توفیق آؤ میرے ساتھ ایک غوطہ لگاؤ۔" لیکن اس نے میری بات کاٹ دی اور بالوں کی لٹیں ہلا کر بولی "نہیں مجھے تمہارا یہ تالاب پسند نہیں آیا۔ میں اس میں تمہارے ساتھ غوطہ نہیں لگاؤں گی۔" یہ سنکر میرا دل ٹوٹ گیا۔ خالدہ توفیق کو یہ میرا پیارا شفاف نیلے پانی اور رنگ برنگے سنگریزوں والا تالاب پسند نہیں آتا۔ میں دل ہی دل میں ایک گہری، ٹھنڈی آہ بھر کے پھر غوطہ لگانے والے تختے پر لیٹ گئی اور پیر اوپر آسمان کی طرف اٹھا دیئے۔

"مجھے معلوم ہے۔" خالدہ توفیق نے تھوڑی دیر بعد پانی کی سطح کو غور سے دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

میں نے مری ہوئی آواز میں پوچھا "کیا؟"

"مجھے وادی کے اس حصے کا راستہ معلوم ہے جہاں ان نیلی پہاڑیوں کے پرے وہ بے حد خوبصورت جھیل ہے جس کے کناروں پر بہت سے سرخ پھول کھلتے ہیں اور گھاس میں ہرے رنگ کے نہایت شکیل مینڈک کودتے رہتے ہیں۔" اس نے آہستہ آہستہ جواب دیا۔

میں نے خوش ہو کر پوچھا "اور اس میں کنول کے پھول ہیں؟ اور سارس۔ اور لطخیں۔؟ اور کنارے پر کوئی پرانا درخت بھی کھڑا ہے جس کے سائے میں ہم اپنی ناؤ باندھ سکیں؟"

"ہاں۔ اس کے کنارے پر ایک پرانا درخت کھڑا ہے جس کے سائے میں ہم اپنی ناؤ باندھ سکیں۔" اس نے اسی انداز سے، یکساں آواز میں میری بات دہرائی اور پھر گھٹنوں میں سر دے کر افیمچیوں کی طرح بیٹھ گئی۔

میں بے حد خوش ہو کر تختے پر سے کود کے اس کے پاس آ گئی تھی اور اس جھیل کے تصور میں مصروف ہو گئی۔ مجھے محسوس ہوتا ہے میں کسی پچھلے جنم میں ایک چھوٹی سی چمکیلے رنگ کی انتہائی خوبصورت مینڈک تھی اور اپنے گاؤں کی تلیا میں رہا کرتی تھی۔ اور برکھا کی کالی راتوں میں خوب زور زور سے گایا کرتی تھی۔ اور ہمیشہ زکام بلکہ انفلوئنزا میں مبتلا رہتی تھی۔ مجھے صرف اپنے چاروں طرف پانی چاہیئے، دریا۔ ندی۔ جھیل۔ تالاب۔ چاہے بارش کے پانی کی چھوٹی سی صاف شفاف تلیا ہی ہو۔ ہر طرف پانی کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ یہ اتنا اچھا لگتا ہے اور پانی کے کنارے کی ٹھنڈی گھاس اور خودرو سفید پھول۔ ڈھیروں خودرو سفید پھول۔

"تم مِی مِی کو جانتی ہو؟" خالدہ توفیق نے دفعتاً گھٹنوں میں سے سر اٹھا کر مجھے غور سے دیکھتے ہوئے افیمچیوں کی طرح پوچھا۔

میں نے سر ہلا کر جواب دیا "نہیں۔ میں مِی مِی کو نہیں جانتی۔"

"آؤ میں تمہیں مِی مِی سے ملواؤں۔ مجھے وہ راستہ بھی معلوم ہے جو اس کے گھر کی طرف جاتا ہے۔ علاوہ اور سب باتوں کے۔" اس نے پتھر پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں تالاب کے کنارے پر سے چھلانگ لگا کر پگڈنڈی پر آ گئے۔ میں نے اپنے بئے کے گھونسلے جیسے بالوں کو کئی بار خوب زور زور سے جھٹک کر پانی کے چھینٹے چاروں طرف بکھیرے اور سر پہ تولیے کا حیدرآبادی صافے ایسا گنبد بنا کر جنگل کے خاموش راستے پر خالدہ توفیق کے ساتھ چل دی۔ ہمارے چاروں طرف گلہریاں تھیں جنگلی طوطے تھے۔ خرگوش تھے۔ اور جھرمٹ کے جھرمٹ سائے پر بدلیچیوں کی ٹہنیوں پر اکٹھے ہو کر شور مچا رہے تھے۔ وادی کے نشیب میں سے گزر کر پہاڑی کے اختتام پر صنوبروں میں گھرے ہوئے ایک چھوٹے سے پرانے سرخ رنگ کی چھت والے گھر کے سامنے پہنچے۔ ایسا گھر جو میں

اکثر کرسمس کارڈوں پر سفید برف سے ڈھکا ہوا نظر آتا ہے اور ایسا ہی کوئی پرانا، سرخ چھت اور شیشے کے برآمدوں اور سبز لکڑی کی جالیوں والا درختوں کے جھنڈ میں چھپا ہوا گھر اچانک نظر آ کر جانے کیوں یک لخت بڑا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہمیں ساری عمر صرف اسی جگہ پہنچنے کا انتظار رہا ہے۔ اور بالآخر اب کہ ہم یہاں پہنچ گئے ہیں۔ بڑی اچھی اچھی باتیں ہوں گی۔ اور عمدہ عمدہ چیزیں ملیں گی۔ چوکولیٹ کیک پریاں۔ خوب تیز گرم کشمیری چائے، اچھے دوست۔ پرانے گیتوں کے ریکارڈ۔

ہم آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر گئے۔ وہاں پر ہر طرف شکستہ جاپانی گلدانوں میں زرد پھول سوکھے ہوئے تھے اور پرانے چینی ریشم کے بے رنگ اور گھسے ہوئے پردے تھے۔ اور ڈھیروں قدیم وضع کا آبنوس اور شیشم کا بدرنگ فرنیچر ہر کونے کھدرے میں بے تحاشا ٹھنسا ہوا تھا۔ تاریک گیلری میں سے گزر کے خالدہ توفیق مجھے جلدی جلدی ایک لکڑی کے فرش والے کمرے میں لے گئی جو پہلی نظر میں دکھائی دیا کہ بیک وقت خوابگاہ، اور سٹنگ روم، اور اسٹوڈیو اور کھانے کے کمرے اور اسٹڈی کا کام دیتا ہے۔ وہاں، بے تے ونڈو کے نزدیک ایک گلابی رنگ کے شکستہ صوفے پر جس میں سے نواڑ اور مونج اور اسپرنگ کے تار باہر نکل آئے تھے مِی مِی ٹانگیں اوپر رکھے بیٹھی بے حد محویت سے ایک البم میں تصویریں چپکا رہی تھی۔ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ . . . . ہمیں دیکھ کر اس نے البم ایک طرف رکھ دیا اور خالدہ توفیق کی طرف باہیں پھیلا دیں اور مجھے ایک لمحے کے لئے بڑی کاہل اور پر اسرار نظروں سے دیکھا۔

"اس سے ملو۔ اسے میں نے ابھی آدھ گھنٹہ قبل تالاب کے کنارے دوست بنایا ہے۔ جہاں یہ خرگوش اور گلہریوں میں گھری، ایک مینڈکی کی طرح غوطہ لگانے کے تختے پر بیٹھی تھی اور فلسفۂ حیات پر غور کر رہی تھی۔" خالدہ توفیق نے اس سے کہا۔

"ہو ـــ" کہہ کر اس نے میری طرف بھی کاہلی سے باہیں پھیلا دیں۔ میں صوفے کے سرے پر بیٹھ گئی اور بالکل فرش سے جا لگی۔ میری ناک میں کہیں سے گرم چوکولیٹ کی خوشبو گھسی۔ اور میں نے چاروں طرف بے حد دلچسپی سے دیکھا۔ مجھے ایسا بھی یاد پڑتا ہے کہ میں اپنے کسی لعد جنم میں، مینڈکی کی جون سے پہلے، ایک نہایت لالچی قسم کی ایرانی یا انگورہ بلی رہی ہوں گی۔ میں نے سونگھا کہ قریب ہی کہیں کسی کمرے میں چوکولیٹ تیار کی جا رہی ہے۔

"یہ دیکھو بھئی ـــ یہ سرور کی نئی تصویر ہے جو اس نے مجھے دی ہے۔ جب میں پچھلی بار۔ تزئین کے ہاں دعوت میں گئی تھی۔" اس نے خالدہ توفیق سے کہا۔ میں نے انتہائی دلچسپی کے ساتھ اپنی جگہ سے اُچک کر البم کو جھانک کر دیکھا۔

"بھئی یہ میرا ایک کزن ہے۔ اس کی چھوٹی بہن تزئین کو شاید تم جانتی ہو جس کی شادی جسٹس عرفان کے نواسے سے ہوئی ہے۔" اس نے ذرا بے تعلقی اور استغنا سے مجھے مطلع کیا۔ میں نے مستعدی سے سر ہلایا۔ تزئین کو میں جانتی تھی۔ اس کے اس بھائی کو بھی جانتی تھی۔ اس کا نام سرور رہا ہوگا لیکن ہم سب تو اسے پتنگ کہتے تھے۔ کیونکہ وہ بیک وقت اتنی بہت ساری لڑکیوں کی پتنگ تھا۔ اور مستقل سب کی ڈوریں آپس میں کٹتی رہتی تھیں۔ چنانچہ یہ ممی بھی پتنگ کا مانجھا اپنے پاس رکھتی تھی۔ میری رگِ اسکنڈلیات پھڑک اٹھی اور پیٹ میں چوہے کودنے لگے۔ گھر جاتے ہی میں پتنگ کو فون کر کے بتاؤں گی کہ

اس کی ایک، ایڈمائیرر کو میں نے آج دیکھا۔ لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ وہ تو خود اس کا کزن ہے۔ صورتِ حال سے یقیناً خود ہی واقف ہوگا۔

ممی ممی کے اس کرسمس کارڈ والے گھر میں ہم دیر تک بیٹھے پتنگ کی باتیں کرتے رہے۔ اور اس نے ہمیں گرم گرم چوکولیٹ پلائی۔ پھر میں آسیہ اور خالدہ توفیق کو خدا حافظ کہہ کر باہر آگئی۔ اور سنسان جنگل میں سے گزر کے تیزی سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ کیونکہ دفعتاً مجھے یاد آگیا تھا کہ میں تولیے کا سبز رنگ کا ڈریسنگ گون پہنے ہوں۔ تھوڑی دور چل کر مجھے معروف ایک پگڈنڈی پر سے آتا دکھائی دیا۔ اس نے کندھے سے کیمرے اور الم غلم بہت سی چیزوں کا بیگ لٹکا رکھا تھا۔ اور کتھئی رنگ کے لباس میں بڑا شاندار شکاری معلوم ہو رہا تھا۔ چٹان پر سے کود کر وہ میرے قریب آگیا۔ اور ہم لوگ چناروں والے راستے پر خاموشی سے چلتے رہے۔ بادل گھر کر بہت نیچے جھک آئے تھے۔ اور ہوا میں جنگلی پھولوں اور سیب کے درختوں کی مہک امنڈ رہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ خوب زور سے سیٹی بجاؤں ٹارالارا ٹارالارا۔ لیکن دفعتاً مجھے یاد آیا کہ سیٹی بجانا لیڈی لائیک نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن چونکہ میں تو پچھلے جنم میں تالابوں اور جھیلوں میں رہا کرتی تھی اور برکھا رت میں سیٹیاں بجاتی تھی۔ اس لئے میرے منہ سے بالکل اتفاقاً زور سے ٹارالارا نکل گیا۔ پتنگ بے حد مصروفیت سے انتہائی غور و فکر میں ڈوبا لمبے لمبے قدم رکھتا آگے آگے چل رہا تھا۔ سیٹی کی آواز سن کر وہ چونکا اور اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور ڈپٹ کر پوچھا "کیوں بجا رہی ہو سیٹی؟"

"اس لئے کہ میں ابھی ابھی ممی ممی سے مل کر آرہی ہوں۔" میں نے ایک ٹانگ پر گھوم کر اس کی طرف مڑتے ہوئے بشاشت سے کہا۔

"ممی ممی سے؟ کون ممی ممی؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ارے بھئی ممی ممی۔ جو تزئین کی اتنی گہری دوست ہے۔ اور تمہاری کزن ہے۔ تمہاری چچا زاد بہن۔" میں نے تقریباً چلّا کر جواب دیا۔

اور اس وقت پتنگ نے انتہائی نامعقولیت کا ثبوت دیا۔ یعنی اس کے جذبۂ انانیت کو اس اطلاع سے بظاہر قطعی کوئی طمانیت نہ پہنچی حالانکہ اس کی قسم کے ڈون ژواں لوگوں کے شدید جذبۂ انانیت کا قاعدہ یہ ہے کہ ایسی اطلاعات سے بے حد خوش ہوتے ہیں کہ فلاں لڑکی نے تمہاری تصویر اپنے البم میں لگائی ہے۔ یا فلاں لڑکی کل شام تمہارے متعلق بار بار پوچھتی تھی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن مسرور پتنگ نے پلکیں جھپکا کر انتہائی لاعلمی کا اظہار کیا۔ کہ جہاں تک اسے معلوم ہے کوئی ممی ممی دور تک اس کی کسی قسم کی کزن نہیں ہے۔ یہ ممکن ہے کبھی بچپن میں اس نے یا تزئین نے ممی ممی کے ابا کو چچا کہہ کر پکارا ہو کیونکہ وہ غالباً اس کے ابا کے دوست تھے۔ یہ سن کر میرا دل بالکل ٹوٹ گیا۔

ہم لوگ پھر چپ چاپ چناروں والے راستے پر چلنے لگے۔ اس کے لمبے لمبے قدموں کی رفتار سے بالکل صاف ظاہر تھا کہ میری اس روح افزا اطلاع کا اس پر ذرا بھی خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ میں نے انتہائی غصے کے عالم میں پھر سیٹی بجائی۔ لیکن اس نے ڈانٹنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی اور اسی طرح غور و فکر میں مصروف آگے آگے چلتا رہا۔ اور پھر خدا حافظ کہہ کر اپنے گھر کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر مڑ گیا۔

میں تولیے کی پگڑی میں سے بالوں کو جھٹک کر تیزی سے گھر کی سمت روانہ ہوگئی۔ وادی کی تہہ میں نیلی نیلی دھند ایسی جمع ہو رہی تھی اور نشیب میں

رنگ برنگے پتھروں پر گرنے والے جھرنے گنگنا رہے تھے۔ میں نے ہاتھ پھیلا کر اپنی سمت بڑھتے ہوئے بادلوں کی خنکی اور نمی کو محسوس کیا۔ اور موسم کی دلفریبی اور کائنات کے حسن کے شدید احساس کی وجہ سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"تم می می کو جانتی ہو؟" خالدہ توفیق نے مجھ سے آہستہ سے کہا۔

"ہاں میں می می کو جانتی ہوں۔" میں نے سر ہلا کر جواب دیا۔ ہم دونوں چپ چاپ تالاب کے کنارے بیٹھے رہے۔ سہ پہر بہت گرم تھی، ہوا کا کوئی بھولا بھٹکا جھونکا پاس سے گذر جاتا۔ تالاب کا پانی ٹھنڈا تھا اور چاندی کی طرح جھلملا رہا تھا۔

"آؤ۔ خالدہ توفیق میرے ساتھ ایک غوطہ لگاؤ۔" میں نے دوبارہ تقریباً چلا کر اس سے کہا۔ اور سرعت سے پانی میں کود گئی۔ "جلدی آؤ۔" میں نے سر نکال کر اسے پھر آواز دی۔ وہ اپسراؤں کی طرح پتھر پر سے اٹھی اور سیڑھیاں اتر کر پانی میں آ گئی۔ جب ہم دونوں باہر نکلے تو بے حد خوش تھے، اس کا اپسرا پن کافور ہو چکا تھا۔

"خالدہ توفیق مجھے وہ نیلی پہاڑیوں کے پرے والی جھیل دکھائیے۔" میں نے انتہائی بشاشت کے ساتھ اس سے کہا۔

"نیلی پہاڑیوں کے پرے والی جھیل ـــــ؟" اس نے انجان پن سے پوچھا۔

میرا دل ڈوب گیا۔

"سنو۔" اس نے قریب آ کر رازدارانہ طریقے سے کہا۔ "ہم می می کے ہاں جا رہے ہیں۔ اس نے ہم سب کو مدعو کیا ہے۔"

"اسی چوکولیٹ والے گھر میں ـــــ؟" میں نے خوش ہو کر پوچھا۔

"چوکولیٹ والے گھر میں؟" اس نے پلکیں جھپکا کر دوہرایا۔

"ہاں۔ وہاں پریاں رہتی ہیں۔" میں نے یقینی طور پر اسے بتایا۔

"پریاں ـــــ؟" وہ آنکھیں جھپکتی رہی۔ میں اکتا کر چپ ہو گئی۔ اب بھلا بتائیے کہ کیا کیا جائے۔ یہ دنیا والے دراصل اتنے جغد ہیں۔ کھلی فضاؤں میں سیٹی بجا کر ایک ٹانگ پر ڈونالڈ ڈک کی طرح ناچنا لیڈی لائیک تصور نہیں کیا جاتا۔ اپنی چچا زاد بہن کو پہچاننا شان تہذیب کے خلاف ہے۔ اور پھر پریوں کے وجود کا کوئی قائل نہیں۔ حالانکہ میں نے خود می می کے اس اندھیرے کمرے میں پروں کی سرسراہٹ سنی تھی۔ جب میں بلی کی طرح صوفے کی پشت پر بیٹھی تھی اور می می البم میں پتنگ کی تصویر پر چپکا رہی تھی جو اس کا کزن تھا جس کی چھوٹی بہن کی شادی جسٹس عرفان کے نواسے سے ہوئی تھی۔

شام کو ہم سب اسی کرسمس کارڈ ایسے گھر کے چھوٹے سے باغیچے میں جمع ہوئے۔

"می می ڈیئر کل میں نے تمہارے کزن کو رنک میں دیکھا۔ وہ بھی تو رخصت لے کر گرمیاں گذارنے یہاں آیا ہوا ہے۔" رفعت نے اس سے کہا۔

"ہاں مجھے معلوم ہے۔ وہ میرا چچا زاد بھائی ہے اس کی چھوٹی بہن ـــــ" اس نے بتانا شروع کیا۔

"سب چائے کی میزوں کے گرد آ کھڑے ہوئے۔ ہوائیں درختوں میں گاتی رہیں۔

"می می ڈارلنگ تم نے پتنگ کو کیوں نہیں بلایا۔ وہ اتنا گیلنٹ ہے

"وہ ہمیں انگریزی گانوں کی پیروڈی کر کے سناتا ہے۔ سب کے ہاتھ دیکھتا ہے" میں نے اس سے کہا۔

"پتنگ ــــ ؟" اس نے پلکیں جھپکا کر پراسرار طریقے سے مجھے دیکھا۔

"ہاں۔ یعنی سرور۔ اپنا سرور جو ہے۔ تزئین کا بھائی۔" میں نے کہا

"تم اسے جانتی ہو ــــ ؟" اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

"ہاں آں۔ وہ میرا خالہ زاد بھائی ہے۔" میں نے بڑی بے تعلقی سے جواب دیا۔

"تمہارا خالہ زاد ــــ ؟" اس نے حیرت سے آہستہ آہستہ دہرایا۔

"اور میرا پھوپھی زاد بھائی ہے ؟" رفعت نے شگفتگی سے اسے اطلاع دی۔

"میرا ماموں زاد بھائی ہے۔" ریحانہ نے چہک کر کہا۔

"میرا ــــ ارے جلدی سے بتاؤ کوئی مناسب سا رشتہ" سلطانہ نے چپکے سے مجھ سے پوچھا۔

"تمہاری خالہ کی دیورانی کا بھانجا ہے۔" میں نے جلدی سے اس کے کان میں کہا۔

"میری خالہ کی دیورانی کے بھانجے کا ماموں ہے۔" سلطانہ تیزی سے کہہ گئی۔

"لیکن ممی ممی کی ٹانگ اس طرح نہیں کھینچیں گے۔" میں نے یک لخت بے حد سنجیدہ ہو کر سب کو آہستہ سے مخاطب کیا۔

"ہاں۔ ہم ممی ممی کی ٹانگ اس طرح نہیں کھینچیں گے۔" وہ سب بھی سنجیدہ ہو گئیں۔

"ممی ممی ڈیر۔ تو پھر کب ہے۔ ہیپی ایونٹ ــــ ؟" جمیلہ نے بڑی شرافت اور سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہیپی ایونٹ ــــ ؟" وہ بچوں کی طرح کھکھلا کر ہنس پڑی۔ "عنقریب ہی تم سب کو دعوت نامہ مل جائے گا۔" ذرا ٹھہر کر اس نے بے تعلقی کے ساتھ کہا۔

سب نے پیڑوں اور درختوں کی نیچی شاخوں پر چڑھ کر تہنیت کا کورس شروع کر دیا۔

میں انتہائی افسردگی سے غوطہ لگانے کے تختے پر اکڑوں بیٹھی تھی۔

"اتوار کو ہم سب مچھلیاں پکڑنے ندی کی طرف جا رہے ہیں۔" خالدہ توفیق نے کنارے پر سے گزرتے ہوئے جلدی جلدی کہا۔

"واقعی ــــ ؟" میں اچک کر کنارے پر آ گئی۔ لیکن خالدہ توفیق اپنی برق رفتاری کے ساتھ بہت آگے جا چکی تھی۔

"سرور سے کہنا اپنے ہاں سے ایک آدھ ٹرک بھجوا دے۔" اس نے درختوں میں غائب ہوتے ہوئے چلا کر کہا۔

میں فوراً اگنڈنڈیاں پھلانگتی گھر کی طرف بھاگی۔ اور سرور کو فون کیا۔ "ہمیں ایک ٹرک بھجوا دو یا دو تین جیپ گاڑیاں لے کر خود آ جاؤ۔"

"لیکن سنو تو ــــ" اس نے کہنا شروع کیا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے جلدی جلدی کہا۔ "ہم پکنک کے لئے تمہاری طرف آ رہے ہیں۔ اور ہمارے ساتھ ممی ممی بھی ہو گی۔ جو تمہاری کزن ہے۔ لہٰذا تمہارا اس پارٹی میں شامل ہونا بہت ہی ضروری ہے۔"

"سنو تو سہی ـــ میں اتنا بیش قل ہوں۔ یقین فرماؤ کہ لڑکیوں سے سخت شرماتا ہوں تم ٹرک قطعی منگوا لو، لیکن میں اتوار کی صبح ہی کو یہاں سے کھسک جاؤں گا" یہ کہہ کر گدھے نے رسیور رکھ دیا۔

اتوار کو جب ہم سب گاڑیوں اور رکشاؤں پر لد پھند کے ندی کے کنارے پہنچے تو تزئین کے چپراسی سے معلوم ہوا کہ بھیا صاحب تو صبح ہی تڑکے پہ چلے گئے۔ میں نے ممی ممی کی طرف دیکھا، وہ بہت ایسی سفید شلوار اور سیاہ دوپٹے میں اتنی پیاری معلوم ہو رہی تھی، میرا دل بالکل ہی ٹوٹ گیا۔

پھر ممی ممی نے بے حد سنجیدگی کے ساتھ مجھ سے کہا: "سنو، تم مجھے بہت پسند ہو۔"

"شکریہ" میں نے انکسار سے جواب دیا۔

"تم میری دوست بن جاؤ۔"

"بن تو گئی" میں نے مستعدی سے جواب دیا۔

"نہیں ـــ دوست اس طرح کہ ـــ کہ ـــ" وہ رک گئی۔ "اسے مجھے خلوص چاہیے۔ صرف خلوص۔ وہ کہیں نہیں ملتا۔" پھر وہ چپ ہو گئی اور میرے البم کے ورق الٹتی پلٹتی رہی۔

"تمہارا خاندان بہی سارا گڈ ٹکڈ ڈ نکا ہے۔" اس نے تھوڑی دیر بعد پھر بات شروع کی۔

"ہیں ہیں ہیں ـــ واقعی ـــ؟" میں نے بے حد کسر نفسی سے کام لیا۔

"ارے، سرور اور اس کے گھر والوں کی تصویریں تمہارے پاس کیسے؟" اس نے دفعتاً ایک صفحے پر نظریں جما کر پوچھا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا نا ـــ وہ میرا خالہ زاد بھائی ہے" میں نے بے تعلقی سے جواب دیا۔

وہ خاموش ہو گئی۔

"ممی ممی" تھوڑی دیر بعد میں نے پکار، لخت اسے مخاطب کیا۔

"ممی ممی ـــ تم نے پریاں دیکھی ہیں؟"

"پریاں ـــ؟"

"ہاں، تم نے کبھی پھولوں، گلہریوں، خرگوشوں سے دوستی کی ہے؟"

"نہیں ـــ؟"

"تم نے کائنات کا حسن دیکھا ہے؟"

وہ چپ رہی۔

"میرے ساتھ آؤ" میں نے اس سے پھر کہا۔ اور اسے باہر ہری وادی میں لے آئی۔ جس طرح دو بچے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام کر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ پگڈنڈیوں پر سے گزر کر ہم درختوں کے جھرمٹ میں چھپے ہوئے تالاب کے کنارے پہنچ گئے۔ وہاں پر چاروں طرف خوبصورت پھول تھے اور پلوؤں میں سے چھنتی ہوئی سورج کی نرم اور غلافی کرنیں تھیں اور ہوا میں نم اور تر و تازہ گھاس کی مہک تھی۔ میں غوطہ لگانے کے تختے پر اکڑوں بیٹھ گئی۔

"تم نے کبھی پانی سے محبت کی ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"پانی سے ـــ؟" اس نے آہستہ سے، اپنی آنکھیں پھیلاتے ہوئے دہرایا۔

"ہاں۔ آؤ میرے ساتھ غوطہ لگاؤ" میں نے اس سے کہا۔ وہ کنارے پر کھڑی رہی ساکت اور پرسکون نیلگوں پانی کی سطح پر اس کے چہرے کا

عکس لرزتا رہا۔

"تم نے دیکھا" میں نے چاروں طرف نظر ڈال کر کہا "یہ سب کتنا خوبصورت ہے۔ ثمرو سے زیادہ خوبصورت۔ تمہیں ان پھولوں، ان کرلوں، ان برف پوش پہاڑوں کا حسن پسند نہیں ہے؟"

وہ اسی طرح چپ چاپ پانی کو تکتی رہی۔ میں نے اپنے بنے کے بھونڈے ایسے بال بڑی مشکل سے سیدھے کئے اور انہیں پن سے اوپر کی طرف سمیٹ کر پانی میں کود گئی۔ پانی ٹھنڈا تھا۔ پرسکون اور طمانیت بخش۔ "ہوبی آؤ۔ غوطہ لگاؤ۔" پھر سے پانی میں سے اپنا حماقت زدہ سر نکال کر چیخ کر چلائی۔

لیکن تالاب کا کنارہ سنسان پڑا تھا۔ وہ وہاں سے جا چکی تھی۔

میں غوطہ لگانے کے تختے پر پھر نہایت اکتاہٹ اور افسردگی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اور تھک کر اوندھے لیٹ کر پھر اوپر آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے مجھے دفعتاً پھر یاد آیا کہ چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں، کالج کھلنے والا ہے اور مجھے پھر شہر کی طرف واپس جانا ہے۔

"چنانچہ دیکھا تم نے۔ کہ ثمرو نے اس پرسکون وادی میں داخل ہوتے ہی کتنی گڑبڑ پھیلا دی۔ خالدہ توفیق نے درختوں سے نمودار ہو کر قریب آتے ہوئے کہا۔ جیسی تم ہی کہتی تھی —" وہ پتھر پر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے بولی "کہ — مت جا چمن میں لالن، بلبل پہ مت ستم کر

گرمی سوں تجھ نگہ کی گل گل گلاب ہووے گا۔!"

میں نے کاہلی سے ایک آنکھ کھول کر اسے دیکھا۔ دفعتاً مجھے یاد آیا کہ وہ قدیم اردو ادب پر ریسرچ کر رہی ہے۔ تختے پر لیٹے لیٹے کروٹ بدل کر میں نے عرض کیا۔

"ٹھیک کہتی ہو میری پیاری خالدہ توفیق ہے

مجھ کوں ہوا ہے معلوم اے مست جام خوبی

تری انکھیاں کی دیکھی عالم خراب ہووے گا!!

خالدہ توفیق نے نہایت زور شور سے داد دی۔ میں جھک کر تسلیم بجا لائی، چنانچہ خاصے مشاعرے کا لطف آ گیا۔

ہم دونوں پھر افیمچیوں کی طرح تالاب کے کنارے گھاس پر جا لیٹے۔ وقت گذرتا گیا۔ نقرئی ناگن کی طرح لہراتی ہوئی تیزی سے جھلملاتے پانی والی پہاڑی ندی گھنے جنگل کے درختوں میں سے جھلکتی رہتی۔ گرمیوں کی دوپہر کا بھاری بھاری پن وادی کے جنگل میں دوگنا ہو جاتا۔ گہری سبز گھاس، سرخ لیچیاں، تیز نیلا آسمان، فضا کی غنودگی، پانی کی خاموش روانی۔ شہد کی مکھیاں جھاڑیوں میں گونجنا شروع کر دیتیں۔ اور نیند آنے لگتی۔ درختوں کی پتلی پتلی شاخیں پراسرار انداز سے سانپوں کی طرح ایک دوسرے سے لپٹی ہوتی ہوا میں جھولتی رہتیں۔ کوئی اکیلی فاختہ چیختی ہوئی بادلوں میں سے اڑ جاتی۔ سکوت گہرا ہو جاتا۔ میں غوطہ لگانے کے تختے پر لیٹے لیٹے پانی کو دیکھتی رہتی اور مجھے اپنی پچھلے جنم کی مینڈکی کی جون یاد آ جاتی اور میں ہنس پڑتی۔ اور اس ہنسی کی آواز دیر تک جنگل کی فضا میں گونجتی رہتی۔ خالدہ توفیق کاہلی سے آنکھیں کھول کر افیمچیوں کی طرح پوچھتی "کیوں ہنسی تھیں؟ بالکل دیوانی ہو!"

چھٹیاں ختم ہوئیں۔ اور ہم سب پھر شہر واپس آ گئے۔ جہاں کالج تھے اور کلب تھے۔ اور سیاسی جھگڑے تھے۔ اور تنگیں تھیں۔ ثمی بھی اس سال وہاں آئی تھی۔

"یہ کون لڑکی ہے ـــ؟" میرے پیارے بھائی ٹوٹٹ نے مجھ سے چپکے سے کلب میں پوچھا۔

"یہ ـــ؟ ممی ممی ـــ ممی ممی ـــ" میں نے جلدی سے اسے بتایا۔

"میاؤں ـــ میاؤں ـــ؟" اس نے معصومیت سے پلکیں جھپکا کر پوچھا۔

"ارے نہیں بھئی ـــ اتنے چغد ہو تم ـــ" میں نے اکتا کر کہا۔ اور آگے چلی گئی۔ جہاں سرور چند خواتین کو ہاتھ دیکھنے کے مشغلے سے محظوظ کر رہا تھا۔ اور وہ اپنے چھوٹے چھوٹے معنوی، نقرئی قہقہے فضا میں بکھیر رہی تھیں۔ وہاں جا کر میں اور بھی زیادہ اکتا گئی۔ کیونکہ یہ سب اعلیٰ قسم کی چمکیلی، شاندار سوسائٹی کی خواتین، بیوقوف تھیں۔ لاؤنج میں سے نکل کر میں باہر آگئی اور گھاس کے ایک سنسان قطعے پر خالدہ توفیق کو بیٹھا پایا۔

"واقعہ یہ ہے۔" خالدہ توفیق نے گھاس کا تنکا توڑ کر کلب کی روشن عمارت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کہ یہ سرور کچھ اس قسم کا انسان معلوم ہوتا ہے جو اپنی شادی سے پہلے شادی شدہ عورتوں سے عشق کرے گا، اور شادی کے بعد غیر شادی شدہ لڑکیوں سے عشق کرے گا اور ـــ"

"اور یا شاید شادی کرے گا ہی نہیں۔" جمیلہ نے کہا۔

"یہ تو واقعی بے حد غور طلب مسئلہ ہے۔" میں نے ان دونوں کے قریب روش پر اکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے بھئی یہ تو غضب ہو گیا!" دفعتاً چنبیلی کی کیاری پھلانگ کر تیزی سے ہماری سمت آتے ہوئے چلائی۔

"کیا ہوا ـــ؟" خالدہ توفیق نے سستی سے پوچھا۔

"کیا ہوا ـــ؟ ارے بھئی تم لوگ تو موقع کی نزاکت و اہمیت سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتیں۔ دیکھتی نہیں ہو کہ سامنا اس قدر صفائی سے پتنگ کاٹنے لئے جا رہی ہے۔ اور ہم سب ممی ممی کی کچھ مدد نہیں کر سکتے کیا غضب ہے۔" وہ بھی ہمارے پاس آکر اکڑوں بیٹھ گئی۔

"واللہ ـــ؟ سچ کہو ـــ؟" میں نے چونک کر پوچھا۔ "اس دنیائے فانی میں اب بھلا آپ ہی بتائیے کہ کس کا اعتبار کیا جا سکتا ہے!"

"تو کیا بالکل ہی کٹ گئی پتنگ ـــ؟" میں نے رقت بھری آواز میں سوال کیا۔ قومی ہمدردی کے مارے میرا جی چاہا کہ اسی وقت سرور کو کو لاؤنج میں سے باہر کھینچ لاؤں اور ساری پنچائت کے آگے اس سے پوچھوں کہ کیوں تم اتنے گدھے اور اُلو ہو۔ نامعقول۔ ممی ممی کو کیوں اپنی تصویریں دی تھیں جو اس نے اپنے البم میں سجائی تھیں اور ہم سب کی چا دی تھی۔"

جب وہ اندر سے نکلا تو برساتی میں جا کر میں نے تقریباً چلا کر اس سے کہا۔

"سرور تم نے ہماری ممی ممی کو کیوں ـــ"

"کون ممی ممی بھئی۔" اس نے سیڑھیوں پر سے اترتے ہوئے پلٹ کر میری بات کاٹ دی۔ پھر اسے گویا دفعتاً یاد آگیا اور اس نے ہنس کر کہا۔ "اچھا وہ ـــ جو میری کزن ہے؟"

"تم نہایت گدھے ہو سرور۔" غصے کے مارے میرا جی چاہا کہ رو دوں وہ کھکھلا کر ہنس پڑا۔ "اچھا اپنی ممی ممی یعنی میری کزن سے کہہ دینا کہ اگلے ہفتے ترنّم کے بچّے کی سالگرہ پر ضرور آئے۔" اس نے کہا۔

"واقعی ـــ؟ یعنی سرور، تم ممی ممی کو خود مدعو کر رہے ہو ـــ؟" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں ہاں بھئی۔ حالانکہ تم جانتی ہو میں اتنا بیش فل ہوں ـــ" وہ ہنستا

ہم اپنے دوستوں کے مجمع میں غائب ہو گیا۔

"دیکھو تو سہی۔ کیوں دی تھیں اس نے ممی ممی کو تصویریں۔ ایک نہ دو پوری آٹھ —" میں نے گھاس پہ واپس آ کر غصے سے کہا۔

"یہ ایک حقیقت ہے کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے پتنگ کا یہ رویہ بہت ہی قابلِ گرفت ہے۔" رفعت نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"بلکہ اس کا سیاسی اور معاشی اور نفسیاتی اور عمرانی اور بین الاقوامی پہلو بھی بہت زیادہ تابناک اور امید افزا نہیں ہے۔" جمیلہ نے اور بھی زیادہ سنجیدگی سے سر ہلا کر ارشاد کیا۔

"لیکن واقعہ یہ ہے —" خالدہ توفیق نے گھاس پر سے اٹھتے ہوئے ایک جمائی لے کر کہا "کہ یہ غور تصویریں پتنگ نے قطعی کسی کو دی دلائی نہیں تھیں۔ بلکہ ہماری ممی ممی ایک روز خود ہی تزئین کے البم میں سے نکال لائی تھی۔"

ہم سب کا ہارٹ فیل ہو گیا۔

تزئین کے ہاں کی تقریب سے ایک روز پہلے ہمارے ہوسٹل میں بالکل رت جگے کا مزا آ گیا۔ ہم سب نے رات گئے تک لیمپوں کی روشنی میں ممی ممی کے دوپٹے اور غرارے پر کچلے گوٹے اور مسالے کی ٹکائی کی۔ گھنٹوں ممی ممی کے ہیر اسٹائل کے متعلق بحث کرتے رہے۔ جمیلہ کا زمرد کا سیٹ اس کے گھر سے منگوایا گیا۔ اپنے اکلوتے کندن کے جھمکے جو میں بڑی ترکیب سے اس اتوار کی شام گھر سے ہوسٹل آتے ہوئے امی سے چھین لائی تھی۔ انتہائی قومی جوش میں آ کر ممی ممی کو عنایت کر دیے۔ بہت دیر تک ہم سب "تیری اڑائی میں تو خوب ہی اڑی جیسے پتنگ پیچھے ڈور بھی توبہ ہی توبہ۔ تیری چلائی میں تو خوب ہی چلی۔ جیسے انجن پیچھے ریل بھی توبہ ہی توبہ" الاپتے رہے اور میز اور چائے کی کشتی کی ڈھولک بجتی رہی۔

لیکن جب اگلے روز ہماری ممی ممی چینی گڑیا کی طرح سجی سجائی جسٹس عرفان کے ہاں تقریب میں پہنچی تو کسی نے بے پروائی سے اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے ذکر کیا کہ چھوٹے بھیا صاحب کو کسی سرکاری کام سے صبح ہی صبح کانپور جانا پڑ گیا ہے۔

"ننھی تارا — یہ تمہاری میاؤں میاؤں جو ہے —" میرے پیارے بھائی ٹوٹٹ نے کہنا شروع کیا۔ وہ جب نیکی کی جون میں ہوتا تو مجھے بڑے لاڈ سے ننھو تارا کہہ کر پکارتا تھا۔

"اچھا بھئی ٹوٹٹ چپ رہو" میں نے اکتا کر کہا۔ وہ نہایت فرمانبرداری سے چپ ہو گیا۔ اور پھر آرام کرسی پر اکڑوں بیٹھ کر اپنی نئی درخواست لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ ٹوٹٹ کا اصل نام رویندر موہن سکسینہ تھا لیکن بچپن میں جب وہ چھوٹا سا تھا، تو ہم سب اسے ٹامیٹی ٹوٹٹ کہتے تھے، بڑے ہو کر بھی ہم اسے اسی نام سے پکارتے رہے۔ لیکن ٹامیٹی کے لفظ پر اس نے سخت احتجاج کیا کیونکہ اس سے اس کا جذبہ مردانگی و جذبہ انانیت شدت سے مجروح ہوتا تھا۔ جو کہ مردوں کی فطری کمزوری ہے لہذا سب اسے صرف ٹوٹٹ ہی کہنے لگے۔ ہالینڈ ہال میں جب وہ تھا تو اس نے نہرو کے ساتھ طرح طرح کے مزیدار کورس بنائے تھے جو ان دنوں ہٹ

لیڈرز کی یاد میں آج تک وہاں کے کامن روم میں رات کے وقت گائے جاتے ہیں۔ اور اپنے حسن کی وجہ سے وہاں کے انگلش ڈپارٹمنٹ کے مشہور معروف پروفیسر اور اردو کے نامور شاعر و نقاد کا وہ بھی منظورِ نظر رہ چکا تھا۔ ان پروفیسر صاحب کے متعلق وہ اکثر ہم سب کو بڑے دلچسپ قصے سنایا کرتا تھا۔ مثلاً یہ کہ وہ انگلش لٹریچر پر اردو میں لکچر دیتے تھے۔ اور اس طرح دیتے تھے جیسے سچ مچ کا اردو ادب پڑھا رہے ہوں۔ کرسی پر اکڑوں بیٹھ کر وہ شروع کرتے — "چنانچہ شیلے کے تصوری کائنات کا ابہام استدلالی" اور لڑکے کلاس میں بیٹھے بیٹھے چپکے چپکے تصویریں بناتے یا اونگھتے۔

کلاس کی سب سے پیچھے کی کرسیوں پر بیٹھ کر لکچرز کے دوران میں کارٹون بنانے یا اونگھنے یا کاپی پر لکھ کر ایک دوسرے سے باتیں کرنے کا زمانہ زندگی کا بہترین اور سنہرا دور ہوتا ہے۔ ایسا دور جو پھر کبھی واپس نہیں آتا۔ اس سنہرے زمانے میں ٹوٹ نے بھی اپنی کاپیوں پر نظمیں لکھی تھیں اور اس کا ارادہ تھا کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ ان زیرِ دست تاریخی نظموں کا انڈین پریس یا کتابستان سے بے حد شاندار مجموعہ شائع کروائے گا۔ اور اسے معنون کرے گا۔ ان تمام بدقسمت لڑکیوں کے نام جن سے وہ آج تک عشق نہ کرسکا۔ لیکن میرے پیارے بھائی ٹوٹ کی یہ تمنا پوری نہ ہوسکی۔ اور مجموعہ شائع کرانے کے بجائے اب وہ دن رات اس فکر میں رہتا تھا۔ کہ اس مقابلے میں نکل آئے، اس انتخاب میں لے لیا جائے۔ اس بڑے آدمی سے تار کھنچوائے۔ رایا لینڈ ہال کا قومی ترانہ بیت گئی ہے اشٹمی وہ کب کا بھول چکا تھا۔ اور ہر سمے نت نئی درخواستیں لکھا کرتا تھا۔ ایک روز اس سے کسی نے پوچھا "بھائی رو رینڈ رٹم کیا کرتے ہو — ؟" تو اس نے بے حد شگفتگی سے جواب دیا تھا — "پدرم ڈپٹی کلکٹر در سلیکشن گریڈ بود۔ رائے بہادر برجنیدر موہن سکسینہ کے نام نامی سے آپ ضرور واقف ہوں گے جو سلیکشن گریڈ میں آئے تھے اور ڈپٹی کمشنر جی کے اعلیٰ عہدے سے ریٹائر ہوئے لیکن بدقسمتی سے لوگوں کو انہیں ڈپٹی صاحب ہی کہنے کی عادت پڑی رہی لہٰذا وہ اب تک محض ڈپٹی صاحب کے لقب ہی سے مشہور ہیں۔ میں ان ہی کا لائق فائق فرزند ارجمند ہوں۔ قوم اور خاندان کی مجھ سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ اب تک اپنے۔ آئی کی پندرہ اور اپنی گوت کی بائیس سسندر، چترا سوشیل، الکشمی، امودت، سرسوتی سمان منوہر کنیاؤں کے لئے بات آچکی ہے۔ کشمیری پنڈت ہوتا تو فوراً فارن سروس میں بھی لے لیا جاتا۔ فی الحقیقت ایک نہایت ہی زریں مستقبل میرا انتظار کر رہا ہے۔ بس ذرا سی وائر پلنگ کی کسر ہے۔"

ٹوٹ کی وائر پلنگ اب تک ختم نہیں ہوئی تھی اور وہ آرام کرسی پر اکڑوں بیٹھا پبلک سروس کمیشن والوں کو خط لکھ رہا تھا۔ خان بہادر ابو محمد کا انتقال ہو چکا تھا جو ہمارے برجنیدر چاچا کے بہت گہرے دوست تھے یہ بات میں نے اسے یاد دلائی۔ لیکن وہ نہایت مستعدی سے بیٹھا اپنی درخواست میں اپنی ساری قابلیتوں کی تفصیل لکھنے میں مصروف تھا۔ الہ آباد یونیورسٹی یونین کا وہ پریزیڈنٹ رہا۔ اس نے یہ کیا۔ اس نے وہ کیا۔ اتنے میں سرور اپنا سرکاری کام ختم کر کے کانپور سے واپس آن پہنچا۔ وہ وائر پلنگ اور مقابلے کے امتحانوں اور درخواستوں کے سارے بیڑے پار کر چکا تھا۔ اور اب اور آگے فارن سروس میں نکل جانے کی فکر میں تھا۔ ان دنوں فارن سروس کا تذکرہ فیشن میں داخل ہو گیا تھا۔ ہر تیسرا آدمی واشنگٹن

لندن، قاہرہ یا طہران یا امریکہ جانے کے لیے تُلا بیٹھا تھا۔ اور اس طرح باتیں کرتا گویا بس اگلے ہوائی جہاز سے اڑنے ہی والا ہے۔

مجھے دیکھ کر سرور نے بےحد سنجیدگی سے ایک سیلوٹ جھاڑا اور بےفکری سے سیٹی بجا کر چاروں طرف نظر ڈالتے ہوئے اس نے ٹوٹ سے پوچھا "کیا کر رہے ہو بھائی جالینوس ــــ؟"

"جھک مارتا ہوں" ٹوٹ نے بگڑ کر جواب دیا۔ اور پھر اپنے کاغذات پر جھک گیا۔

"کیوں بھئی کیسی رہی تمہاری کل کی پارٹی۔ کون کون تھا۔ ممی جی آئی تھیں تمہاری؟" سرور نے پلٹ کر مجھ سے پوچھا۔

"ڈوب جاؤ تم خدا کرے" میں نے غصّے سے سرخ ہو کر کہا۔

"نہ گومتی اتنی گہری ہے نہ تمہارا سوئمنگ پول" اس نے بےفکری سے جواب دیا۔

"اتنے بےحیا ہو تم سرور ــــ اُلّو ــــ" میری آواز پھر رقت انگیز ہو گئی۔

"یہ تو تم لوگوں کی ہم لوگوں سے بہت پرانی شکایت ہے ہیں نا بھائی ٹوٹ ــــ؟ اب یار کیا بور ہیت پھیلائے ہو چلو ٹینس کھیلیں۔" اس نے ٹوٹ سے مخاطب ہو کر کہا۔

ٹوٹ انتہائی بےنیازی سے کاغذوں پر جھکا رہا۔

"یار کچھ میں مدد کر سکتا ہوں تمہاری ــــ؟" سرور نے سنجیدگی سے ٹوٹ کی آرام کرسی کے ہتھے پہ بیٹھتے ہوئے کہا "فنانس والوں کو تو سب کو میرے ہاتھ میں سمجھو۔ سر ونکٹا چلم رگھو اچاری سے لے کر ــــ"

"اماں چپ رہو یار ــــ" ٹوٹ نے جھنجلا کر کہا۔ سرور سیٹی بجا کر چاروں طرف دیکھتا رہا۔

"او ہو ٹوٹ بھائی تم نے انگریزی بھی پڑھنی شروع کر دی؟" اس نے الماریوں میں رکھی ہوئی انگریزی ادب کی کتابوں پر نظر ڈال کر بڑی شگفتگی سے پوچھا۔

میرے پیارے بھائی ٹوٹ کو ہنسی آ گئی میں بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی، اس میں لطیفہ یہ تھا کہ ٹوٹ انگریزی کا فرسٹ کلاس فرسٹ ایم۔ اے تھا۔ اور ڈاکٹر دستور سے لے کر امر ناتھ جھا تک کے اس کے پاس اتنے نفیس سرٹیفکیٹ موجود تھے۔

"تم تو ٹوٹ بھائی بالکل گدھے ہو دراصل ــــ" سرور نے تھوڑی دیر بعد ٹھٹکا "تم یہ کیوں نہیں کرتے کہ ــــ کہ ــــ"

"کیا ــــ؟" ٹوٹ نے قلم ایک طرف رکھ کر پوچھا۔

"کہ بس آ جاؤ ایک دم سے منقلب میں" سرور نے اسے انتہائی آسان ترکیب بتا دی۔

"تم بھی بس آئے تھے ایک دم سے۔ آنکھیں بند کر کے بسم اللہ پڑھ ڈالی تھی۔ ؟ ایں ــ کیوں بے اُلّو کے بھائی ــ ؟" ٹوٹ نے بگڑ کر پوچھا۔

"جہنم میں جاؤ تم ــــ" پھر سرور نے رک کر کہنا شروع کیا۔ "بھائی میرے، ہمارے تو آپا میاں نے شہید ثالث اور خواجہ اجمیری کے مزاروں پر کھوئے کے پیڑوں سے بھری ہوئی چاندی کی مشکیوں کی منت مانی تھی۔ ممی اور نین تارا اور ترنگنی نے امام باڑوں میں تعزیے رکھوائی تھیں۔ جوگی پور جا کر چاندی کے علم چڑھائے گئے تھے۔ اور جو ٹین کے چھوٹے چھوٹے خداؤں کو

ایٹ ہوم دیے گئے۔ وہ علیحدہ۔ تم بھی ہمارے سنٹرل اور پروونشل دیوتاؤں کو دل پاک سے خوش کرو، پرکماں کرتے علی گنج جاؤ، تب جاکر کہیں بھگوان راضی ہونگے کہ ایک امپیریل سروس اور ایک چتر، سوشل، بلکہ سوشلسٹ، بالکل مجھے لکشمی پنڈت سمان منوہر کنیا عنایت فرمادیں۔ الٰہی غنچۂ امید بکشا۔" سرور نے بات ختم کرکے تحسین طلب نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"ابے چپ رہ۔ کیا بکشا و لکشا لگا رکھی ہے۔" ٹوٹ نے چڑ کر کہا۔

"یار خوب یاد دلایا۔ ابھی چھ بجے دلکشا کلب میں میرا ایک بیحد ضروری اپوائنٹمنٹ ہے۔" سرور برآمدے میں سے نیچے گھاس پر کود گیا۔

"وہاں میاؤں میاؤں بھی آئے گی آج ——" ٹوٹ نے اسے پھاٹک کی طرف جاتا دیکھ کر چلا کے کہا۔

"ہیں —— کیا واقعی؟" سرور جاتے جاتے گھبرا کر ٹھٹھک گیا۔

ٹوٹ ہنس پڑا۔ "وہی تو میں بین تارا سے پوچھتا تھا۔ کیا یہ افواہ صحیح ہے کہ میاؤں میاؤں غم دل میں مبتلا ہو کر تارک الدنیا ہونے والی ہے؟"

"ہاں ہاں —— واللہ یہی میں نے بھی سنا ہے۔" سرور چلایا۔ "کہ وہ بھی ساری دنیا تیاگ کر دلکشا کلب کے ایک کونے میں بھگوان سے لو لگانے والی ہے۔ بھئی واللہ کیا کیا لونڈیاں اللہ میاں نے انواع و اقسام کی پیدا کی ہیں"

پھر وہ سیٹی بجاتا دلکشا کی طرف نکل گیا۔

"کرابولیا پیل گئے ہیں۔ زیرباد کہ ملک کے ہاتھیوں کے جنگل میں ایک برس تیہوں نہیں پڑیا۔ ہور بادل سوں ایک بوند نہیں ٹپکا۔ ایسا ڈکال پڑ گیا کہ ہاتیاں پیاس سوں لاچار ہو کر اپنے بادشاہ کے پاس فریاد گئے۔ پادشاہ بول دیا کہ پانی کے خاطر چو طرف دوڑو۔ ہور بہت ڈھونڈو۔ ہاتیاں اوس ملک کے اور سب چوپڑ میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایک گنٹا نکالے۔ کہ اس کا ناؤں چندر گڑھا تھا۔ اور بہت ڈونگا اس لیے پانی تھا۔ پادشاہ اپنا لشکر لے کر اوس میں پانی پینے گیا۔ اوس کے آس پاس ہتوڑے خرگوشاں بستے تھے۔"

"کیا ——؟" میں نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"ہاں —— ہور ہاتھیاں کے گودھن سوں وہ بہت ستائے جاتے تھے"

خالدہ توفیق نے جو قدیم اردو ادب پر ریسرچ کر رہی تھی سامنے پڑی ہوئی ایک بےحد موٹی کتاب پڑھتے پڑھتے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

"کیا چنڈو خانے کی اڑا رہی ہو ——" میں نے بگڑ کر کہا۔

خالدہ توفیق نے زور سے کتاب بند کر دی۔ "کیا تم کو نظر نہیں آرہا ہے۔ اتنا صاف کہ میں اس وقت صریحاً دریائے علم کے بحرِ ذخار بے پایاں میں غوطہ زن ہوں۔"

میں مرعوب ہو گئی۔ اور ذرا اٹھ کر اس سے کچھ دور جا بیٹھی۔

"حقیقت اے سرِ سخن توں ——" خالدہ توفیق نے دوبارہ پڑھنا شروع کیا۔ میں کچھ دیر خاموش بیٹھی سنتی رہی۔ پھر مجھے غصہ آگیا۔ اور میں نے چلا کر کہا۔

رکھتا ہے کیوں جفا کوں مجھ پہ روا اے ظالم
محشر میں تجھ سوں میرا آخر حساب ہووے گا!

خالدہ توفیق اپنے دریائے علم کا بحرِ ذخارِ بے پایاں سب بھول گئی اور اٹھتی ہوئی میرے قریب آ بیٹھی۔ "اور اصل قصہ یہ ہے۔" اس نے کھنکار کر کہنا شروع کیا۔ "کہ آج مجھے ترنگن سے پتہ چلا ہے کہ ہمارے سرور کو امورِ خارجہ یا اسی قسم کے

کسی کارآمد محکمے کے ایک عدد سیکرٹری یا جوائنٹ سیکرٹری کی اشد ضرورت ہے۔"

"ایں ــــ؟" میں نے پوچھا

"ہاں۔ یا کم از کم ڈپٹی سیکرٹری ہی ہو ــــ" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"انڈر سیکرٹری سے کام چل سکے گا؟" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس لئے پوچھ لیا کہ کہیں وہ یہ نہ خیال کرے کہ میں بالکل ہی بیوقوف ہوں۔

"نہیں ــــ" اس نے بالوں کی لٹیں ہلائیں۔

"ایک انڈر سیکرٹری تو دستیاب ہو سکتا ہے۔ سامنے ہی رہتا ہے" میں نے پھر کہا۔

"نہیں۔ کم از کم ڈپٹی سیکرٹری۔ اور جوائنٹ سیکرٹری ہو تو کیا ہی کہنے ہیں" اس نے جواب دیا۔

"لیکن آخر ضرورت کیا ہے بھئی؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا

"ایں ــــ؟" اس نے سنی ان سنی کرتے ہوتے ہوئے کہا۔ "تم شہر چھوڑ دو، ٹیلیفون کی ڈائریکٹری اٹھا کر دیکھو۔ کون دستیاب ہو سکتا ہے جلد از جلد۔"

"تمہارا تو دماغ چل گیا ہے خالدہ توفیق اس کمبخت قدیم اردو ادب کی منحوس ریسرچ نے تمہیں شریفوں میں بیٹھنے کے قابل نہیں رکھا۔ آخر ضرورت تو بتا دو۔" میں نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"سنو" اس نے چاروں طرف بے حد پر اسرار طریقے سے دیکھ انتہائی رازدارانہ اور سرگوشی کے لہجے میں کہا "دراصل پتنگ اب شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"اس اب کی تعریف نہیں کی جا سکتی" میں نے داد دیتے ہوئے کہا۔

"سنو تو سہی۔" اس نے بات پھر شروع کی۔

"لیکن ممی تمی ــــ" میں دفعتاً چلائی۔

"شوشو شو ــــ" وہ ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر اسی پر اسرار انداز سے بولی۔ "چنانچہ یہ قصہ ہے دراصل۔ اور اسے اس لئے کسی کارآمد محکمے کا ایک سیکرٹری درکار ہے۔ یا کم از کم جوائنٹ سیکرٹری۔"

"لیکن اس کا کیا ہوگا؟" میں نے پھر انتہائی بیوقوفوں کی طرح سوال کیا۔

"ارے ــــ اس کا کچھ نہیں ہوگا بھئی اس کی لڑکی سے پتنگ شادی کرے گا۔" خالدہ توفیق نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

"اوووو ــــ" میں نے اتنی دیر بعد اطمینان کا سانس لیا۔ "اور ممی تمی ہماری؟" میں نے رقت بھری آواز میں پھر پوچھا۔

"شوشو ــــ چلو ٹیلیفون ڈائریکٹری اٹھالاؤ۔ موذیز ڈرائنگ روم سے جاکر بلکہ اس ہفتے گھر جا کر سول لسٹ بھی دیکھ لینا۔" اس نے حکم لگایا۔

"لیکن میری جان سنو تو سہی۔" میں نے ہاتھ ہلا کر کہنا شروع کیا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔ "کم از کم ایک ڈپٹی سیکرٹری۔"

"اور اگر انڈر سیکرٹری ہی ہو؟" میں نے منت سے پوچھا۔

"قطعی نہیں۔ انڈر سیکرٹری اپنے قانونی فرزند کے لئے خاطر خواہ ائر پلنگ براستے فارن سروس یا برائے مزید ترقی نہیں کر سکے گا۔" خالدہ توفیق نے جواب دیا۔

اووووو ــــ اب تو سارا مسئلہ گویا چشم زدن میں صاف شفاف تھا۔ چودہ طبق میرے سامنے بالکل روشن ہو گئے۔

خالدہ توفیق نے جلدی جلدی اپنی ساری مرٹی اور دولی کتابیں سمیٹیں

اور ہم کومن روم میں سے نکل کر نیچے اُتر آئے۔ ہوسٹل کے پچھلے لان پر حسبِ معمول ساری قوم جمع تھی۔ ریکارڈ بجائے جا رہے تھے۔ اور چنڈو خانے کی آرا رہی تھی۔ کچھ دور پر آم کے سائے میں ممی ممی سینٹ کے رولر پر بیٹھی انڈین لسنر کے ورق پلٹ رہی تھی۔ ہواہیں سوئیٹ پی کی بھینی بھینی مہک تیر رہی تھی۔ اور آسمان پر سے بشاش مرغابیوں کی قطاریں گذر رہی تھیں۔ دنیا مجھے حسبِ معمول بے حد حسین اور فرحاں نظر آئی۔ میں باغ کی نالی کی سیمنٹ کی اونچی منڈیر پر اکڑوں بیٹھ کر اس غور و فکر میں غلطاں و پیچاں ہو گئی کہ اس تازہ نقطۂ نظر سے پتنگ کے لئے کون سا سیکرٹری مناسب ترین رہے گا۔

"ممی ممی ڈیئر۔" رفعت جمائی لے کر گھاس پر لوٹ لگاتے ہوئے پکاری۔ "بھئی تمہارا وہ تاریخی دعوت نامہ ہمیں کب ملے گا۔ ہم تو اس کے انتظار سے واللہ بور ہو گئے۔"

"ہاں واقعی ممی ممی ڈارلنگ۔" جمیلہ نے چلغوزے کھاتے کھاتے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کب ہے ہیپی ایونٹ۔ اتنی بور تیت پھیلا رکھی ہے تم نے۔"

"قسم سے ممی ممی۔" ریحانہ درخت کی شاخ پر سے نیچے کودتے ہوئے بولی۔ "اتنی زبردست پتنگ ہے اور تم بالکل اینیچیوں کی طرح بیٹھی ہو۔ جلدی سے رچاؤ ہیپی ایونٹ۔ دوستوں کی شادیوں میں عمدہ عمدہ کپڑے پہن کر اترانے کا خوب موقع ملتا ہے۔ افوہ یاد ہے پچھلے مہینے اندرا کی شادی میں کتنی تفریح رہی تھی۔ اوہ گوش۔"

"یہ سب وائی گیرلز نابتی طمانیت ہے میری جان۔" میں نے نالی کی منڈیر پر سے ان سب کو اطلاع دی۔

"ارے بس تم اور تمہاری سائیکولوجی۔" جمیلہ نے چڑ کر کہا۔ ہیں نے کھلکھلا کر ہنسنا شروع کر دیا۔ میں ہمیشہ ہی اتنے زور کا قہقہہ لگاتی ہوں۔ "یہ نیتارا کی ہنسی تو مجھے کھا گئی۔ مارگریٹ ہمیشہ شکایت کیا کرتی تھی۔"

"یہ اس وقت بھلا اس قدر ہنسنے کی کیا تُک تھی؟" خالدہ توفیق نے وکٹی کے کلام پر سے سر اٹھا کر پوچھا۔

"تُک تو کسی بات کی کبھی ہوتی ہی نہیں۔ کیا کیا جائے۔" میں نے بےپروائی سے جواب دیا۔

"سنو بھئی۔ موقع محل قطعی اس کے مناسب نہیں کہ تم اس طرح اپنی مسرت کا اظہار کرو۔ یعنی ذرا اس معرکے کی ٹریجڈی پہ غور فرماؤ کہ سلطانہ اس قدر کمال سے ممی ممی کی پتنگ کاٹنے لئے جا رہی ہے کہ ہماری تو دیکھ دیکھ کے واللہ سٹی گم ہے۔" ریحانہ نے چپکے سے مجھ سے کہا۔

میں نے غور فرمانا شروع کیا۔ لیکن اس پر مجھے اور زیادہ ہنسی آئی۔ "ار ہائے میرا تالاب۔" میں نے ٹھنڈی آہ بھر کے کہا۔

"پھر تالاب یاد آیا۔" خالدہ توفیق نے برا مان کر کہا۔

"اور کیا یاد آئے۔" میں نے بگڑ کر پوچھا۔

"ہاں اور کیا یاد آئے۔" رفعت نے میری طرفداری کی۔

ارے ہائے پانی — پانی — پانی — کالج کا سوئمنگ پول ان دنوں خشک پڑا تھا۔ اور ندی کا پانی بھی کم ہو گیا تھا۔ کشتیوں کی سالانہ ریس میں بھی ابھی بہت دن باقی تھے۔ اور برکھا رت بہت دور تھی۔

"ذرا گوہر سلطان کی قسمت دیکھو۔ لندن پہنچ گئی۔" رولر پر بیٹھے بیٹھے ممی

نے انڈین اسٹرز کے اوراق الٹتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"حفیظ جاوید سے تم شادی کر لیتیں۔ اس کے بجائے تم لندن پہنچ جاتیں" میں نے انتہائی میٹر آف فیکٹ طریقے سے جواب دیا۔

"بکواس مت کرو۔" اس نے بگڑ کر کہا۔

"اچھا" میں نے فرمانبرداری سے جواب دیا۔ ہم سب چپ ہو گئے اور ریکارڈ سننے لگے۔ میں نانی کی منتر پر اکڑوں بیٹھے بیٹھے دوبارہ جوائنٹ سکرٹری کے متعلق غور و فکر میں محو ہو گئی۔

"ہم لوگ بر دکھوے کے لئے چل رہے ہیں نا؟" میں نے خوش ہو کر تنزئین سے پوچھا۔

"ارے بیوقوف۔ بر دکھوا تو لڑکوں کا ہوتا ہے۔ ہم تو لڑکی دیکھنے جا رہے ہیں" تنزئین نے مجھے سمجھایا۔ سکرٹریوں اور جوائنٹ سکرٹریوں کی تلاش بڑی سرگرمی سے شروع کر دی گئی تھی۔ اور بڑی مشکلوں سے ایک خاطر خواہ ڈپٹی سیکرٹری دستیاب ہوئے تھے لیکن ان کی صاحبزادی بلند اقبال خاطر خواہ نہ تھیں۔ عینک لگاتی تھیں۔ اور شکل سے لگتا تھا کہ اس دنیائے فانی کی ٹریجڈی پر غور و فکر کرتے کرتے بس اب رو پڑیں گی۔

"ماحول کھیجو تنزئین۔ ہمارے ایسے شگفتہ، بشاش اور کھلنڈرے سرور کے لئے ایسی فلاسفر جالینوس لڑکی۔ حد کرتی ہو" میں نے کہا۔

"مگر سنو تو سہی۔ اس کے ابا میاں خاص الخاص امورِ خارجہ کے محکمے میں ہیں۔ اور تم جانو اپنے سرور کی بھی امپیریل سروس ہے۔ وہ جلد از جلد کسی سفارت خانے کا اٹیچی کیس یا کم از کم سکنڈ سیکرٹری تو بن ہی جائے گا" خالدہ توفیق نے کہا۔

چنانچہ ہم تینوں لڑکے کی بہنوں کی قابل رشک حیثیت سے خوب بنگھار پٹار کر کے ایک بڑی سی موٹر میں بیٹھ کر سب پر شان جھاڑتے لڑکی والوں کے گھر پہنچے۔ اور لڑکی کے ابا میاں سے ملاقات کی۔ ان کی عمر چالیس سے ستر سال تک کی رہی ہو گی۔ علاوہ ایک نواب چھتاری اسٹائل کی مونچھ اور فرنچ کٹ داڑھی کے باقی سب کلین شیو تھے۔ اور بے حد رعب دار آدمی۔ باتیں کرتے تو لگتا کہ بگڑے ہوئے پیانو کے بیس کے سُر بج رہے ہیں۔ ہم ان کے خوش اخلاق لڑکوں اور بلیوں اور خرگوشوں سے متعارف ہوئے۔ ڈرائینگ روم میں بہت ساری سوسائٹی لیڈیز مع اپنے [illegible] کتوں اور شوہروں اور ایڈمائیررز کے جمع تھیں۔ ان سے بے حد اخلاق کی گفتگو کی۔ چائے کے بعد جب تکلف کا مجمع رخصت ہوا تو کام کی باتیں شروع ہوئیں۔

لڑکی کے ابا میاں نے پوچھا۔ لڑکا کے بجے سو کر اٹھتا ہے کلب سے کے بجے رات کے گھر لوٹتا ہے۔ دن بھر میں کتنے سگریٹ پیتا ہے اور کون کون سے پیتا ہے۔ فائیو فائیو فائیو۔ عبداللہ۔ بھری کا سلز؟

"دراصل وہ سگرٹوں کے معاملے میں بے حد پدونتاری واقع ہوا ہے" میں نے گلا صاف کر کے جواب دیا "اونٹ۔ ہاتھی۔ سب پی لیتا ہے۔"

"تاش کھیلتا ہے؟ اندازاً کے سو روپے ماہوار برج اور فلش میں ہارتا ہے۔ اور کون کون سے کھیل کھیلتا ہے؟" انہوں نے سوال کیا۔

"سب کھیل آتے ہیں اس کو۔ ترپ چال۔ تپا۔ کوٹ پیس ـــ" میں

نے بے حد مستعدی سے بتانا شروع کیا۔ لیکن تزئین اور خالدہ توفیق نے ایسی کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا کہ مجھے خاموش ہونا پڑا۔

ڈپٹی سیکرٹری صاحب ایک لمبی اور مطمئن ہوں کے بعد دوسری طرف متوجہ ہوئے۔ لڑکا کس قسم کا سیّد ہے جعفری۔ زیدی۔ نقوی رضوی بنا ہوا سیّد تو نہیں ہے اور اس کے علاوہ ملّتِ جعفریہ کے کس فرقے سے تعلق رکھتا ہے۔ شش امامی، اثنا عشری۔ آغا خانی؟

میں یہ سب سن کر سٹ پٹا گئی۔ آغا خانی گھوڑے اور آغا خانی ہیرے اور ہر ہائی نس دی بیگم آغا خان سب میرے دماغ میں گڈمڈ ہو گئے اس ضروری گفتگو سے نپٹ کر ہم اندر گئے اور لڑکی کے منہ میں مصری کی ڈلی اور پان رکھا۔ امام ضامن باندھا۔ انگوٹھی پہنائی۔ اس کے بعد اس فلاسفر لڑکی کا ہم سے باضابطہ پردہ کرایا گیا۔ اور میں نے تصوّر پر سخت زور ڈالنے کی کوشش کی کہ یہ بقراط اور ارسطو کی نواسی اپنی سیاہ فریم کی عینک کے ساتھ جھومر ٹیکے اور فرشی غرارے میں کیا سجے گی۔ سارے کپڑے اس پر اپنی جان کو رو دینگے۔ ممکن ہے بعد میں سرور بھی اپنی جان کو روئے۔ لیکن بہر حال، اس وقت تو وہ بالکل مطمئن تھا۔ اس کے گھر والے خوش تھے۔ ہم سب خوش تھے، اس کا مستقبل اپنے ہونے والے قانونی آبا میاں کے دفتر کے شاہ بلوط کے میز پر بالکل محفوظ اور بے حد شاندار تھا۔

چنانچہ ہم پھر لوٹ کر دیر تک ڈھولک پر خوب حلق پھاڑ پھاڑ کر مورا بیرن کلکتے کا راجہ، اور اسی طرح کے دوسرے گیت الاپتے رہے۔ ہمارے یہاں شادی بیاہوں پر جو ڈھولک کے گیت ہم لڑکیاں اپنے بھائیوں کی شان میں گاتی ہیں ان میں اس قدر کی خوش فہمی اور مبالغے سے کام لیا جاتا ہے کہ حد ہے۔ اب مثلاً ہمارا بچارہ سرور پتنگ کلکتے کا راجہ تو کیا کسی چھٹ بھیّے سی گاؤں گڑھی کا بھی مالک نہ تھا۔ لیکن رات گئے تک اسی طرح کے گیت ڈھولک پر گائے جاتے رہے۔ اور ایسا لگا گویا ہم سب ڈپٹی سکرٹری صاحب کے یہاں سے کوئی بڑا بھاری قلعہ سر کر کے لوٹے ہیں اور ہمارا بھیّا اس قدر کا بہادر سورما ہے۔ ڈھولک بجانے کی جو جھک سوار ہوئی تو گھنٹوں ڈھولک ہی پٹتی رہی۔ ان گنت گیت الاپ ڈالے۔ ہمارے پورب کے ان گانوں میں کتنی مٹھاس ہے۔ کتنی جان ہے۔ کتنا رس ہے۔ باجو بند کھل کھل جائے۔ اور چلو کاہے کو جھوٹی بناؤ بتیاں۔ اور مہاراجہ کوڑیاں کھولو رس کی بوندیں پڑیں۔ اور اندھیاری ہے رات بلم دہیو کہ جیو۔ اچھا خاصہ برکھا کی رات اور آموں کے ہرے کنجوں اور گنگا کے ساحلوں کا سماں آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے ہمارا سرور ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھا یہ گیت سنتا رہا۔ کمرے کے دوسرے کونے میں میرا پیارا بھائی ٹوٹ اپنی درخواستوں کے انبار پر سر ٹکے اونگھ رہا تھا۔ پھر سرور دفعتاً اٹھ اور باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہوسٹل کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ ممی آئی۔

مارگریٹ نے اس سے کہا "سنا تم نے ممی ڈیر۔ پتنگ بھی دوسری ڈومینین کو بھاگا جا رہا ہے۔ کل وہ نین تارا سے ملنے ہوسٹل گیا تھا۔ اس وقت تم کہیں باہر جا چکی تھیں۔ اس وقت وہ ابھی ابھی یہاں موجود تھا لیکن تم غائب تھیں۔ اب تم آئیں تو وہ کھسک لیا۔"

"ہاں۔ وہ ہمیشہ اسی طرح آنکھ مچولی کھیلتا رہتا ہے۔" ممی نے زبردستی کی شگفتگی سے جواب دیا۔ "میں مسوری میں تھی تو وہ بیغرض کر کے شملے چلا گیا۔ اور جب میں مسوری سے لوٹی تو ایسا اتفاق ہوا کہ وہ وہاں پہنچا۔"

"یہ مِمی مِمی جو ہے یہ اس سال مسوری صرف ایک ہفتے کے لئے گئی تھی اور پرنس ہوٹل میں ٹھہری تھی۔ لیکن سولئے وہیں رہنے والی ایک دوست کے پاس جاکر اس نے سواہٹ کے رائٹنگ پیڈ پر ان پانچ چھ دنوں میں اپنے سب دوستوں اور جاننے والوں کو خط لکھے تھے۔ اس کا ایک خط میرے اس بھی آیا تھا۔" جمیلہ نے چپکے مجھ سے کہا۔

"ارے ہائے — مِمی مِمی — مِمی مِمی —" میں نے آہستہ سے کہا۔

"میاؤں میاؤں — ؟" ٹوٹ نے کاغذوں پر سے سر اٹھا کر پوچھا۔

"مِمی مِمی — مِمی مِمی — آہ مجھے محض ان ہی کمزوریوں اور حماقتوں کی وجہ سے مینٹیلیٹی سے اتنی محبت ہے —" میں نے آہستہ سے اپنے آپ سے کہا۔

"کیا — ؟ یہ کس کا مقولہ ہے — ؟" ٹوٹ نے اپنے مراقبہ سے چونک کر پوچھا۔

"میرا — !" میں نے نہایت شگفتگی سے اسے بتایا۔ وہ چپ ہو گیا۔

"وہ وقت عنقریب آنے والا ہے اے میرے پیارے بھائی ٹوٹ کہ جب میرے سارے زریں اقوال کو جمع کر کے ایک صحیفہ سا ورمرتب کیا جائے گا اور اس خاکسار کے سارے کلاسیکل کوٹیشنز کی ایک ڈکشنری تیار ہو گی۔ اور بعد میرے مرنے کے تم سب احمقوں کو میری قدر آئے گی۔ اور تم کو پتہ چلے گا کہ یہ فدوی کن خوبیوں کا انسان تھا۔" میں نے سنجیدگی سے ایک ٹھنڈی آہ بھر کے اس سے کہا۔

"اللہ رے مغالطے —" اس نے بے انتہا ترس کھا کے جواب دیا۔

"ارے اب تو بالکل ہی غضب ہو گیا!" رفعت نے اندر کودتے ہوئے چلاّ کر کہا۔

"کیا — ؟" ہم نے مری ہوئی آواز میں دریافت کیا۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ بقراط اور ارسطو کی نواسی کے ابا میاں کا عہدہ کیا ہے؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔ اس کے ہاتھ میں حکومت کے غیر معمولی گزٹ کا تازہ ترین پرچہ تھا جو اسی شام ریلیز ہوا تھا۔

"کیوں؟" ہم سب نے دھڑکتے اور ڈوبتے ہوئے دلوں کے ساتھ پوچھا۔

"اس کے ابا میاں ڈپٹی سکریٹری ہیں نا؟ سلطانہ کے ابا میاں سکریٹری ہو گئے۔" رفعت نے گزٹ کا پرچہ ہمارے سامنے پھینک کر کہا۔ اور دریچے میں جا بیٹھی اور ڈھولک اٹھا کر ریلی کے بجائے بین الاپنے لگی۔

مرور کی سقراط اور بقراط کی نواسی سے منگنی ٹوٹ گئی۔

اگلی صبح کے اخباروں میں بھی سلطانہ کے ابا میاں کے متعلق یہ اطلاع شائع ہو گئی۔ پھر روز بروز ان کے متعلق نئی نئی خبریں چھپنے لگیں۔ ملک کے سیاسی حالات کی تبدیلیوں اور بٹوارے کے نت نئے انتظامات کے ساتھ سلطانہ کے ابا میاں کے عہدے میں ترقی ہوتی جا رہی تھی۔ کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ صبح کے وقت ڈائننگ ہال کی سب سے آخری میز پر چار کے بعد تازہ اخبار سامنے رکھ کر چنڈو خانے کا باقاعدہ سنڈیکیٹ بیٹھتا۔ اور سیاسی پیشین گوئیاں کی جاتیں اور ان واقعات اور امکانات پر تبصرہ ہوتا جس کا اثر مرور کی شادی اور فادن مرروس کے انتخاب کے مسئلے پر پڑ سکتا تھا۔

"ارے ہائے —" ایک روز اخبار پر نظر دوڑاتے ہوئے خالدہ توفیق چلاّئی۔

"اب کیا ہوا — ؟" میں نے پوچھا۔

"اب تو معاملہ بالکل ہاتھ سے نکلا سمجھو۔ یہ دیکھو سلطانہ کے آبا میاں کو سفارت خانے کے بے حد اہم عہدے کے لئے ٹپ کیا جا رہا ہے۔" اس نے رقت انگیز آواز میں کہا۔

"ہائیں ہائیں — ؟" میں نے آنکھیں پھیلا کر ٹوسٹ بڑی مشکل سے نگلا۔

"تو پانی پیو۔" حمیدہ نے انتہائی مایوسی اور قناعت کے عالم میں گلاس میری طرف سرکا دیا۔

"لیکن ممی ممی ڈارلنگ۔" ریحانہ کی آواز اس کے حلق میں رہ گئی۔

"کچھ اور فکر کی جائے گی۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔" رفعت نے ارشاد کیا۔

"لیکن واقعی اب کی تو ایسی زور کی آندھی آئی ہے کہ پتنگ بالکل ہی اڑ گئی۔" جمیلہ نے تاسف کے ساتھ کہا۔

میں خاموشی سے ان سب کو دیکھتی رہی۔ پھر میں نے نہایت خوش الحانی اور رقت کے ساتھ عرض کی ؎

ارے آندھی چلی اڑ جاویں گے رنگ چوں چوں چوں
پانی پڑا بہہ جاویں گے رنگ۔ چوں چوں چوں!
ارے آگ لگی جل جاویں گے رنگ چوں چوں چوں

واہ واہ تحسین کے شور سے ڈائننگ ہال گونج اٹھا۔ دوسری میزوں پر بیٹھی ہوئی لڑکیاں مڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگیں۔

"پھر تم لوگوں نے ممی کی ٹانگ کھینچنی شروع کی۔ بجائے اس کے کہ ہمدردی سے کوئی ترکیب سوچو۔ ڈوب جاؤ تم سب۔" مارگریٹ نے ڈانٹا۔

"سنو بھئی۔" میں نے کرسی پر اکڑوں بیٹھ کر سب کو مخاطب کیا۔

"ہاں ہاں۔ اب اوریکل آف ڈیلفی بول رہی ہے۔ اس کی سنو پہلے۔" انہوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

اس خطاب کے لئے جو انگلش کے ایم۔ اے کی لڑکیوں نے بہت پہلے سے، اور مرلی اور بیرن کی نئی رنگین نظم "جنت میں ایک رات" دیکھنے کے بعد سے دوسری لڑکیوں نے مجھے دے رکھا تھا۔ میں جھک کر تسلیم بجا لائی۔ اور پھر گلا صاف کر کے شروع کیا۔ "اے محترم و بیوقوف خواتینو — اس نہایت نازک موقع پر کیا بلیک میلنگ سے کچھ مفید نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ یعنی شکاگو اسٹائل کا ایک رقیب روسیاہ اگر کہیں سے نمودار ہو جائے اور سرور کے مقابلہ پر آ کر تڑنت سے سلطانہ سے شادی کر لے۔"

"کیوں کر لے۔ تمہارا کیا کوئی اجارہ ہے۔ ؟" ظاہر تھا کہ ریحانہ کو یہ تجویز بالکل نہیں جچی۔

"ایں — ؟ اب میں اوریکل آف ڈیلفی ہوں کہ نہیں — ؟" میں نے بگڑ کر دریافت کیا۔

"بالکل ہو۔ ٹھیک تو ہے۔ ارے کاں اب یہی کہ سلطانہ کسی اور کے ساتھ محبت میں گر جائے اور ممی ہماری کے لئے مطلع صاف —" جمیلہ نے کامل اتفاق ظاہر کیا۔

"مگر کس کے ساتھ بھئی — ؟" نرملا نے پوچھا۔ یہ بڑا اہم سوال تھا۔ کیونکہ مصیبت یہ تھی کہ سرور کے مقابلہ پر اور کوئی پتنگ ٹھہرتی ہی نہیں تھی۔ بس ایک دو دن بہار جانفزا دکھلا کر غائب۔ افق پر ہر طرف بجائے سرور ہی سرور نظر آتے تھے۔

"تم شہر بھر میں ڈھونڈ کر لاؤ کہیں سے ایک رقیب روسیاہ،" جمیلہ نے مجھ سے کہا۔

"اس ہفتہ اپنے گھر جاتے ہی سول لسٹ دیکھو۔" خالدہ توفیق نے پھر حکم لگایا۔

خوش قسمتی سے اگلے روز ہی رفعت یہ خبر لائی کہ ایک سچ مچ کا بجید گلفام رقیبِ روسیاہ جو دھاری دار پتلون اور ٹیل کوٹ پہنتا ہے۔ اور مونوکل لگاتا ہے کل شام کلب میں سیکرٹری صاحب کے ساتھ نظر آیا تھا اور فارن سروس میں اس کے لئے جانے کے امکانات بہت زیادہ ہیں اور کوئی تعجب نہیں کہ سلطانہ کے ابامیاں کی توجہ اس کی طرف منتقل ہو جائے کیونکہ انہیں کھلاڑی اور شہسوار اور اسپورٹسمین قسم کے انسان بہت مرغوب ہیں اور رقیب بالکل جوتوتی کا بھتیجا اور ڈون بریڈمین کا نواسا اور غوث محمد کا چھوٹا بھائی ہے۔ اور معتبر حلقوں میں یہ افواہ گرم ہے کہ آنے والے ٹینس ٹورنمنٹ میں سرور اور رقیب میں سے جو جیتے گا وہی سکتر صاحب کا منظورِ نظر قرار پائے گا۔

یہ ساری تفصیلات معلوم کر کے ہم لوگوں کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔

اگلے ہفتہ سالانہ ٹینس ٹورنامنٹ شروع ہوئے۔ لوٹ میرے پاس بھاگا بھاگا آیا۔ "سرور کی مورل سپورٹ کے لیے ہم سب کا ٹورنامنٹ میں شرکت کرنا بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ سنا ہے۔ رقیبِ روسیاہ قابل کھلاڑی ہے۔"

"ٹورنامنٹ میں شامل تو ضروری ہوتی لیکن مجھے اپنی عاقبت نظر آ رہی ہے۔ اتنے بڑے مجمع میں ریکٹ اٹھاتے ہی میری روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جائیگی۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"عاقبت واقبت کچھ نہیں۔" لوٹ نے ڈپٹ کر کہا۔ "کھینچ تان کر کسی طرح سیمی فائنلز تک تو پہنچ ہی جاؤ۔ آگے کا خدا حافظ ہے۔ ذرا غور فرماؤ کہ اس نازک وقت میں سرور کی مورل سپورٹ۔"

مجھے بھی جوش آگیا۔ اور یہ قطعی یاد نہ رہا کہ ہماری پالیسی یہ تھی۔ کہ سرور ہار جائے "ضرور شامل ہوں گی۔ لکھو میرا نام۔" میں نے چلا کر کہا۔ اس نے فارم نکال کر سامنے رکھا۔ "لکھو۔ مخدوم زادی سیدہ آنسہ۔" میں نے کہنا شروع کیا۔

"کیا خرافات ہے۔ ٹھیک سے سیدھا سادا اپنا نام لکھنے دو۔" لوٹ نے قلم روک کر کہا۔

مجھے جلال آگیا۔ "او کافر بچے۔ او موذی۔ او دشمن ایمان و دین ہند میں اسی لئے ساری نمازیں تیری نذر ہو گئیں۔" میں نے چلا کر کہا۔ "ارے کیا تو نہیں جانتا کہ میرے لکڑ دادا حضرت معروف کرخی علیہ الرحمۃ تھے جن کا مزار بغداد شریف میں آج بھی مرجع خلائق ہے اور میرے لکڑ نانا نعمت خان عالی جو شہنشاہ اورنگ زیب کے وزیر اعظم تھے نہایت پہنچے ہوئے بزرگ تھے اور میرے پرنانا کا مزار جو امروہے میں ہے اس کے احاطے میں سانپ چھوڑ دو، بچھو چھوڑ دو ہرگز کسی کو نہ کاٹے گا۔ خود ضلع کے معزز انگریز حکام نے اس کی تصدیق کی ہے۔ اور ہیں خود اے ہندو بچے اب اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ میں سالک ہوں، بہت جلد ابدال بن جاؤں گی۔ پھر قطب۔ کہ قطب اس دنیائے فانی میں صرف چار ہیں جن کے دم سے یہ دنیا قائم ہے۔ ورنہ کب کی ختم ہو چکی ہوتی۔ ایک قطب تو میں خود بننے والی ہوں۔ باقی کے تین کا پتہ نہیں۔ اور جناتوں کو میں تابع کرتی ہوں

بلکہ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میں خود جنات ہوں۔ اور اے گمراہ انسان کیا تو نے وہ مشہور واقعہ میرے اُن پر دادا ابا کا نہیں سنا جنہیں ڈپٹی کلکٹری سے ریٹائر ہونے کے بعد نورِ معرفت حاصل ہو گیا تھا۔ اور منقول ہے کہ ایک روز ضلع سلطانپور میں گرمیوں کی ایک شام صحن کے چبوترے پر پیچوان گڑگڑاتے گڑگڑاتے انہوں نے دفعتاً کہا تھا۔ دھت دھت۔ اور مصاحبین نے چاروں طرف دیکھ کر دریافت کیا تھا کہ حضور آپ کو کیا نظر آیا۔ تو انہوں نے بے پروائی سے فرمایا کہ کچھ نہیں حرم شریف میں کتا گھسا جا رہا تھا۔ اسے نکالا ہے۔ یہ اور اس طرح کے بیسیوں واقعات ان کے متعلق تذکرۃ العارفین عرف گلدستۂ انوار مطبعہ نولکشور پریس میں موجود ہیں جو تو کسی روز بھی جا کر امیر الدولہ پبلک لائبریری میں دیکھ سکتا ہے۔“ میں سانس لینے کے لیے اک ذرا کی ذرا رکی ”کسی کو میری روحانیت پر شبہ کرنے کی کیا گنجائش ہے۔ کیا تو نے نہیں سنا او بیوقوف کائستھ بچے کہ ولیوں کے گھر میں —“

لوٹ نے چپکے سے میرا نام لکھ لیا۔ اور سرپٹ جمخانہ کی طرف واپس بھاگا۔ شام کو سنا گیا کہ وہ بے حد فکرمندی سے جمیلہ سے کہہ رہا تھا ”یہ اس خالدہ توفیق کے ساتھ رہتے رہتے ہماری بچاری ہنین تارا کے دماغ کی چولیں بھی ڈھیلی ہوتی جا رہی ہے۔“

فائنلز کا دن بھی آ پہنچا۔ جمخانہ میں بڑی خلقت جمع ہوئی۔ بہت سے تماشائی درختوں پر چڑھ گئے۔ ہر طرف کیمرے، لڑکیاں اور پریس والے نظر آ رہے تھے۔ سنگلز شروع ہونے سے پہلے دونوں کھلاڑیوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ گلے مل کر خوب ہنسے اور پھر کھیل شروع ہوا۔

مجھے لائینز وومن بنایا گیا تھا۔ بے حد پیارا موسم تھا۔ فضا میں ہلکی ہلکی گاتی گنگناتی غنودگی ایسی پھیل رہی تھی۔ کھیل دیکھنے کے بجائے میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے پورے وقت سوتی رہی۔ جمخانہ آنے سے پہلے ہوسٹل میں جو چنڈو خانہ کلب کی اہم میٹنگ ہوئی تھی۔ اس میں پہلے ہی یہ طے کر لیا گیا تھا کہ اگر ستر ور ہار گیا تو برگد والے شہید مرد کے مزار پر پانچ پیسے کی مٹھائیاں چڑھائی جائیں گی۔ اس لیے اس طرف سے اطمینان تھا۔

مجمع کی مستقل مدھم بھنبھناہٹ، تالیوں کی آوازیں ہمت افزائی کے نعرے، لڑکیوں کی باریک باریک تعریف یا افسوس کا اظہار کرنے والی چیخیں، چاروں طرف میرے ارد گرد تیرتی رہیں۔ پھر یکایک خواب میں کچھ ایسا نظر آیا گویا کہیں فرقہ وارانہ فساد ہو رہا ہے۔ گھبرا کر میں نے آنکھیں کھول دیں اور چپکے سے جمائی لے کر چاروں طرف نظر ڈالی۔ مجمع کی ساری آوازیں ایک ساتھ مل کر زور شور سے ’ان آوٹ‘ کی تکرار کر رہی تھیں، پھر دفعتاً بہت سارے لوگ میری طرف دوڑے میں چونک کر اٹھ بیٹھی۔

”آؤٹ — آؤٹ —؟؟“

”اِن — اِن —؟؟“

”ایں —؟؟؟“ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

”رقیب لیڈ کر رہا ہے۔ صرف ایک پوائنٹ اور اسکور کرنا ہے اب پتہ نہیں گیند اِن تھی یا آؤٹ“ خالدہ توفیق نے تیزی سے میرے قریب آ کر جلدی جلدی بتایا۔

”اِن — اِن —“ رقیب کے طرفدار چلائے۔ رپورٹر اور تماشائی اور لڑکیاں کیمرے سنبھال کر رقیب کی طرف دوڑے۔

"ہاؤ سوئیٹ۔ ہاؤ ڈیشنگ — مہربانی سے اپنا پروفائیل دیجئے گا۔ تھری کوارٹر — شکریہ — اک ذری مسکرا دیجئے گا — ہاؤ کلنگ"۔ لڑکیوں نے سرگوشی کی۔ "اس پر دستخط کر دیجئے۔ میں ہمیشہ لکس ٹوائلٹ صابن استعمال کرتا ہوں اصفہانی میری پسندیدہ چائے ہے —" رقیب کے چاروں طرف مجمع زیادہ ہوتا گیا۔

"ہا — اُہوہ —!!" جالی پھلانگ کر سرور سب کے سامنے آ گیا۔

"ہوہ — !!" وہ چلایا۔

"سرور بھائی اتنے ان اسپورٹنگ نہ بنو۔ جاؤ رقیب سے جا کر ہاتھ ملاؤ — کیمرے والے منتظر کھڑے ہیں۔ وہی ٹائیرن پاور والی مسکراہٹ لاؤ ہونٹوں پر — شاباش —" خالدہ توفیق خوشی سے بے ہوش ہوتے ہوتے اس سے بولی۔ سب لڑکیوں نے ممی کو گھیر لیا۔

"ہونہہ — ان اسپورٹنگ مائی فٹ —!! یہ سراسر بے ایمانی ہے۔ گیند صاف آؤٹ تھی۔" سرور غرّا کے بولا۔

"آؤٹ — آؤٹ —" سرور کے طرفدار چلائے۔

"ریفری کہاں ہے۔ بلاؤ ریفری کو —" مجمع نے ایک ساتھ آواز بلند کی۔ لونڈا غریب ایک اونچی سی کرسی پر ہوا میں معلق تھا۔

"ارے یہ تو روبینہ سکینہ ہے۔ سرور کا دوست —"

"ہونہہ — چور کے گواہ گرہ کٹ —" مجمع میں سے آوازیں آئیں۔ وہ سب پھر میری طرف دوڑے۔

"میں قطعی گرہ کٹ نہیں ہوں۔" میں نے سٹ پٹا کر آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ دھوپ تیزی سے میری آنکھوں میں گھسی جا رہی تھی۔ میں نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا اور ہاتھ سے آنکھوں پر سایہ کر کے سامنے کے اس دیوانے منظر کو غور سے دیکھنا چاہا۔ ایسا باؤلا چنڈوخانے کا کھیل بھلا کبھی کا ہے کو ہوا ہوگا۔ یہ سب ہماری دعاؤں کی برکت تھی۔ شور میں اضافہ ہوتا گیا۔ مجھے غصہ آ گیا۔ ایسی اچھی نیند سے کم بختوں نے جگا دیا۔ جہنم میں جائے ممی اور سرور اور سب گدھے۔ میری طرف سے سرور سلطانہ سے پچاس دفعہ شادی کر لے۔ مار ایک قیامت مچا رکھی ہے۔

"لائینز وومن کو بلاؤ۔ لائینز وومن سے پوچھو۔ کہاں ہیں مس —" سب کے سب میری کرسی کے گرد جمع ہو گئے۔ "بیٹھئے مس —"

"ارے اتنا چلا کیوں رہے ہیں آپ لوگ۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "مجھے نہیں پتہ گیند لائن سے باہر گری تھی یا جہنم میں چلی گئی تھی۔"

"آپ کو پتہ نہیں تو آپ لائینز وومن کیوں بنی تھیں — واہ صاحب یہ اچھی ادا ہے۔" لوگوں نے ایک دوسرے سے غصے سے کہا۔

میں نے جمائی لے کر پھر اپنا خواب وہیں سے جوڑ لینا چاہا جہاں سے ان بدتمیزوں کے شور سے وہ ٹوٹ گیا تھا۔ دراصل اس وقت مجھے اپنا خواب شدت سے یاد آ رہا تھا۔ ابھی ابھی اتنے اچھے اچھے خواب دیکھ رہی تھی۔ کہ بہت سے، اونچے اونچے قلعوں کے برابر چاکلیٹ کیک ہیں جو میں خوب کھا رہی ہوں۔ اور کوکو کا ایک پورا حوض بھرا ہوا ہے۔ اور گرم گرم سموسے۔ اور نیلی پہاڑیوں کے پرے والی جھیل اور شیفون کی ساریاں۔ ڈھیروں شیفون کی نئی نئی ساریاں۔" میں پھر سو گئی۔

اس کے بعد ٹھیک سے پتہ نہیں کیا ہوا۔ سنا گیا کہ بعد میں ٹورنامنٹ والوں نے سٹ ڈاؤن اسٹرائیک کر دی۔ کہ اتنا معرکہ کا تاریخی کھیل

ہو رہا تھا اور یہ کیا قیامت ہے۔ کہ یہی طے نہیں ہو پایا کہ کون جیتا۔ آخر کار رجم خانہ والوں کی ایک میٹنگ ہوئی اور طے پایا کہ دوبارہ کھیلا جائے۔

دوسری بار ہیں سرور جیت گیا۔

ہم سب انتہائی شکستہ دلوں کے ساتھ ہوسٹل واپس آئے۔

"اب کیا کیا جائے؟" خالدہ توفیق نے انتہائی ٹریجک انداز سے پوچھا۔

"لاؤ پانچ پیسے تو نکالو۔" جمیلہ نے بہت دیر بعد سرد آہ بھر کے مجھ سے کہا۔

"کیوں؟" میں نے بے دلی سے پوچھا "سرور تو جیت گیا۔" مجھے اپنی روحانیت اور جناتی پن پر سے یقین اٹھتا جا رہا تھا۔

"ارے لاؤ، پانچ پیسے کی کٹیاں چڑھائے دیتے ہیں، اللہ میاں کے ہاں پڑی رہیں تو وقت بے وقت کام آئیں گی۔ کیا پتہ اب بھی کوئی ایسی وجہ نکل آئے کہ سلطانہ کی سرور سے شادی نہ ہو سکے۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔" جمیلہ نے بالکل قلندرانہ شان سے کہا۔ مجھ پر بھی رقت طاری ہو گئی۔

واقعی اللہ بڑا کارساز ہے۔ اس ویک اینڈ پر جب میں گھر سے ہوسٹل واپس آ رہی تھی۔ تو میرے پیارے بھائی ڈاٹ کا فون آیا۔ "ارے نین تارا۔" وہ جلدی جلدی بول رہا تھا "سنا کیا قیامت گذر گئی۔"

"کیا ہوا۔۔؟ رقیب روسیاہ نے خود کشی کر لی؟" میں نے پوچھا

"ارے نہیں تمہاری سلطانہ جو ہے۔"

"سلطانہ۔۔۔ کیا ہوا۔۔؟"

"ارے زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا۔ نین تارا مجھے واللہ اب تک معلوم ہی نہ تھا۔ کہ یہ سلطانہ کس قدر۔ بس کیا بتاؤں۔ فتنہ ہے قیامت ہے۔ اسے کیا کہئے۔"

"ایں۔۔؟"

"ہاں سنو تو۔ اس سے سیاسی پیچیدگیاں تو یقیناً پیدا ہوں گی لیکن قسمت میں یوں ہی تھا کہ آج صبح جبکہ ہندوستان کی گھڑیوں کے مطابق نو بجے تھے۔ میں سلطانہ کے ساتھ انتہائی شدید عشق میں گر جاؤں۔ چنانچہ میں گر گیا۔ اور اب اٹھنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ موت کے لئے دن معین ہے تو وہ رات کے وقت کیوں آئے گی۔ اس سے تم پیاری نین تارا یہ مطلب نہ نکالنا کہ خدانخواستہ میرے دماغ کی بھی کوئی چول ڈھیلی ہو گئی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ سلطانہ ۔۔ زبان پہ بارِ خدایا۔"

میں نے جلدی سے ریسیور رکھ دیا۔ اور فوراً خالدہ توفیق کو رنگ کیا۔ "سنا تم نے خالدہ توفیق۔" میں نے جلدی جلدی بات شروع کی لیکن خالدہ کوئی خبر سنانے کے لئے مجھ سے زیادہ بیتاب معلوم ہوتی تھی۔

"آج کا اخبار دیکھا تم نے۔۔؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔

"کیا ہوا؟" "یقیناً واقعات نہایت تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہے تھے۔

"سلطانہ کے ابا میاں ٹمبکٹو کے سفارت خانے کے چارج ڈی افیئرز ہو گئے۔" ریسیور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں بے ہوش ہو گئی۔

اتوار کے روز ہم لوگ دن بھر یہ پروگرام بناتے رہے کہ سلطانہ، سرور ویڈنگ میں کیا پہن کر جائیں گے۔ سلطانہ اگلے ہفتے جو ایٹ ہوم دے

رہی تھی۔ اس کے مہمانوں کی فہرست مرتب کرنے میں ہم نے اس کی مدد کی۔ اب تک ہم سب 'اینٹی سلطانہ' تھے۔ لیکن قسمت سے کون جیت سکتا ہے۔ اگر قسمت میں یہ تھا کہ سلطانہ ہی کی سرور سے شادی ہو اور می می ہمیشہ یونہی افسردہ رہے تو اس میں کسی کا کیا قصور تھا۔ ٹینس کا میچ اور رقیب روسیاہ وغیرہ تو محض تفریح اور مذاق تھا۔ جب فی الحقیقت، سلطانہ کی شادی سرور سے طے ہو گئی اور وہ لائم لائٹ میں آ گئی تو سب لازمی طور پر اس کی طرف ہو گئے۔ دنیا کا یہی قاعدہ ہے۔ می می بیک گراونڈ میں چلی گئی۔ پھر ہم کہاں تک اس سے ہمدردی کرتے۔

ایک روز میں اپنے ہوسٹل کے کمرے میں بیٹھی آئی۔ اے۔ رچرڈز کی نفسیاتی تنقید پر ایک انتہائی ضخیم اور منحوس کتاب سے دماغ لڑانے کی کوشش میں مشغول تھی کہ می می آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"ہلو می می ڈارلنگ ۔۔۔" میں نے کتاب پر سے سر اٹھائے بغیر اس سے کہا۔

"ہلو۔" وہ چپ رہی۔ تھوڑی دیر تک کمرے میں خاموشی طاری رہی پھر میں نے سوچا۔ اس سے باتیں کرنی چاہئیں۔ کتاب بند کرنے کے بعد بازو پھیلا کر ایک زوردار اور تھکی ہوئی انگڑائی لے کر، کیونکہ پچھلے چند ہفتے اتنے ہنگامہ خیز گذرے تھے، میں نے گفتگو کا کوئی موضوع سوچنا چاہا۔

"نین تارا ۔۔۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

"فرماؤ ۔۔۔" میں نے شگفتگی سے جواب دیا۔

"اس وقت تم سوبر ہو ۔۔۔؟" اس نے رک کر، مجھے اپنی کاہل پُراسرار اور سنجیدہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"سوبر ۔۔۔؟" میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "تو کیا تمہارے نزدیک میں ہمیشہ ہی دیوانے پن کی باتیں کرتی ہوں۔ میں تو بہت سنجیدہ، فلسفی، بقراط، جالینوس آدمی ہوں بھائی ۔۔۔!!"

وہ خاموش رہی۔ پھر تھوڑی دیر بعد اس نے کہا: "کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں بہت دکھی ہوں ۔۔۔ معلوم ہے تمہیں ۔۔۔؟ نہیں تم یہ نہیں جان سکتیں تم جو ہر وقت پکچرز، اور ٹینس، اور سوئمنگ کی حماقت خیز اور فضول باتیں کرتی رہتی ہو۔ تم نہیں سمجھ سکتیں۔ شاید اسی لئے تم نین تارا ہو۔"

وہ آج پہلی بار مجھے نین تارا کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔

"سنا تم نے نین تارا" وہ کہتی رہی "میں بھی تمہارے بھائی ٹوٹ کی طرح نین تارا کہہ کر پکارا کروں گی۔ مجھے تمہارا یہ نام بہت پسند ہے۔ تمہارے اس قرأت سے ادا کرنے والے نام اور تمہارے انگریزی پٹ نیم سے کہیں زیادہ اچھا لگتا ہے۔ اور سب مجھے پسند ہے۔ مجھے اتنی بہت سی چیزیں پسند ہیں۔ خوبصورت نام۔ خوبصورت باتیں۔ خوبصورت کائنات۔ تم ٹھیک کہتی تھیں۔ کائنات بے حد حسین ہے۔ لیکن اس حسین کائنات میں دکھی انسانوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ اس سے اس کے حسن پر حرف آتا ہے۔"

"سنو۔ می می ۔۔۔" میں نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔ "کیا تم سچ مچ اپنے آپ کو اتنا دکھی سمجھتی ہو ۔۔۔؟"

وہ خاموش رہی اور نظریں گھما کر دریچے کے باہر دیکھنے لگی جہاں درختوں کے پتے بارش کے پانی میں جھکے جا رہے تھے۔

"ممی ممی ۔" میں نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "کیا تم ایک دلکشا یا چھتر منزل کلب کی ممبرشپ، ایک کوک ٹیل پارٹی، ایک ٹی ڈانس، ایک اٹھارہ ہزار کی بلیک مارکیٹ سے خریدی ہوئی نیش حاصل کر کے زندگی سے مطمئن ہو جاؤ گی ۔۔۔ کیا اس وقت تم کو سکھ اور آنند مل جائے گا؟"

وہ چپ چاپ بیٹھی باہر کی طرف دیکھتی رہی۔

"ممی ڈارلنگ ۔" میں نے ایک جماہی لے کر کہا۔ "یہ بدنصیبی اور دکھ تو محض تمہارے تخیل کی اختراع ہے۔ ہم اپنے خیالوں ہی خیالوں میں انتہائی خوش نصیب بھی بن سکتے ہیں ۔۔۔ اور انتہائی بدقسمت اور دکھی بھی ۔۔۔ سلطانہ گویا اس وقت دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی ہے ۔۔۔؟ کیونکہ بیگم ہمدرد بن کے اسے امپیریل جمخانہ کی ممبرشپ، اور اٹھارہ ہزار کی نیش اور یہ سب حاصل ہو جائے گا؟"

وہ اسی طرح خاموش رہی۔

باہر بارش ہوتی رہی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر چلی گئی۔ میں نے کاؤچ کے کشنوں پر بازو پھیلا دیے اور فرش پر اوندھے لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ ممی ممی، ممی ممی بہت دکھی تھی۔ یا اللہ ۔۔۔ تجھے اپنے ان کمزور، بے بس، حماقت زدہ انسانوں کو دکھی بنانا کیوں اچھا لگتا ہے۔ میں اسی طرح لیٹی رہی۔ اور سکون اور آرام کے ساتھ آنکھیں بند کیے مجھے اس وقت دفعتاً وہ لڑکی یاد آئی۔ جو کچھ عرصہ ہوا میں نے ریڈیو اسٹیشن پر دیکھی تھی اس روز جب میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا وہ اسٹوڈیو میں ایک طرف کو چپ چاپ اور اکیلی بیٹھی بے دھیانی سے کچھ گنگنا رہی تھی۔ جب میں نے ہیڈ فون اتار کر ایک طرف رکھ دیا اور اسے دیکھا، مجھے ان لوگوں سے چڑ تھی۔ اور وہ پیئے ہوئے معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں گلابی تھیں۔ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ بال بکھر آئے تھے۔ لپ اسٹک کا رنگ بے حد شوخ تھا۔ گہرے نیلے رنگ کی روپہلے ستاروں والی ساری پہن رکھی تھی اور ہاتھ میں بڑا سا ریشمی جھالر دار رومال تھا جس سے وہ اپنا چہرے کا پسینہ خشک کرتی تھی تو اس کی چوڑیاں بار بار کھنکھنا جاتی تھیں۔ مجھے اسے اپنے اتنے قریب دیکھ کر سخت الجھن ہوئی۔ اس وقت تک پروفیشنل گانے والیوں کو ریڈیو پر گانے کی ممانعت نہیں ہوئی تھی۔ ریڈیو اسٹیشن پر آتی تھیں اور ہمارے اسٹوڈیوز سے باہر نکلنے کے بعد اندر جاتی تھیں یا پہلے کسی آمد میں یا پچھلے لان کے خیمے میں تخت پر بیٹھ کر اپنے سازندوں کے ساتھ گانے کی دھیرے دھیرے مشق کرتی رہتی تھیں۔ یا اسٹوڈیوز کی اسٹینڈ بائی قسم کی مخلوق کو پان کھلاتی تھیں۔ وہ میرے پاس اسی طرح کھڑی رہی۔ پھر اس نے لڑکھڑاتی ہوئی رنجیدہ آواز میں کہا۔ "آج شام کو آپ اناؤنس کیجیے گا؟"

"جی نہیں۔" میں نے بادلِ ناخواستہ مختصر سا جواب دیا اور پھر گھڑی کی طرف دیکھنے لگی۔ اور مائیک پر جا کر کنٹرول روم سے کہا۔ "مجھے پانچ منٹ اور یہ اسٹوڈیو چاہیے۔"

وہاں سے جواب آیا۔ "بہت اچھا۔"

وہ پھر بھی وہیں کھڑی رہی میں نے دوبارہ گھڑی کی طرف دیکھا۔ اور پھر بے تعلقی سے کاغذات الٹنے پلٹنے لگی۔ تاکہ کسی طرح یہ عورت سمجھ جائے کہ اس کی موجودگی مجھے ناگوار گذر رہی ہے۔ ایک چپراسی اندر آیا۔ میں جان کر بے حد جھنجھلا کر چلائی۔ "شاہ صاحب کہاں ہیں۔ بھیجو انہیں فوراً۔ میں زیادہ دیر تک انتظار نہیں کر سکتی۔" چپراسی باہر چلا گیا۔ میں پھر مائیک پر جا کر چلائی۔ "مجھے نمبر ٹین ابھی چاہیے۔ یہاں کسی اور پروگرام کی ریہرسل نہیں ہو گی۔" وہ پھر بھی میز کے

قریب لیمپ کے نیچے کھڑی سنجیدہ نظروں سے مجھے تکتی رہی۔ آخر تنگ آکر میں کھڑی ہو گئی۔ "میں یہاں سے چلی جاؤں؟" اس نے رسان سے پوچھا۔

"جی نہیں۔ بیٹھی رہیے۔" میں نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ وہ آہستہ آہستہ قدموں سے جا کر پیانو کے پاس ایک اسٹول پر بیٹھ گئی۔ میں نے کوفت کے ساتھ اس پر نظر ڈالی۔ مجھے پینے والی عورتوں سے سخت کراہت آتی ہے۔ میں نے کلبوں میں ان سوسائٹی لیڈیز کو دیکھا ہے جو جام پہ جام خالی کرتی رہتی ہیں۔ اور آخر میں تھک کر صوفوں پر سو جاتی ہیں۔ یا زور زور سے قہقہے لگاتی ہیں یا گھنٹوں ناچتی رہتی ہیں۔ ڈسی پیشن کے حلقے ان کی آنکھوں کے گرد ہوتے ہیں اور ان کی شکلوں پر ایسی حماقت برستی ہے۔ خداوندا۔ یہ سب کیوں ہے۔ اس زبردست مشہور و معروف شخصی آزادی، اور حریتِ نسواں نے اور سب چیزیں تو عنایت کی ہی تھیں بس ایک شراب کی کسر رہ گئی تھی — یہ منچلیں۔ میں شراب پینے والے مردوں کو درگزر کر سکتی ہوں لیکن شراب نوشی کی شوقین سوسائٹی کی خواتین کو کبھی معاف نہیں کر سکتی عورت کی گریس، اس کا وقار، اس کی لطافت، اس کی پاکیزگی۔ ان سب چیزوں کا تصور اس بری طرح مجروح ہوتا ہے۔ "شرابی بہت نرم دل، بہت نیک، بہت اچھا انسان ہوتا ہے۔" ڈوٹ نے ایک دفعہ کہا تھا۔ "ہوتا ہوگا۔" میں نے چڑ کر اسے جواب دیا تھا۔ اور اس وقت یہ کم بخت میرے قریب بیٹھی تھی۔ اور مجھ سے باتیں کرنے کی خواہاں تھی۔ رات کے انگریزی کے پندرہ منٹ کے ڈرامے کی ریہرسل کا وقت قریب آ رہا تھا۔ اب تک کوئی نہ پہنچا تھا۔ کوشل پریشانی کے عالم میں سب کو فون کرتا پھر رہا تھا۔ حمیدہ، علی ظہیر، رنجنا، سبھاش، نادیا، جمیل۔ بی بی سی سے ان دنوں ایک انگریز فنکار آیا ہوا تھا جو لندن کا مشہور اسٹیج ایکٹر بھی تھا۔ ہم سب متوقع تھے کہ آج وہ ہمیں ریڈیو ڈرامے کی تازہ ترین تکنیک سے واقف کرائے گا۔ اتنے بڑے اور مشہور اداکار کے ساتھ ایکٹنگ کرنا، چانس آف اے لائف ٹائم، تھا۔ میں بے حد بے صبری سے گھڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ انجینئرز خالی اسٹوڈیوز میں ادھر ادھر دیکھ بھال کرتے پھر رہے تھے۔ ہر طرف دوپہر کا گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اور وہ کمبخت دن کے وقت اتنے شوخ رنگ کی ساری اور نہایت تیز میک اپ کیے نہایت گستاخی سے آمادہ تھی کہ مجھ سے باتیں کرے۔ اور وہاں سے ٹلنے کا نام نہ لیتی تھی۔ "آپ کا پروگرام کس وقت ہے؟" میں نے عاجز آکر اس سے پوچھا۔ "میں — میں آٹھ بجے عشرت رحمانی کے سنگیت روپک میں گاؤں گی۔" اس نے گھٹنے ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "آپ یہاں کیا کرتی ہیں؟" کچھ وقفے کے بعد اس نے پوچھا۔ مجھے سخت غصہ آیا۔ اور میں خاموشی سے اسکرپٹ کے کاغذات الٹنے پلٹنے لگی۔ پھر یک لخت اس نے دھیرے دھیرے گنگنانا شروع کر دیا۔

ستم گر تیرے لئے — میں نے لاکھوں کے بول سہے

میں نے — لاکھوں کے بول سہے ——

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ دیر تک اسی طرح گنگناتی اور اپنی بڑی بڑی گلابی آنکھیں سستی سے ادھر ادھر گھما کر دیکھتی رہی۔ آخر میں تنگ آکر کمرے سے باہر چلی گئی۔ — چند روز بعد وہ پھر مجھے اسی اسٹوڈیو میں نظر آئی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر بے حد دلآویز طریقے سے مجھے سلام کیا گویا میری بہت پرانی دوست ہے۔ اور اسی پراسرار انداز سے پھر میری میز کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ "آج آپ کون سے ریکارڈ بجا رہی ہیں؟ مہاگل کا کوئی

گانا لگائیے۔" میں نے جواب نہ دیا۔ وہ ایک اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اس روز بھی وہ یقیناً پئے ہوئے تھی۔ اور اس کی سرخ زرتار ساری اصغر علی محمد علی کے ہاں کی کسی تیز خوشبو سے مہک رہی تھی۔ باہر آکر میں نے ایک پی۔ اے سے کہا۔ تم ان لوگوں کو بلا ضرورت کیوں اندر آجانے دیتے ہو۔" ارے وہ تو بچاری بڑی شریف لڑکی ہے۔ بہت دکھی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ اور ڈھیلے ڈھیلے قدم رکھتا آگے چلا گیا۔ میں جھنجھلا اٹھی۔ کیا مصیبت ہے۔ یہ بھی دکھی ہے۔ ٹوٹ بھی دکھی ہے۔ یہ کم بخت دکھی ہے۔ اسے کیا دکھ ہے۔ یہ؟

پھر جب میں ریکارڈ لگا کر ٹسٹ کر رہی تھی۔ اس نے ایک ریکارڈ کے ساتھ آہستہ آہستہ گانا شروع کر دیا۔ یہ قطعی ناقابل برداشت تھا۔ میں نے ترشی سے کہا: "مہربانی سے کام میں مخل نہ ہوئیے۔"

"بہت اچھا۔" اس نے فرمانبرداری سے جواب دیا۔ اور چپ ہو گئی پھر یک لخت اس نے رونا شروع کر دیا۔ "یا اللہ۔ کیا مصیبت ہے یعنی خدا کے لئے کسی طرح اسے یہاں سے نکالو۔" میں نے ایک چپراسی سے کہا۔

اس کی گلابی آنکھوں میں آنسو ڈبڈباتے رہے۔ پھر دفعتاً وہ خود ہی اٹھ کر باہر چلی گئی۔ اس کے بعد میں نے اسے پھر کبھی نہ دیکھا۔ وہ مجھے کبھی یاد نہ آئی۔ ان گنت انسان روز ہماری نظروں کے سامنے سے گزرتے رہتے ہیں۔ ایسے ایسے غیر ضروری، بدمعاش، شرابی لوگوں کو کون یاد رکھے گا۔ مدتیں گزر گئیں۔ ایک روز میرے پیارے بھائی ٹوٹ نے نئے لِسنر کی ایک تصویر دیکھتے ہوئے رنج و تاسف کے ساتھ کہا: "بھیا تم نے نین تارا — یہ بچاری مر گئی۔ اچھی شکل تھی۔ اور اچھا گاتی تھی بالم بند کھل کھل جائے، اور میں نے لاکھوں کے بول مجھے اکس غضب کا الاپتی تھی غریب — مر گئی بچاری۔" "کون —؟ کیوں مر گئی —؟" میں نے بے خیالی سے پوچھا۔ "پتہ نہیں۔" ٹوٹ نے جواب دیا۔ "کہتے ہیں۔ بہت دکھی تھی۔ کسی سے اسے انتہا کی محبت تھی۔ سچی محبت۔ لیکن اس شخص نے اس کا یقین نہیں کیا۔ اور اسے چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔ اور وہ مر گئی۔" "اس میں کون سی خاص بات ہے۔" میں نے کہا۔ "ہمیشہ ایسا ہوتا ہے۔ ازل سے لے کر آج تک کی کوئی کہانی اٹھا کر دیکھ لو۔ یہی پٹی ہوئی داستان ہر جگہ موجود ہو گی۔ اس قدر لاطائل رقّت ہے اس نے کون سا بڑا اور بجنل کام کیا۔" ٹوٹ چپ ہو گیا۔ وہ مجھ سے بحث کرنے سے ہمیشہ بچتا ہے۔

پھر — وہیں ہوسٹل کے کمرے کے فرش پر کاہل بلّی کی طرح آنکھیں بند کئے لیٹے لیٹے جب کہ باہر بارش ہو رہی تھی۔ مجھے ان سب کا خیال آیا۔ کلب میں شراب پینے والی خواتین۔۔ ریڈیو اسٹیشن پر آنسو بہانے والی وہ مغنیہ۔ اور وہ عجیب و غریب لڑکی جو کچھ عرصے تک ہوسٹل میں سب کی سرگوشیوں کا موضوع بنی رہی تھی اور جسے آخر کار ہوسٹل چھوڑ دینا پڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت پانی سا تیرتا رہتا تھا۔ اور خالدہ نے کہا تھا کہ یہ یقیناً پئے ہوئے ہے۔ ایک روز اس نے مجھ سے کہا: "مجھ سے تو تم کبھی باتیں کرتی ہی نہیں ہو۔" میں نہایت خوش خلقی کے ساتھ اس کے کمرے میں گئی۔ اور ہم دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اور اس کی آنکھوں کو غور سے دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ وہ واقعی پئے ہوئے ہے۔ آنکھیں۔ جو گھر کا سب سے بڑا اور سب سے خطرناک اور گستاخ بھیدی ہوتی ہیں۔ اس کی میز پہ بہت سا الم غلم پڑا تھا۔ خوبصورت پھول۔ امریکن اداکاروں کی رنگین تصویریں۔ چھوٹے چھوٹے خوشنما ٹرنکٹ۔ اور اسی قسم کی دوسری غیر ضروری اور خوبصورت چیزیں جو ہر نارمل لڑکی کو بے حد عزیز ہوتی ہیں۔ اس نے دفعتاً مجھ سے کہا: "یہ سب تم لے لو۔ لے لو بھئی۔"

"کیوں ---؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "میری میزوں اور الماریوں کی درازوں میں تو اس سے بھی زیادہ بڑا کباڑ خانہ جمع ہے۔ میں یہ لے کر کیا کروں گی؟"

"نہیں، تم یہ سب بھی لے جاؤ۔ تم بہت اچھی ہو۔ تم نین تارا ہو۔" اس نے کہا۔ میں نے کسرِ نفسی سے اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے یقین دلایا کہ مجھے ان ٹرنکٹس کی قطعی ضرورت نہیں۔ وہ اپنی پراسرار نگاہوں سے کھڑکی کے باہر دیکھتی رہی۔ جہاں ہوسٹل کا دھوبی گھاس کے وسیع سبز قطعے پر رنگ برنگی ساریاں پھیلا رہا تھا۔ اور ہوا میں سویٹ پی اور ہارسنگھار کی مہک تیر رہی تھی۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے رنجیدہ آواز میں کہا۔ "تمہیں میری چیزیں پسند نہیں آئیں۔ حالانکہ تم نین تارا ہو۔" چند روز بعد وہ ہوسٹل چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کانونٹ سے اس کے متعلق ایک بہت بُری رپورٹ آئی تھی جس کی وجہ سے ہمارے کالج کے سارے ہوسٹلوں کی وارڈنز کی ایک میٹنگ بھی ہوئی تھی کچھ عرصے تک۔ ڈائننگ ہال کی میزوں اور چیپل کی سیڑھیوں پر اس کا تذکرہ رہا۔ لیکن جلد ہی ہوسٹل اور کالج کی بھرپور زندگی کے دوسرے نئے نئے ٹاپکس نے اس کی جگہ لے لی۔ وہ کون تھی۔ کیوں اس کی آنکھیں اس طرح تیرتی تھیں۔ اس کی زندگی کا پس منظر کیا تھا۔ وہ اب کہاں ہوگی۔ کیا کر رہی ہوگی۔ کوئی کچھ نہیں جانتا۔ ہماری زندگی میں اس طرح ان گنت انسان داخل ہوتے ہیں۔ اور ایک لمحے کے لئے ہمارے سامنے ٹھٹھک کر آگے چلے جاتے ہیں۔ مجھے ان سب کا خیال آیا۔ بے طرح طرح کے انسان۔ موٹی عورتیں۔ دبلی عورتیں اسٹریملائنڈ بدمعاشی کرنے والی سوسائٹی کی خواتین۔ شریف، پاکباز، لتجادقی، سنو بنتی عورتیں خفقان زدہ، ہو ہو عورتیں، سپر انٹلکچوئل بننے والی لڑکیاں۔ کیا زندگی ہے کیا دنیا ہے۔

"خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں" ٹوٹ نے ایک بار آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بے حد مظلومیت کے ساتھ کہا تھا۔ "بنو مت ٹوٹ" میں نے اس سے کہا۔ "میں واقعی بے حد سادہ دل ہوں نین تارا" وہ بولا۔

"ہو گے --- پھر اس کا دوسروں پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ تمہاری ہی حماقت ظاہر ہوتی ہے" میں نے جواب دیا تھا۔

باہر بارش ہوتی رہی۔ شام کا اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ اکتا کر میں نے لیمپ روشن کیا اور آئی۔ اے رچرڈز کی "اغیاتی تنقید" اٹھائی۔

وقت گزرتا گیا۔

ایک روز ویک اینڈ کے لئے گھر گئی۔ ٹوٹ اور جمیلہ مجھ سے پہلے ہی وہاں موجود تھے اور بے حد اہمیت کے ساتھ رازدارانہ لہجے میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ مجھے آتا دیکھ کر چپ ہو گئے۔

"نین تارا کو نہیں بتائیں گے۔" جمیلہ نے چپکے سے ٹوٹ سے کہا۔

"ہاں نین کو نہیں بتائیں گے۔ اسے بڑی جلدی شوک پہنچ جاتا ہے" ٹوٹ نے اسی سرگوشی کے لہجے میں اسے جواب دیا۔

"مجھے کیا نہیں بتاؤ گے بھئی۔ کیا چوروں کی طرح کانا پھوسی لگا رکھی ہے" میں نے ان کے قریب پہنچ کر بے حد دلچسپی کے ساتھ کان کھڑے کرتے ہوئے کہا

"کچھ نہیں۔" ٹوٹ نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔

"دراصل --- ممی کو ہم نے کل شام کلب میں دیکھا کہ ---" جمیلہ نے کہنا شروع کیا۔

"کہ قلابازیاں کھا رہی تھی؟" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ارے نہیں بھئی۔ اس کے ہاتھ میں — اس کے ہاتھ میں —" جمیلہ رک گئی۔

"شیری کا گلاس تھا۔" لوٹ نے شکستہ دلی کے ساتھ بات پوری کر دی۔

ہم تینوں چپ ہو گئے۔

"ممکن ہے۔ ٹماٹر کا عرق ہو" کچھ دیر بعد میں نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں ٹماٹر کا عرق نہیں تھا" جمیلہ نے رنجیدہ آواز میں کہا۔

اسی وقت رفعت آن پہنچی۔ اس کے ہاتھ میں حکومت کے غیر معمولی گزٹ کا تازہ پرچہ تھا۔ "یہ دیکھو" اس نے کہا۔

"اب کیا ہوا —؟" جمیلہ نے اکتا کر پوچھا۔

"ہوتا کیا۔ مرود کے تبادلے کا حکم آگیا ہے۔ وہ فوراً جا رہا ہے اور اس لئے سلطانہ سے اس کی شادی ملتوی ہو گئی ہے" اس نے جواب دیا۔

یہ طے شدہ بات تھی کہ رفعت چنڈو خانہ کلب کی سب سے مستند پوسٹ تھی۔ لیکن ہم لوگ اس قصے سے اب اتنے اکتا گئے تھے کہ کسی نے بھی اس خبر پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ ہم سب افیمچیوں کی طرح گھاس پر بیٹھے رہے۔

"ہلو —!!" میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ رفعت کے پیچھے پیچھے خالدہ توفیق اپنی برق رفتاری کے ساتھ چلی آرہی تھی۔

"ہلو۔ خدا حافظ۔" وہ ایک لحظہ کے لئے ہمارے سامنے ٹھٹھک کر چلائی

"کیا قصہ ہے خالدہ توفیق۔ اب تم کہاں بھاگی جاتی ہو" میں نے مری ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ایک —؟" —

فلک تماشا بازی آنچناں کرد ۔ زہر کس از خلل نقل مکاں کرد

ارے خدا وہ ہر طرف بھاجڑ پڑی ہے۔ جدھر دیکھوں ادھر ہاچڑ پڑی ہے!!"

جلدی جلدی یہ کہہ کر وہ اپنی تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے محسوس ہوا جیسے ہم سب میر حسن کی کسی مثنوی کے کردار ہیں۔ میرا جی چاہا کہ گرج کر خالدہ توفیق ہی کی زبان میں اسے جواب دوں تاکہ بالکل رجس کا مزا آجائے۔ لیکن اس قسم کا کوئی شعر اس وقت میرے دماغ میں نہ آیا۔ میں پھر افیمچیوں کی طرح چپکی بیٹھ گئی۔

کالج کی ٹرم ختم ہونے والی تھی۔ دوسرے روز میں اپنی ہری وادی کی طرف واپس جارہی تھی۔ شام کو میں نے ممی کو کلب میں دیکھا۔

"ممی ٹمی۔ ممی ٹمی۔ چلو میرے ساتھ۔" میں نے اس سے کہا۔

"کہاں —؟" اس نے بے دھیانی سے سوال کیا۔

"میں اپنے پھولوں کے جنگلوں کو واپس جارہی ہوں۔" میں نے اسے بتایا۔

"نہیں میں یہیں رہوں گی۔" اس نے بچوں کی سی ضد کے ساتھ کہا۔

"تم یہیں رہو گی؟" میں نے اس کی بات دہرائی۔ اور اپنے چاروں طرف نظر ڈالی۔ کلب کی عمارت جگمگا رہی تھی۔ بینڈ کوئی اسٹرو سا نغمہ بجا رہا تھا۔ بام گرد میں کوک ٹیل کے گلاس کھنکھنا رہے تھے۔

"اچھا خدا حافظ بھئی ممی ٹمی" میں نے اس سے کہا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور آہستہ آہستہ قدم رکھتی رقص کرنے والوں کے مجمع میں کھو گئی۔

میں وادی میں واپس آگئی۔ وہاں پر شفاف نیلگوں پانی والا تالاب۔ سفید خودرو پھول، بکریاں، خرگوش، صنوبروں کے جھنڈ سب اسی طرح موجود تھے۔ پرسکون اور مطمئن۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ان سب چیزوں کے حسن کو محسوس کیا اور میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

پھر میں اپنے سبز رنگ کے تولیہ کے ڈریسنگ گاؤن اور سوئمنگ کاسٹیوم کا بیگ کندھوں سے لٹکا کر ٹارالارا، گاتی وادی کی پگڈنڈی پر آگے بڑھی اور چناروں والے راستے پر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ میرے سامنے نیلی پہاڑیوں کا سلسلہ سورج کی ارغوانی کرنوں کے ساتھ ساتھ دھند میں سے آہستہ آہستہ نمودار ہو رہا تھا۔ میں چلتی رہی۔ پگڈنڈی پر میرے ساتھ ساتھ جنگل کے سارے پرند، اور گلہریاں اور خرگوش ادھر ادھر کودتے جا رہے تھے۔

اور چلتے چلتے دفعتاً ٹھنڈے، روپہلے پانی کی لہریں مارتی ہوئی جھیل میری تھکی ہوئی آنکھوں کے سامنے آگئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا میں نیلی پہاڑیوں سے پرے نکل آئی تھی۔ میں نے تھک کر اپنا بیگ ایک پتھر پر رکھ دیا اور سستانے کے لئے جھیل کے کنارے ایک پرانے درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ جس نے پانی کی سطح پر سایہ کر رکھا تھا۔ شاید یہی وہ جگہ ہے۔ جہاں تک پہنچنے کا مجھے عمر بھر انتظار رہا ہے۔ میں نے چپکے سے اپنے آپ سے کہا۔ میں نے بہت سے ستارۂ سحری کے پھول جمع کئے اور کچی چیریاں اور آڑو، سیب کی کلیاں۔ اور میں نے سوچا کیا پڑا ہے۔ اگر میری کہانیاں پڑھنے والوں کو پسند نہیں آتیں یا میری بنائی ہوئی تصویروں کو دیکھ کر رائل اکیڈیمی والے ہائی برو نقاد ناک بھوں چڑھا کر ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ یہ لڑکی پکاسو کی ٹانگ جانے کاہے کو توڑتی ہے۔

سورج کی نرم کرنیں میرے چاروں اور بکھر رہی تھیں۔ اور پانی کی سطح پر سفید کنول اور روپہلے پروں والے راج ہنس تیرتے پھر رہے تھے۔ اور کنارے پر جنگلی گلہریاں اپنی پچھلی ٹانگوں پر بیٹھی ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ ہاں۔ واقعی۔ مجھے کیا پروا ہے۔ میں نے سوچا۔

کیونکہ میں نے اپنا وژن دیکھ لیا تھا۔

کاش میں بن جاتی پھول — کرتے وہ دل سے قبول
قدر نہیں میری کچھ — رہتی ہوں ہر دم ملول
ہاتھ میں لے کر مجھے — خوب لگاتے گلے
ہو کے وہ مستِ بہار — رُخ پہ مجھے پھیرتے
کیف مئے شوق میں
سینے سے لیتے لگا

(حبا)

اشفاق احمد

سنگ دل

خداداد چبوترے پر بیٹھا سٹین گن کے دستے سے کوئیلے توڑ توڑ کر انگیٹھی میں ڈال رہا تھا۔ ایک کونے میں نون مرچ رگڑنے کا ڈنڈا گھڑا تھا اور دوسرے میں آٹے کا کنستر پڑا تھا۔ جو انڈین پینل کوڈ کی جلد سے ڈھکا تھا چھلنی میں سُرخ سُرخ مرچیں نمک کی ڈلیاں اور ہلدی کی گرہیں پڑی تھیں دسترخوان کا ایک کونہ اِن پہ تھا۔ اور دوسرا گندھے ہوئے آٹے پر سالن کا ایک حصہ پک چکا تھا اور باقی دیگچیوں میں پڑا تھا۔ کوئلے توڑتے توڑتے خداداد نے سر اٹھا کر اندر بیٹھی ہوئی بازیافتہ لڑکیوں سے پوچھا؟ گوشت بھوننا جانتی ہو؟"

ایک نے مدھم آواز میں جواب دیا۔ "اوں ہوں!"

دوسری نے نفی میں سر ہلا دیا

"ٹماٹر۔ پیاز اور پودینہ کا کچومر بنا لو گی؟"

اس دفعہ دونوں خاموش رہیں۔

"تو پھر حقہ ہی تازہ کر دو"۔

"اچھا!" وہ دونوں یک زبان ہو کر بولیں۔ اور ایک ساتھ اٹھ کر اندر سے حقہ اور چلم اُٹھا لائیں۔ ایک نے ڈرتے ڈرتے سٹین گن کا میگزین پانی کے لوٹے پر سے اٹھایا اور طاق میں رکھ دیا۔ اور آہستہ آہستہ پانی چھوڑ حقہ تازہ کرنے لگی۔ دوسری نے طاق میں پڑے ہوئے میگزین کو دور ہی سے دیکھا اور چلم کا چُھل سونگھتے ہوئے بولی "چچا تمباکو کہاں ہے؟"

"تمباکو!" خداداد نے حیرت سے پوچھا اور پھر ہاں! ہاں!! کرتے ہوئے تہمد کے ڈب سے ایک پڑیا نکال کر بولا "ذرا کم ڈالنا تمباکو۔ یہاں تو گھڑی گھڑی بازار بھی نہیں جا سکتے۔ اور دیکھو اچھی طرح دبا دبا کر بھرنا۔ پانی کے دو قطرے ٹپکا لو گی۔ تو چلم دیر تک چلے گی:"

پھر وہ انگیٹھی میں کوئلے چُھننے لگا۔ اور وہ لڑکی بیٹھ کر تمباکو مسلنے لگی۔ اتنے عرصے کے بعد آج ان کے چہروں پر تاثرات پیدا ہوئی تھی۔ تمباکو کی مانوس خوشبو شاید انہیں اس وقت کی یاد دلانے لگی جب ان کا باپ انہیں نمبردار کے لڑکے کی آمد پر حقہ تازہ کرنے کو کہا کرتا ہو گا۔ حقے کی نے میں پھونکتے ہوئے اور چلم کی کوکھ میں تمباکو جماتے ہوئے یہ دن یاد کر کے ان کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ وہ تو بہنیں تھیں!

میں بیٹھک میں چارپائی پر نیم دراز سرکاری روزنامچہ لکھ رہا تھا۔ پچھی کمرے میں داخل ہوئی میں نے ایک نظر اُسے دیکھ کر باہر گلی میں نگاہ دوڑائی حیوانات

کے شفاخانے کے پاس میں نے جانی پہچانی صورت دیکھی۔

"پتاجی آ رہے ہیں" یہ کہہ کر پپی جیسے آئی تھی باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد پتاجی آئے۔ انہوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھا "سب سامان پہنچ گیا؟"

"جی!" میں چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا اور باہر خدا داد کو دیکھنے لگا انہوں نے کوٹھڑی کی کھڑکی میں جھانک کر پوچھا "محمد خان کہاں گیا ہے؟"

"ڈاک بنگلہ گیا ہے۔ میری مہری اور چند ضروری کاغذات لینے"

"گویا تم سارے کاغذات اپنے ساتھ نہیں لائے؟"

میں نے جھینپ کر کہا "جی نہیں۔ مجھے ایک الماری کا خیال ہی نہ رہا تھا۔"

"بے پروا کہیں کے!" اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے وہ اندر چلے گئے۔ ابا جان کے بعد اگر مجھے کسی سے خوف آتا تھا وہ پتاجی تھے۔

جس دن ابا جان سب اسسٹنٹ سرجن لگ کر یہاں آئے تھے۔ اسی دن پتاجی سب انسپکٹر پولیس تعینات ہوئے۔ دونوں کی ملاقات ریل گاڑی میں ہوئی اور یہ واقفیت بڑھتے بڑھتے گہری دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ اس کی ایک وجہ تو تھانے اور ہسپتال کا قرب تھا پھر دونوں کی سخت گیر طبیعت۔ دوپہر کو مریضوں سے فارغ ہو کر ابا جان تھانے جا بیٹھتے اور شام کو پتاجی ہمارے کوارٹر کے آگے کرسی ڈال کر انتظار کرنے لگتے۔ کہ کب ان ڈور مریضوں کا معائنہ ختم ہو اور ابا جان گولڈ فلیک کا ڈبہ لیے کر ان کے پاس آ بیٹھیں۔ جب امی نے بی بی کی

بی بی کو آہستہ آہستہ پان کھانے کا عادی کر دیا تو میں اور پپی چپکے چپکے گھر سے نکل کر تھانے کے پچھواڑے "ڈگن" میں چلے جاتے جہاں بیریوں ٹونڈیوں اور بھرس کے درختوں کے درمیان سبزی کے چوکور قطعے تھے یہاں بیٹھ کر ہم جانے کتنی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہتے۔ خورد سال شیشم کے گہرے سبز پتے توڑ کر میں اسے پپیاں بنا کر دیتا جو اس سے کبھی نہ بجتی تھیں۔ منڈھ میں بیٹھے بیٹھے وہ سفید سفید تیزابی مولیاں اکھاڑ کر اپنی اوڑھنی سے پونچھتی اور چاکلیٹ کی طرح کھانے لگتی، جنہیں میں آج تک اس اطمینان سے نہیں کھا سکا۔ ایک بار بڑی خوشامد کے بعد اس نے مجھے اپنی ادھ کھائی مولی کھانے کی اجازت دی تھی اور میں اسے آہستہ آہستہ چباتا رہا تھا جیسے ننھے ننھے بوسوں کے نمکین قتلے ہوں۔

پورے آٹھ سال کے بعد پتاجی کی تبدیلی ہو گئی۔ اس دوران میں وہ کئی بار آس پاس کے تھانوں میں ریلیونگ ڈیوٹی پر تعینات ہوتے رہے لیکن وہ کنبے کو اپنے ساتھ نہ لے جاتے تھے مگر اس دفعہ ان کے آرڈر لائل پور کے نکلے اور پپی چلی گئی۔

ابا جان اور پتاجی کی خط و کتابت باقاعدہ جاری رہی۔ میں بھی ادھر سے آیا ہوا ہر خط میز کے دراز سے نکال کر ضرور پڑھتا لیکن اس میں کوئی بات ایسی نہ ہوتی جس سے میری تسکین ہو سکتی۔ امی اور بی بی کے تحائف پارسل آتے جاتے تھے لیکن ان میں چٹھیاں نہ ہوتی تھیں ــــ تھوڑے عرصے کے بعد ابا جان بھی تبدیل ہو گئے اور ہم سب جالندھر چلے گئے یہاں امی کو ایک اور بی بی مل گئیں جو پان کھانے میں

اپنی نظیر آپ تھیں۔ ابا جان کو ایک اور سگریٹ نوش دوست مل گئے لیکن میرے لئے مولیاں بدستور تلخ رہیں بلکہ ان کی تلخی میں اضافہ ہو گیا۔ قیام جالندھر کے دوران میں ایک دفعہ پتاجی آ کر ہم سے ملے لیکن اکیلے۔ وہ انسپکٹر ہو گئے تھے اور پھلور جا رہے تھے۔

اس عرصے میں جنگ شروع ہو چکی تھی۔ جس دن مجھے کمشن ملا ابا جان اسی دن پنشن لے کر گاؤں چلے گئے۔ لڑائی جاری رہی اور ہم دیس بدیس کی سیر کرتے اور ملک ملک کا پانی پیتے داد شجاعت دیتے رہے۔ پورے چار سال بعد جب اپنے وطن کا پھیرا ہوا تو جنگ عظیم کی چھوٹی بہن خانہ جنگی ہم سے پہلے یہاں پہنچ چکی تھی۔ ملک تقسیم ہوا اور پنجاب کا ہر علاقہ میدان کارزار بن گیا۔ — ایک غیر معین عرصہ کے لئے مجھے مشرقی پنجاب سے مغویہ عورتیں برآمد کرانے کے لئے اسی جگہ ڈسٹرکٹ لیاژاں آفیسر بنا کر بھیجا گیا۔ جہاں میں نے اور پتی نے آٹھ سال اکٹھے بتائے تھے۔ اس پیاری زمین سے کچھ اس درجہ انس ہو گیا تھا کہ میں نے پورا محافظ دستہ ساتھ لانا ضروری نہ سمجھا صرف دو سپاہی خداداد اور صمد خان ساتھ لئے۔ موٹر میں خود چلاتا تھا۔

مکمل دو دن ڈاک بنگلے میں ضائع کرنے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ یہاں کے انسپکٹر پولیس پتاجی ہیں۔ فوراً تھانے پہنچا۔ انہوں نے گذشتہ دو دن ڈاک بنگلہ میں گذارنے پر سخت سرزنش کی اور میں ان کے یہاں اٹھ آیا۔ مجھے پتاجی کی جابر طبیعت سے بہت ڈر لگتا تھا۔

رپورٹ کو مخصوص سرکاری لفافے میں بند کر کے میں نے خداداد سے کہا "پہلے اسے ڈاک گھر لے جاؤ۔ روٹی پھر پکا لینا۔"

اس نے پالک کاٹتے ہوئے سر اوپر اٹھایا اور روہنی آواز میں بولا

"لیکن ابھی ہنڈیا کہاں پکی ہے جناب؟"

میں نے جھنجھلا کر لفافہ میز پر ڈال دیا اور سیٹی بجانے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک ہنڈیا ہمیشہ چار حصوں میں پکایا کرتا ہے — خداداد نے ایک دیگچی میں آلو ابال رکھے تھے۔ دوسری میں پالک ابال لی تھا۔ اس کے بعد وہ ان دونوں کو ایک بڑی دیگچی میں ڈال کر ہلانے والا تھا۔ مسالہ بھون کر تیسری دیگچی کا مواد وہ اس میں انڈیلے گا۔ "لیجئے صاحب سالن تیار ہے۔" اس دوران میں اگر سیٹی نہ بجے تو اور کیا ہو؟

صمد خان ڈاک بنگلے سے باقیماندہ کاغذات لے کر گھر آیا تو اس نے بتایا کہ چیف لیاژاں آفیسر تین ٹرک لے کر برقندی گئے ہیں اور مجھے وہاں ملنے کو کہا ہے۔ ضروری کاغذات کی چھان بین میں مجھے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔ جاتے ہوئے میں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور اپنے چلنے کی اطلاع اندر بھیجی۔ پتاجی سرخ کنارے والی دھوتی اور سفید ململ کا کلیوں والا کرتہ پہنے باہر آئے اور کہنے لگے "سوچ سمجھ کر چلا کرو بھائی۔ نہ زیادہ بیباکی اچھی ہے نہ سستی!" میں ٹرک میں سوار ہونے لگا تو امر نے میری پتلون تھام کر کہا "بھاپا جی میرے لئے ٹافیاں لانا"۔ یہ پتاجی کا لڑکا تھا۔ پتی سے سات سال چھوٹا۔

چبوترے پر خداداد ہنڈیا کا چوتھا حصہ ابھی تک پکا رہا تھا۔

برقندی ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ نہایت خوبصورت اور پر فضا جوہڑ کے ارد گرد نیم کے جھتناروں میں چڑیوں کے غول دوپہر تک شور مچاتے رہتے ہیں اور دن بھر جگالی کرتے جانور درختوں کی چھاؤں میں پانی کے اندر بیٹھے رہتے ہیں۔ لوگوں کے چہرے گو بیماری، موت اور تبادلے کی صعوبتوں سے اترے ہوئے تھے تاہم کبھی کبھی ان میں زندگی کی کوئی شوخی اپنی جھلک دکھا جا

ایسی جگہ مغویہ لڑکیاں برآمد کر انے پھرنا ایک بے کیف سی عبادت تھی۔

پورے تین دنوں کے بعد میں صبح دس بجے گھر لوٹا بیٹھک کا دروازہ بند کر کے بوٹوں سمیت چارپائی پہ دراز ہو گیا۔ دھول کی یورش اور صبح صبح پسینہ کی ہلکی ہلکی نمود نے کچھ بے جان سا کر دیا تھا۔ بڑی ہمت سے اٹھ کر ہاتھ منہ دھویا تو احساس ہوا کہ ڈاڑھی مونڈے ایک ہفتہ ہو چکا ہے۔ ابھی سیفٹی ریزر میں بلیڈ لگا رہی تھا کہ مِنّی کی آہٹ نے چونکا دیا۔

"لائیے میں آپ کی شیو بنا دوں۔"

"شیو! پر یہ تو بڑی مہارت کا کام ہے۔ تم سے . . . . ."

"مہارت نہ مہارت . . لائیے ریزر دیجئے۔"

اور وہ شیو بنانے لگی۔ کبھی اس کی لٹ سر سے پھسل کر ٹھوڑی کے نیچے جھولنے لگتی اور کبھی کندھوں پر پڑا ہوا سفید جارجٹ کا دوپٹہ سرک آتا وہ گھڑی گھڑی ان دونوں کو اپنی اپنی جگہ پر درست کرتی لیکن وہ پھر ڈھلک آتے۔ آخر میں تنگ آ کر اس نے اپنا دوپٹہ اتار کر ساتھ والی تپائی پر ڈال دیا اور جھولتی ہوئی لٹ کی پرواہ نہ کرتے جلدی جلدی شیو بنانے لگی۔ لیکن ٹھوڑی کے خم کے بال ہر بار بے مونڈے رہ جاتے اس نے برش اٹھا کر ایک دم بہت سا صابن لگا دیا۔ پھر دبا کر ریزر جو چلایا تو ٹھوڑی کے گڑھے سے خون کے ایک قطرے نے سر نکالا۔ اور احمریں قمقمے کی طرح لٹک گیا۔ اس نے گھبرا کر ریزر میز پر رکھا اور تپائی سے دوپٹہ اٹھا کر اور گولا سا بنا کر میری ٹھوڑی کے ساتھ دبا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد گھبرا کر بولی "خود ہی کیجئے یہ خوں فشانیاں ہم سے ایسا پاپ نہیں ہوتا۔"

جب وہ چلی گئی تو میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا ٹھوڑی سے ایک ننھا سا عنابی سوتا پھوٹا اور مقناطیس سے لپٹی ہوئی لوہ چون ایسی ڈاڑھی میں یاقوت کی ایک کرچی سی جگمگانے لگی ––– ٹپ! ٹپ!! ٹپ!!! اور تین یاقوت میز پر پڑے تھے۔

شام کو پتاجی مجھے یہ آرڈر دے کر دورے پہ چلے گئے کہ میں ان کی غیر موجودگی میں باہر ہرگز نہ سوؤں۔ کمرے کا پنکھا رات بھر چلتا رہے اور کھڑکیاں اور روشندان کھلے رہیں۔ سب ٹھیک ہونے پر بھی انہیں میری جان کا خطرہ تھا۔ وہ چلے گئے تو امر آ کر منہ بسورنے لگا۔ "بھاپاجی آپ میرے لئے ٹافیاں کیوں نہیں لائے؟"

"ٹافیاں! یار ٹافیاں وہاں کہاں۔ سرمندی تو ایک گاؤں ہے چھوٹا سا۔"

"تو پھر مجھے پیسے دیجئے میں خود لے آؤں گا۔"

"میرے پاس اس وقت کھلے پیسے نہیں۔" میں نے بٹوا دیکھا۔ "مِنّی سے لے لو!"

"وہ نہیں دے گی۔"

"دے گی کیوں نہیں۔ تم میرا نام لے کر مانگنا۔"

"وہ جب بھی نہیں دے گی۔"

"اچھا تو اسے یہاں بلا لاؤ۔"

"اچھا!"

مِنّی نے آ کر بتایا کہ جب سے بی بی کا انتقال ہوا ہے امر بہت ضدی ہو گیا ہے۔ پتاجی اس سے بہت لاڈ دینے لگے ہیں اور یہ بگڑتا جاتا ہے۔ سارا دن ناک کو تنگ کرتا ہے نوکروں سے جھگڑتا ہے گندے لڑکوں سے کھیلتا ہے

اور جو ڈر بیٹھا تھا چھو ہو گیا ہے۔ اگر مجھ سے خوف نہ کرتا ہو تو سکول جانا بھی چھوڑ دے"۔ لیکن جب میری سفارش پر وہ پپی سے دو آنے لے کر بھاگ گیا تو میں نے کہا: "اسے ابا جان کے پاس لے جاؤں؟"

"ابا جان اب بھی مارتے ہیں کیا؟ — اسی طرح؟"

"ہاں بالکل اسی طرح" میں مسکرایا "بلکہ اب تو ان کا غصہ اور بھی تیز ہو گیا ہے۔"

"سچ!" پپی ایک دم جذباتی ہو گئی "ہائے میرا ابا جان سے ملنے کو دل کتنا ترستا ہے۔"

"تو چلو پھر۔"

یہ سنکر وہ مسکرانے لگی۔ اور شرما کر بولی۔ "اوں ہوں"

میں نے کہا "پپی یاد ہے نا ابا جان نے ایک دفعہ تمہیں بھی پیٹا تھا۔"

"ہاں ہاں!!" اس نے آنکھیں میچ لیں "یہاں چھڑی لگی تھی ان کی۔ آدھی کمر پر اور آدھی بازو پر، لیکن ساری شرارت تو تمہاری تھی۔ تمہیں نے تو مجھے کیچڑ کے گھروندے بنانے کی ترغیب دی تھی۔ تم بڑے شریر تھے جب!"

"اور اب؟"

"اب تو خیر اچھے ہو۔ سرکاری ملازم ہو۔ بی اے پاس ہو — ہاں سچ تم نے بی اے کیسے پاس کر لیا؟"

"جیسے کیا کرتے ہیں۔"

"نقل اڑا کر؟"

"نہیں تو۔"

"میٹرک میں تو تم نے خوب نقل اڑائی تھی۔"

"میٹرک کی باتیں چھوڑو۔ بی۔ اے میں ریاضی نہیں تھی نا۔"

وہ بھی ہنس پڑی۔ "اگر میٹرک میں ہاؤس ہولڈ اکاؤنٹس نہ ہوتا تو میں کبھی اسے پاس نہ کر سکتی۔ بھلا گھر بیٹھے کوئی کیسے بتا سکتا ہے کہ ایک نالی جب حوض کو دو گھنٹے میں خالی کرتی ہے تو دوسری نالی اسی حوض کو کتنے عرصے میں خالی کر دے گی۔"

یہ کہہ کر وہ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی اور آہستگی سے کہا "میں اب جاتی ہوں۔ نانی اماں ادھر آ جائیں گی۔ تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔ پرانے خیال کی عورت ہیں نا۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔ لیکن شام کو ہم "ونگن" ضرور چلیں گے۔ میں تمہیں وہاں ایک چیز دکھاؤں گا۔ اور ہم اتنی ساری باتیں کریں گے۔" میں نے ہاتھ کھول کر کہا "اتنی ساری۔"

جس اچانک پن سے وہ اٹھی تھی اسی اچانک پن سے بیٹھ کر بولی۔ "تمہیں اس شعر کا مطلب آتا ہے؟"

جو بات دل میں رہ گئی نشتر بنی حفیظ
جو لب پہ آ گئی رسن و دار بن گئی

میں نے کچھ دیر سوچ کر کہا "لیکن تم اس شعر کا مطلب سمجھ کر کیا لو گی؟ اسے ایسے ہی رہنے دو۔ شعر سمجھ میں آنے لگیں تو انسان کی روح بے چین ہو جایا کرتی ہے۔"

وہ بھی کچھ دیر سوچ کر بولی "میں نے پتا جی کی الماری سے اکثر اقبال کی کتابیں نکال نکال کر پڑھی ہیں لیکن میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔ دل

کہتا ہے خوب ہے دماغ کو شکوہ رہتا ہے کہ مجھے کچھ پتہ نہیں چلتا۔"

میں نے بے تکے پن سے کہا "مجھے ڈر ہے کسی دن تم خود شعر نہ کہنے لگو۔"

اس کی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی "تمہیں یاد ہے جب تم "ونگن" کے کنوئیں میں اتر کر میرا دوپٹہ نکالنے گئے تھے۔ اور مجھے بھی ساتھ آنے کو کہا تھا۔ تو میں نے کیا جواب دیا تھا — میری بالکل وہی حالت ہے — مجھے زندگی جس قدر عزیز ہے موت سے بھی میں اتنی ہی خائف ہوں۔ لیکن کبھی کبھی اپنے آپ میرے منہ سے یہ نکل جاتا ہے "اے خدا! مجھ سے ایک غزل لکھوا دے۔ چھوٹی بحر کی چھوٹی سی غزل، اس کے بعد چاہے تو مجھے موت ہی دے دے!"

یہ کہہ کر وہ پھر اٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی "ایف اے میں، تمہیں شاید معلوم ہو میں اردو میں اوّل آئی تھی۔ پتاجی نے مجھے جرمنی کا چھپا ہوا دیوان غالب انعام دیا۔ جب سوچتی ہوں تو اکثر روتی ہوں کہ ایف اے میں فرسٹ آکر بھی میں دیوان غالب نہیں سمجھ سکتی۔"

میں نے پمی کو پہلے اس رنگ میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ بچپن میں اسے اردو سے لگاؤ ضرور تھا۔ لیکن صرف قصے کہانیوں اور چھوٹے چھوٹے رسالوں تک — وہ کیوں اس قدر خراب تھی، غالب کے شعروں کی طرح اداس لیکن میٹھی میٹھی۔

شام کو ہم سیر کرنے "ونگن" میں گئے تو امر نے بتایا کہ اب یہ علاقہ مسلوں سے بالکل صاف ہو چکا ہے "مسلے بہت برے ہوتے ہیں۔ اس نے ہوا میں گھونسہ گھما کر کہا "سب کو مارتے ہیں۔"

پمی نے اسے جھڑکا "یہ بڑا آوارہ ہو گیا ہے۔ اسے اباجان کے پاس لے جاؤ۔"

امر نے گھبرا کر پوچھا "اباجان کون؟"

"ہیں ایک" پمی ہنسی "ہم سب ان سے پٹ چکے ہیں۔ ایک دفعہ تم بھی ان کی مار کھا لو گے۔ تو ٹھیک ہو جاؤ گے اور ایسی بکواس نہیں کرو گے۔"

امر سہم گیا "کیا وہ بھی مسلے ہیں" ہم دونوں ہنس پڑے۔

میں پمی کو کوئیں والی بیری کے نیچے لے گیا۔ اور اسے بتایا کہ جب ان کی تبدیلی لائل پور ہوئی تھی اور جس شام وہ یہاں سے چلے گئے تھے اسی شام میں نے پمی کا نام اس بیری پر کھودا تھا۔ دیاسلائی جلا کر میں نے وہ تنا اسے دکھایا لیکن زخم بھر چکا تھا اور اب وہاں نشان بھی نہ تھا۔ پمی کھسیانی سی ہنسی ہنسی اور اس بیری کی جڑیں کھودنے لگی۔

"کیا کر رہی ہو؟" میں نے جھک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ ہنسنے لگی "اسی دن میں نے تمہارے نام ایک خط لکھ کر یہاں دبایا تھا۔ اسے دیکھ رہی ہوں۔"

میرے دل میں غالب کا دیوان پھڑپھڑانے لگا۔ لیکن چھ سال بعد اب اس کا کیا بچا ہوگا؟"

"بچا تو کچھ نہ ہوگا" اس نے اپنا منہ اوپر اٹھایا "پر اتنے عرصے کے بعد آج پھر ایک حماقت کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

امر ان باتوں کو بالکل نہ سمجھ سکا۔ اس کے ذہن پہ شاید اباجان کا بھوت مسلط تھا۔ لیکن میرے دل و دماغ پہ غالب کی "ساری غزل لکھی جا رہی تھی

— مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے، جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

ہوئے۔ دعوتِ مژگاں کئے ہوئے۔ چاک گریباں کئے ہوئے۔ تصورِ جاناں کئے ہوئے۔ تہیۂ طوفاں کئے ہوئے ...... لیکن طوفان تو گزر چکا تھا! در میں تو گرے ہوئے پتوں کے انبار میں سے کچھ پتے نکالنے کے کام پر مامور تھا۔

رات کو امر اپنی چارپائی میرے کمرے میں اٹھا لایا۔ بہت دیر تک باتیں کرتا رہا لیکن میں نے شاید ہی اس کی کسی بات کا جواب دیا ہو پر جب وہ پمّی کی کوئی بات کرتا تو میں غور سے سنتا اور شوق سے جواب دیتا سونے سے پہلے اس نے اپنی قمیص اتار کر کہا "آپ کو پمّی جتنی اچھی لگتی ہے۔ مجھے اتنی ہی بری!" اور پھر کروٹ بدل کر خاموش ہو گیا۔

دوسرے دن صبح پمّی نے امر کو جھنجوڑتے ہوئے میرے گال پر بھی ایک ہلکا سا طمانچہ لگا دیا۔ میں نے ویسے ہی آنکھیں بند کئے ہوئے جواب دیا۔ "بھئی ہم تو جاگ رہے ہیں یہ سزا کس جرم کی؟"

"جاگ رہے ہیں تو اٹھئے نا" اس نے میری ناک اینٹھی "جب بڑے ہی دن کے دس بجے تک سویا کریں گے تو چھوٹوں سے کوئی کیا کہیگا؟"

جب میں اٹھ کر بیٹھ گیا تو اس نے امر کی الٹی قمیص سیدھی کرتے ہوئے کہا "اپنی چھوٹی ریاست سے اتنی بڑی تنخواہ پاتے ہو کچھ کام بھی کیا کرو۔"

میں نے ہاتھ بڑھا کر میز پر رکھی ہوئی فائیلوں کا پلندہ اٹھا لیا۔ اور بغیر کچھ بولے کاغذات الٹنے لگا۔ پمّی جو کچھ کہتی تھی اس کا جواب دینے کی بجائے اس پر عمل کرنے میں لطف آتا تھا۔

امر سکول چلا گیا تو پمّی سنگھ مرچ لگے کھیرے کی پھانکیں کھاتے ہوئے کمرے میں آئی۔ ایک پھانک مجھے دے کر کہا "اس میں فولاد ہوتا ہے پھر روز نہار منہ کھانے سے آدمی ایسا ہو جاتا ہے" اس نے اپنا عنابی دوپٹہ دکھایا۔ میں پھانک کھانے لگا۔ اور اس نے کھونٹی سے میرا ہیٹ اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا۔ پھر آئینے میں دیکھ کر بولی۔ "میں تم لگتی ہوں نا؟"

میں ہنسا تو اس نے ہیٹ ذرا ٹیڑھا کر کے کہا "اب تم لگتی ہوں نا۔ یہ دیکھو تمہاری ایسی ٹھوڑی۔ اور یہ ٹھوڑی کا تل۔ ہو بہو تمہاری ناک ہے اور تمہاری چھوٹی چھوٹی آنکھیں —— اور یہ دیکھو یہ تمہارے ماتھے کی لمبی لمبی سلوٹیں۔" پھر اس نے اپنی لٹکتی ہوئی چوٹی کا گچھا بنا کر ٹوپ میں رکھ لیا اور بولی۔ "اب؟"

میں کچھ جواب بھی نہ دینے پایا تھا۔ کہ وہ کرسی پر ٹانگ رکھ کر بولی "تمہیں نجمہ سے محبت تھی؟"

میں بوکھلا گیا "محبت؟ لیکن یہ تمہیں کہاں سے یاد آ گیا؟"

"ایسے ہی —— جب ہمارے اسکول میں ڈرامہ ہوا تھا تو نجمہ آنٹی بنی تھی —— بتاؤ نا تمہیں اس سے محبت تھی؟"

میں نے جواب دیا "نہیں!"

"لیکن اسے تو تھی۔"

"ہو گی —— کون ہے دنیا میں جو یہ حماقت نہیں کرتا!"

اس کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ گھٹی ہوئی آواز میں اس نے یہی الفاظ دہرائے "ہاں کون ہے دنیا میں جو یہ حماقت نہیں کرتا۔"

"لیکن پمّی" میں نے اس کا راستہ روک لیا "یہ حماقت کوئی بری چیز تو نہیں۔"

رہ بھی ہوگا" اور وہ چلی گئی۔ اتنے میں خداداد آ گیا۔ اس نے بتایا کہ محمد دین ٹرک لے کر آ گیا ہے۔ "ان دونوں لڑکیوں کو ہندوستان سے جائے گا۔ کیونکہ اب ان کا زیادہ دیر یہاں رہنا مناسب نہیں۔

میں نے کہا "ٹھیک ہے لیکن تم محمد دین کو ابھی نہ جانے دو کھانا وانا کھلاؤ اور دالان میں گوندنی کے نیچے اس کی چارپائی ڈال دو اتنا لمبا سفر کر کے آیا ہے۔ ذرا آرام تو کرے۔ کل صبح بھیج دینا۔

خداداد چلا گیا۔ اور میں بغلی غسلخانے میں جا کر کپڑے اتارنے لگا، پانی خوب ٹھنڈا تھا۔ دیر تک نہاتا رہا۔ رات کے باسی پانی نے جسم میں ایک نئی تازگی پھونک دی۔ ٹھنڈے دماغ نے پتی کے بہت سے برفانی مجسمے تراشے اور تصور کی آنکھ کو ترسانے لگا۔ جب میں نہا کر نکلا تو دو نو بازیافتہ لڑکیاں کوٹھری کی دہلیز سے لگی بیٹھی تھیں۔ ان کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ ان کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ اپنے آپ سے بھی چھپی ہوئی تھیں۔ میں نے انہیں رحم بھری نظروں سے دیکھا نہ قہر آلود نگاہوں سے۔ یونہی پاس سے گزرتے ہوئے وہ میرے سامنے آ گئی تھیں۔

دوپہر کو میں چارپائی پر لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا۔ پتی بریکیٹ صاف کر رہی تھی کہ ڈاک کا ہرکارہ آیا۔ ایک رجسٹرڈ لفافہ لایا تھا۔ میں نے لفافہ ہاتھ میں پکڑ کر ادھر ادھر دیکھا تو پتی نے فوراً اپنا ایور شاپ پن نکال کر مجھے دیدیا میں نے دستخط کئے لفافہ کھول کر پڑھا۔ ایک عرضی تھی۔ ٹائپ کے دو صفحوں پر مشتمل کسی مغویہ لڑکی کی روداد جو اس کے والدین نے پاکستان سے لکھ کر بھیجی تھی۔ میں پہلی چند سطریں پڑھ کر ہی سارا مضمون سمجھ گیا اور اسے تپائی پر رکھ کر پن سے کھیلنے لگا۔ نب میں ایک گہرا نشیب تھا۔ میں نے پتی سے پوچھا۔ تو اس نے بتایا کہ ایک دفعہ آمر نے اس میں تختی پر لکھنے والی روشنائی بھر دی تھی۔ اور پتی نے صفائی کے لئے رومال سے نب لپیٹ کر بڑی مشکل سے دانتوں میں پکڑ کر پن سے باہر کھینچی تھی۔ جہاں رومال کی تہہ اکھڑی تھی وہاں دانت کا گہرا نشان پڑ گیا۔ یہ داستان سنا کر پتی ادھر اُدھر جھاڑن مارنے لگی تپائی کی باری آئی تو عرضی جھٹکے سے نیچے گر گئی۔ میں نے اٹھا کر پن سے اس کے حاشیہ پر فوراً ٹیڑھا کر کے لکھ دیا "بہت کوشش کی لیکن کوئی سراغ نہیں ملا۔"

جب وہ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ قرینے سے رکھ چکی تو تپائی سے عرضی اٹھا کر پڑھنے لگی۔ پڑھنے کے دوران میں اس نے مجھ سے انگریزی کے دو مشکل الفاظ کے معنی پوچھے۔ جب پڑھ چکی تو کاغذ ٹیڑھا کر کے میرا ریمارک پڑھا اور رنجیدا کو بڑی کو میری گود میں پھینک دیا "کتنے سنگدل ہو تم؟"

میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں دھند کا ایک ہلکا سا غبار چھا گیا تھا۔ دن بھر وہ میرے کمرے میں نہ آئی۔ آمر بھی غائب رہا۔

مجھے سخت افسوس تھا۔ کہ اس کو میرے سنگدلانہ رویے سے دکھ پہنچا۔ ندامت بھی تھی۔ لیکن احساس ندامت کے ساتھ ساتھ ایک ایسا خلا تھا جس میں ہر جذبہ ہر احساس آن کی آن میں کھو جاتا۔ میں کام کرتا تھا بالکل مشین کی طرح۔ سوچتا بھی مشین ہی کی طرح تھا۔ جو کچھ میری آنکھوں نے دیکھا تھا۔ . . اور بہت دیکھا تھا۔ لیکن اس پر باوجود اس کے کہ میری اپنی آنکھوں نے دیکھا تھا۔ یقین نہیں آتا تھا۔ . . . ٹرک چل رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے نہ چل رہے ہوں۔ مغویہ لڑکیاں برآمد کی جا رہی ہیں شاید نہ کی جا رہی ہوں۔ پاکستان بن گیا ہے۔ کیا پتہ ہے نہ بنا ہو۔ میں میں ہوں اور پتی پتی. . . ممکن ہے غلط ہو . . . میں سنگدل نہیں تھا۔ دراصل پتھروں میں گھر کر پتھرا گیا تھا، میرا احساس

میرا تخیل۔ میرا وجدان سب بچھڑ گئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اچانک میری انگلی میں کوئی چیز چبھی۔ چونکا تو معلوم ہوا کہ عرضی پر سے اپنا لکھا ہوا ریمارک بلیڈ سے کھرچ رہا تھا۔ اب کاغذ پر وہ بہتر نہیں تھے۔ بہت کوشش کی گئی۔ لیکن کوئی سراغ نہیں ملا۔

شام ٹیالی سے اندھیری ہو گئی۔ چمگادڑیں گلی میں ادھر اُدھر منڈلانے لگیں۔ ابھی چاند طلوع نہیں ہوا تھا۔ خداداد، صمد خاں اور محمد دین چبوترے پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ کبھی کبھار کوئی آدمی ان کے پاس سے گزرتا ہوا صاحب سلام کہہ دیتا تو وہ تینوں یک زبان ہو کر اس کا جواب دیتے۔ حقہ کی گڑگڑاہٹ جھیل میں ڈوبتی ہوئی گاگروں کی طرح خوفناک آوازیں نکال رہی تھی۔ دونوں بازیافتہ لڑکیاں ابھی سوئی نہیں تھیں لیکن ان کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں ان کی شکستہ قسمت گہری نیند سو رہی تھی۔ کسی نے آہستہ سے آکر میرا سر چھوا۔ میں چونکا۔ پمی لبوں پر انگلی رکھے خاموش کھڑی تھی۔ مجھ پہ جھک کر بولی "آج میری مدد کرو۔ میں بڑی جنجال میں ہوں۔"

میں نے حیرت سے پوچھا: "کیا بات ہے؟"

اس نے سنجیدگی سے کہا: "مجھے ایک لڑکی کے اغوا کرنے میں مدد دے سکتے ہو؟"

"اغوا؟"

"شی شی۔" اس نے میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ اور میز پر سے میرے کاغذات اٹھا اٹھا کر اٹیچی کیس میں ڈالنے لگی۔ بریکٹ سے کنگھی، تیل اور شیو کا سامان اٹھا کر رکھا۔ کونے سے سلیپر اٹھائے اور ان کو ٹھونسا۔ کھونٹی سے ٹائیاں اتار کر ایک کونے میں گھسیڑ دیں۔ یہ سب کچھ ہو گیا تو مجھ سے مخاطب ہوئی: "اور کچھ؟"

"اور تو کچھ نہیں۔"

"تو جلدی کرو۔ خداداد سے کہو آج ہمیشہ ٹرک میں پیچھے لڑکیوں کو بٹھائے۔"

میں کچھ نہ سمجھ سکا: "لیکن تم کر کیا رہی ہو؟"

"ذرا صبر کرو۔ ذرا صبر کرو!!"

اٹیچی کیس اٹھا کر وہ باہر نکل گئی اور اسے محمد دین کے ہاتھوں میں دے کر بولی "اسے جا کر ٹرک میں ڈال دو اور یہ سامنے بستر بھی۔ اور ان لڑکیوں کو بھی [illegible]!"

محمد دین مجھ سے مخاطب ہوا "کیوں صاحب؟"

میں صرف اس قدر کہہ سکا "ہاں! ہاں!!"

محمد دین جانے لگا تو پمی نے مدھم آواز میں کہا: "اور دیکھو ذرا۔ آنگن سے نکال کر گلی میں بھیجنا!" پھر خداداد اور صمد خاں سے مخاطب ہو کر بولی "جاؤ! تم بھی ٹرک میں جاؤ!" خداداد ٹھٹکا تو ضرور لیکن بڑبڑایا نہیں۔

جب ہم اصطبل کے پہلو سے گزرنے والی اندھیری گلی میں جا رہے تھے تو پمی نے کہنا شروع کیا: "بچن سنگھ بہت برا آدمی ہے۔ میں نے عرضی پہ ہی اس کا نام پڑھ کر ہی حسنا کی حالت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ گو وہ پتاجی کا دوست ہے اور میں اسے چاچا کہتی تھی۔ پر وہ چاچا کہلانے کا مستحق نہیں ۔۔۔ کاش تم نے حسنا کے باپ کی عرضی شروع سے آخر تک پڑھی ہوتی۔"

"میں بہت نادم ہوا پمی۔ مجھے معاف کر دو۔ دراصل ۔ ۔ ۔" ادیبانہ شدت سے ساری ٹریجڈی کا نقشہ کھینچ کر اپنے دل کی حالت بیان کرنے لگا تھا کہ اس نے کہا "ہاں ہاں!! میں معاف کر دوں گی۔ ضرور معاف کر دوں گی۔" ایک تبسم اس کی آنکھیں اندھیرے میں جگنوؤں کی طرح چمکیں اور اس نے گھبرا کر کہا "ذرا تیز قدم چلو۔ چاند نکلنے ہی والا ہے۔"

مجھے بچن سنگھ کے مکان کے پچھواڑے کھڑا کر کے وہ اندر چلی گئی۔ اور دس منٹ

منٹ تک وہاں باتیں کرتی رہی کبھی کبھی مجھے اس کے مصنوعی قہقہے سنائی دیتے جن میں سجن سنگھ اور اس کی بیوی کی کھوکھلی ہنسی بھی شامل ہوتی — جب وہ باہر نکلی تو اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ جو کچھ وہ کہتی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ بے چین ہرنی کی طرح وہ کبھی اِدھر جاتی کبھی اُدھر، تھوڑی دیر بعد اس نے مجھے دیوار کے ساتھ کھڑے ہونے کے لئے کہا۔ میں نے اس کے حکم کی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں اور ڈگمگاتی ہوئی ٹانگوں سے وہ میرے کندھوں پہ چڑھ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ اس کے بوجھ سے شانوں پہ لگے ہوئے اسٹار میرے جسم میں کھب گئے زخم خوردہ ٹھوڑی میں نے اس کی گندھی ہوئی چٹیا کے ریشمی پھول پہ رکھ دی۔ ایک یہی علاج تھا۔ جب وہ اترنے لگی تو پیچھے کو ڈول گئی۔ توازن قائم رکھنے کے لیے اس نے میرے بالوں کو اس مضبوطی سے پکڑا کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جب وہ اتر چکی تو چھت سے ایک اور ٹانگ لٹکی حسنا اتر رہی تھی۔ چوروں کی طرح قدم اٹھاتے ہم ٹرک تک پہنچے صمد تختہ لگائے کھڑا تھا۔ جب حسنا بیٹھ گئی۔ تو پمی نے خداداد اور صمد خاں سے کہا "اپنی سٹین گنوں میں میگزین چڑھا لو۔ سجن سنگھ بہت کڑا آدمی ہے"

"لیکن تم ۔ ۔ تم پمی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "میرا گلا رندھ گیا۔

"ہاں میں — تم میری فکر نہ کرو اب یہاں سے فوراً چل دو۔ دیکھو چاند نکل آیا ہے"

اور ہم چل پڑے۔

حسنا خاموش تھی لیکن اس کا سینہ دھڑک رہا تھا۔ پمی خاموش تھی، اس کی آنکھیں جاگ رہی تھیں۔ میں نے اُن کی طرف غور سے دیکھا کتنی اداس چمک تھی۔ بالکل غالب کے شعروں جیسی۔ دونوں بازیافتہ لڑکیاں بھی خاموش تھیں پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ سامنے نیم تاریک سڑک کی طرف دیکھ رہی تھیں جس کو ٹرک چاٹتا ہوا بھاگا جا رہا تھا۔

خداداد اور صمد خاں خدا معلوم کیا سوچ رہے تھے۔ پھیکی پھیکی سوگوار چاندنی پھیل رہی تھی پمی میرے پاس بیٹھی تھی میں نے جانے اس سے کیوں پوچھا "پاکستان سے تمہارے لیے کیا بھیجوں پمی؟"

پھر جانے خود ہی یوں کہا "تمہارے مطلب کی چیز وہاں کیا ہو گی"

"کیوں نہیں" پمی کے لہجے میں کامل وثوق تھا۔ اس کی آنکھوں میں غالب کا اس شعر چمکے "مجھے پھولوں سے بہت پیار ہے۔ میں ان پر جان دیتی ہوں۔ ہو سکے تو وہاں سے" حسنا اور دو بازیافتہ لڑکیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا "ایسے پھول بھیجتے رہنا۔ میں تمہیں بہت یاد کیا کروں گی — اور ہاں اور — اچھا اب تم جاؤ۔ دیکھو کتنی روشنی پھیل گئی ہے"

جہاں پمی کو اترنا تھا وہاں ٹرک رکا۔ پمی نیچے اتری حسنا کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ میں نے ہولے سے کہا "پمی" وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی میری آنکھیں دھندلا گئیں پھیکی پھیکی سوگوار چاندنی میں اس نے اپنا ہاتھ ہلایا۔ پھر اس کے ہونٹوں میں جنبش پیدا ہوئی "الوداع —"

میرا سارا وجود دکھ دکھ سا ہو گیا "الوداع پمی"

وہ مسکرائی "مجھے غالب کا دیوان انعام میں ملا لیکن افسوس کہ میں غالب کو سمجھ نہ سکی ... ایک شعر ہے اس کا ... موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے ... جانے کیا مطلب ہے اس کا؟ اور یہ کہہ کر وہ چلی گئی ... کیا ابھی اس نے پلٹ کر نہ دیکھا میرے منہ سے بے اختیار نکلا "سنگدل" اور ٹرک سڑک کے پتھروں پہ رینگنے لگا۔

سعادت حسن منٹو

عزت کے لئے

چونی لال نے اپنی موٹر سائیکل اسٹال کے ساتھ روکی اور گدی پر بیٹھے بیٹھے صبح کے تازہ اخباروں کی سرخیوں پر نظر ڈالی۔ سائیکل رکتے ہی اسٹال پر بیٹھے ہوئے دونوں ملازموں نے اُسے نمستے کی تھی جس کا جواب چونی لال نے اپنے سر کی خفیف جنبش سے دے دیا تھا۔ سرخیوں پر سرسری نظر ڈال کر چونی لال نے ایک بندھے ہوئے بنڈل کی طرف ہاتھ بڑھایا جو اسے فوراً دے دیا گیا۔ اس کے بعد اُس نے اپنی بی ایس اے موٹر سائیکل کا انجن اسٹارٹ کیا اور یہ جا وہ جا۔

موڈرن نیوز ایجنسی قائم ہوئے پورے چار برس ہو چلے تھے۔ چونی لال اس کا مالک تھا۔ لیکن ان چار برسوں میں ایک دن بھی اسٹال پر نہیں بیٹھا تھا۔ وہ ہر روز صبح اپنی موٹر سائیکل پر آتا۔ ملازموں کی نمستے کا جواب سر کی خفیف جنبش سے دیتا، تازہ اخباروں کی سرخیاں ایک نظر دیکھتا، ہاتھ بڑھا کر بندھا ہوا بنڈل لیتا اور چلا جاتا۔

چونی لال کا اسٹال معمولی اسٹال نہیں تھا۔ حالانکہ امرتسر میں لوگوں کو انگریزی اور امریکی رسالوں اور پرچوں سے کوئی اتنی دلچسپی نہیں تھی لیکن موڈرن نیوز ایجنسی ہر اچھا انگریزی اور امریکی رسالہ منگواتی تھی۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ چونی لال منگواتا تھا حالانکہ اُسے پڑھنے وڑھنے کا بالکل شوق نہیں تھا۔

شہر میں بہت کم آدمی جانتے تھے کہ موڈرن نیوز ایجنسی کھولنے سے چونی لال کا اصل مقصد کیا تھا۔ یوں تو اس سے چونی لال کو خاصی آمدن ہو جاتی تھی اس لئے کہ وہ قریب قریب ہر بڑے اخبار کا ایجنٹ تھا۔ لیکن سمندر پار سے جو اخبار اور رسالے آتے بہت ہی کم بکتے۔ پھر بھی ہر ہفتے ولایت کی ڈاک سے موڈرن نیوز ایجنسی کے نام کئی خوبصورت بنڈل اور پیکٹ آتے ہی رہتے۔ اصل میں چونی لال یہ پرچے اور رسالے بیچنے کے لئے نہیں بلکہ مفت بانٹنے کے لئے منگواتا تھا چنانچہ ہر روز صبح سویرے وہ ان ہی پرچوں کا بنڈل لینے آتا تھا جو اس کے ملازموں نے باندھ کر رکھ چھوڑے ہوتے تھے۔

شہر کے جتنے بڑے افسر تھے سب چونی لال کے واقف تھے۔ بعض کی واقفیت صرف یہیں تک محدود تھی کہ ہر ہفتے ان کے یہاں جو انگریزی اور امریکی پرچے آتے ہیں، شہر میں کوئی ایک موڈرن نیوز ایجنسی ہے۔ اس کا مالک چونی لال ہے۔ وہ بھیجتا ہے اور بل کبھی روانہ نہیں کرتا۔ بعض ایسے بھی تھے جو اس کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ مثال کے طور پر ان کو معلوم تھا کہ چونی لال

گھر بہت ہی خوبصورت ہے۔ ہے تو چھوٹا سا مگر بہت ہی نفیس طریقے پر سجا ہے۔ ایک نوکر ہے رام، بڑا صاف ستھرا اور سو فیصدی نوکر، سمجھ دار، معمولی سا۔ وہ شاید یہ سمجھتا ہے کہ اسے صرف اپنے کام سے غرض ہے۔ دوسرے کیا کرتے ہیں کیا نہیں کرتے اس سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں۔ چھوٹی لال گھر پر موجود ہو جب تو ایک بات ہے، موجود نہ ہو جب بھی ایک بات۔ مہمان کس غرض سے آیا ہے یہ اس کو اس کی شکل دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے۔ کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ اس سے سوڈے برف کے لئے کہا جائے یا پان کا آرڈر دیا جائے۔ ہر چیز خود بخود وقت پر مل جائے گی اور پھر تاک جھانک کا کوئی خدشہ نہیں۔ اس بات کا بھی کوئی کھٹکا نہیں کہ بات کہیں باہر نکل جائے گی۔ چھوٹی لال اور اس کا نوکر رام دونوں کے ہونٹ دریا کے دریا پینے پر بھی خشک رہتے تھے۔

مکان بہت ہی چھوٹا تھا بمبئی اسٹائل کا۔ یہ چھوٹی لال نے خود بنوایا تھا۔ باپ کی وفات پر اسے دس ہزار روپیہ ملا تھا جس میں سے پانچ ہزار اس نے اپنی چھوٹی بہن کو دے دیئے تھے اور جدی مکان بھی اور خود علیحدہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ اس میں رہتی تھی اور چھوٹی لال الگ اپنے بمبئی اسٹائل کے مکان میں۔ شروع شروع میں ماں بہن نے بہت کوشش کی وہ ان کے ساتھ رہے، ساتھ نہ رہے تو کم از کم ان سے ملتا ہی رہے مگر چھوٹی لال کو ان دونوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے اپنی ماں اور بہن سے نفرت تھی۔ دراصل اسے شروع ہی سے ان دونوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ باپ سے ضرور تھی کہ وہ تھانیدار تھا لیکن جب وہ ریٹائر ہوا تو چھوٹی لال کو اس سے بھی کوئی دلچسپی نہ رہی۔ جس وقت اسے کالج میں کسی سے کہنا پڑتا کہ اس کے والد ریٹائرڈ انسپکٹر پولیس ہیں تو اسے بہت کوفت ہوتی۔

چھوٹی لال کو اچھی پوشش اور اچھے کھانے کا بہت شوق تھا۔ طبیعت میں نفاست تھی چنانچہ وہ لوگ جو اس کے مکان میں ایک دفعہ بھی گئے اس کے سلیقے کی تعریف اب تک کرتے ہیں۔ این ڈبلیو آر کے ایک نیلام میں اس نے ریل کے ڈبے کی ایک سیٹ خریدی تھی۔ اس کو اس نے اپنے دماغ سے بہت ہی عمدہ دیوان میں تبدیل کر ڈالا تھا۔ چھوٹی لال کو یہ اس قدر پسند تھا کہ اس نے اپنی خواب گاہ میں رکھوایا ہوا تھا۔

شراب اس نے کبھی چھوئی نہیں تھی لیکن دوسروں کو پلانے کا بہت شوق تھا۔ ایرے غیرے کو نہیں، خاص الخاص آدمیوں کو جن کی سوسائٹی میں اونچی پوزیشن ہو، جو کوئی مرتبہ رکھتے ہوں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کی وہ اکثر دعوت کرتا۔ کسی ہوٹل یا قہوہ خانے میں نہیں۔ اپنے گھر میں جو اس نے خاص اپنے لئے بنوایا تھا۔

زیادہ پینے پر اگر کسی کی طبیعت خراب ہو جائے تو اسے کسی تردد کی ضرورت نہ ہوتی کیونکہ چھوٹی لال کے پاس ایسی چیزیں ہر وقت موجود رہتی تھیں جن سے نشہ کم ہو جاتا ہے۔ ڈر کے مارے کوئی گھر جانا چاہے تو علیحدہ سجے سجائے دو کمرے موجود تھے۔ چھوٹا سا ہال تھا۔ اس میں کبھی کبھی مجرے بھی ہوتے تھے۔

اکثر ایسا بھی ہوا کہ چھوٹی لال کے اس مکان میں اس کے دوست کبھی کبھی دن اور کبھی کبھی راتیں اپنی سہیلیوں سمیت رہے لیکن اس نے ان کو مطلق خبر نہ ہونے دی کہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ البتہ جب اس کا کوئی کوئی دوست اس کی ان نوازشوں کا شکریہ ادا کرتا تو چھوٹی لال غیر متوقع

طور پر بے تکلف ہو کر کہتا "کیا کہتے ہو یار، مکان تمہارا اپنا ہے"۔ عام گفتگو میں وہ اپنے دوستوں کے اونچے مرتبے کے پیش نظر ایسی بے تکلفی کبھی نہیں برتتا تھا۔

چونی لال کا باپ، لالہ گردھاری لال عین اس وقت ریٹائر ہوا۔ جب چونی لال تھرڈ ڈویژن میں انٹرنس پاس کر کے کالج میں داخل ہوا۔ پہلے تو یہ تھا کہ صبح شام گھر پہ ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ڈالیوں پہ ڈالیاں آ رہی ہیں، رشوت کا بازار گرم ہے، تنخواہ تو بس سیدھی بنک میں چلی جاتی تھی۔ لیکن ریٹائر ہونے پر کچھ ایسا پانسہ پلٹا کہ لالہ گردھاری لال کا نام جیسے بڑے آدمیوں کے رجسٹر ہی سے کٹ گیا۔ یوں تو جمع پونجی کافی تھی۔ لیکن گردھاری لال نے بیکار مباش کچھ کیا کر مکانوں کا سٹہ کھیلنا شروع کر دیا اور دو برسوں ہی میں آدھی سے زیادہ جائداد گنوا دی۔ پھر لمبی بیماری نے آ گھیرا۔ ان تمام واقعات کا چونی لال پر عجیب و غریب اثر ہوا۔ لالہ گردھاری لال کا حال پتلا ہونے کے ساتھ ساتھ چونی لال کے دل میں اپنا پرانا ٹھاٹ اور اپنی پرانی ساکھ قائم رکھنے کی خواہش بڑھتی گئی اور آخر میں اس کے ذہن نے آہستہ آہستہ کچھ ایسی کروٹ بدلی کہ وہ بڑے آدمیوں کا حلیف، ہم جلیس تھا، ہم پیالہ و ہم نوالہ تھا لیکن اصل میں وہ ان سے بہت دور تھا۔ ان کے رُتبے سے، ان کی جاہ و منزلت سے البتہ اس کا وہی رشتہ تھا جو ایک بُت سے پجاری کا ہوتا ہے یا ایک آقا سے غلام کا۔

ہو سکتا ہے کہ چونی لال کے وجود کے کسی گوشے میں بہت ہی بڑا آدمی بننے کی خواہش تھی، جو وہیں کی وہیں دب گئی اور یہ صورت اختیار کر گئی جو اب اس کے دل و دماغ میں تھی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جو کچھ بھی وہ کرتا تھا اس میں انتہائی درجے کا خلوص تھا۔ کوئی بڑا آدمی اس سے ملے نہ ملے یہی کام تھا کہ وہ اس کے دیئے ہوئے امریکی اور انگریزی پرچے ایک نظر دیکھ لیتا

فسادات ابھی شروع نہیں ہوئے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیئے۔ کہ تقسیم کی بات بھی ابھی نہیں چلی تھی۔ کہ چونی لال کی بہت دنوں کی پرانی مراد پوری ہوتی نظر آئی۔ ایک بہت ہی بڑے افسر تھے جن سے چونی لال کی جان پہچان نہ ہو سکی تھی۔ ایک دفعہ اس کے مکان پہ شہر کی سب سے خوبصورت طوائف کا مجرا ہوا۔ چند دوستوں کے ہمراہ اس بڑے افسر کا منجھلا بیٹا ہربنس بھی چلا آیا۔ چنانچہ جب چونی لال کی اس نوجوان سے دوستی ہو گئی تو اس نے سمجھا کہ ایک نہ ایک دن اس کے باپ سے بھی راہ و رسم پیدا ہو ہی جائے گی۔

ہربنس جس نے تعیش کی زندگی میں نیا نیا قدم رکھا تھا بہت ہی الہڑ تھا۔ چونی لال خود تو شراب نہیں پیتا تھا لیکن ہربنس کا شوق پورا کرنے کے لیے اور اسے شراب نوشی کے ادب آداب سکھانے کے لئے ایک دو دفعہ اسے بھی پینی پڑی لیکن بہت ہی قلیل مقدار میں۔

لڑکے کو شراب پینی آ گئی تو اس کا دل کسی اور چیز کو چاہا۔ چونی لال نے یہ بھی مہیا کر دی اور کچھ اس انداز سے کہ ہربنس کو جھینپنے کا موقع نہ ملنے دیا۔

جب کچھ دن گذر گئے تو چونی لال کو محسوس ہوا کہ ہربنس ہی کی دوستی کافی ہے کیونکہ اسی کے ذریعے سے وہ لوگوں کی سفارشیں پوری کرا لیتا تھا۔ ویسے تو شہر میں چونی لال کے اثر و رسوخ کا ہر شخص قائل تھا لیکن جب سے ہربنس اس کے حلقۂ واقفیت میں آیا تھا۔ اس کی دھاک اور بھی زیادہ بیٹھ گئی تھی۔

اکثر یہی سمجھتے تھے کہ چونی لال اپنے اثر و رسوخ سے ذاتی فائدہ اُٹھاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس نے اپنے لئے کبھی کسی سے سفارش نہیں کی تھی۔ اس کو شوق تھا دوسروں کے کام کرنے کا اور انہیں اپنا ممنونِ احسان بنانے کا بلکہ یوں کہئے کہ ان کے دل و دماغ پر کچھ ایسے خیالات طاری کرنے کا کہ چونی لال کمال ہے۔ ایک معمولی سی نیوز ایجنسی کا مالک ہے لیکن بڑے بڑے حاکموں تک اس کی رسائی ہے۔ بعض یہ سمجھتے تھے کہ وہ خفیہ پولیس کا آدمی ہے جتنے منہ اتنی باتیں، لیکن چونی لال حقیقت میں جو کچھ تھا بہت ہی کم آدمی جانتے تھے۔

ایک کو خوش کیجئے تو بہت سوں کو ناراض کرنا پڑتا ہے چنانچہ چونی لال کے جہاں احسان مند تھے وہاں دشمن بھی تھے اور اس تاک میں رہتے تھے کہ موقع ملے اور اس سے بدلہ لیں۔

فسادات شروع ہوئے تو چونی لال کی مصروفیات زیادہ ہو گئیں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے لئے اس نے کام کیا لیکن صرف ان ہی کے لئے جن کا سوسائٹی میں کوئی وجود تھا۔ اس کے گھر کی رونق بھی بڑھ گئی۔ قریب قریب ہر روز ہی کوئی نہ کوئی سلسلہ رہتا۔ اسٹور روم جو سیڑھیوں کے نیچے تھا شراب اور بیئر کی خالی بوتلوں سے بھر گیا تھا۔

ہربنس کا ڈر اب بہت حد تک دور ہو چکا تھا۔ اب اسے چونی لال کی مدد کی ضرورت نہ تھی۔ بڑے آدمی کا لڑکا تھا۔ فسادات نے دستر خوان بچھا کر نت نئی چیزیں اس کے لئے چن دی تھیں چنانچہ قریب قریب ہر روز وہ چونی لال کے مکان پر موجود ہوتا۔

رات کے بارہ بجے ہوں گے۔ چونی لال اپنے کمرے میں ریل گاڑی کی سیٹ سے بنائے ہوئے دیوان پر بیٹھا اپنے پستول کو انگلی پر گھما رہا تھا کہ دروازے پر زور کی دستک ہوئی۔ چونی لال چونک پڑا اور سوچنے لگا — بلوائی؟ — نہیں! — رادھا؟ — نہیں، وہ تو کئی دنوں سے کرفیو کے باعث نہیں آ رہا تھا۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی اور ہربنس کی سہمی ہوئی ڈری ہوئی آواز آئی۔ چونی لال نے دروازہ کھولا۔ ہربنس کا رنگ ہلدی کے گابھے کی طرح زرد تھا۔ ہونٹ تک پیلے تھے۔ چونی لال نے پوچھا "کیا ہوا؟"

"وہ .... وہ ...." آواز ہربنس کے سوکھے ہوئے گلے میں اٹک گئی۔

چونی لال نے اس کو دلاسا دیا "گھبرائیے نہیں ... بتائیے کیا ہوا ہے؟"

ہربنس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "وہ ... وہ ... لہو ... بند ہی نہیں ہوتا لہو"

چونی لال سمجھا تھا کہ شاید لڑکی مر گئی ہے۔ چنانچہ یہ سن کر اسے ناامیدی سی ہوئی کیونکہ وہ لاش کو ٹھکانے لگانے کی پوری اسکیم اپنے ہوشیار دماغ میں تیار کر چکا تھا۔ ایسے موقعوں پہ وہ بہت مستعد ہو جاتا تھا۔ مسکرا کر اس نے ہربنس کی طرف دیکھا جو کہ لرز رہا تھا "میں سب کچھ ٹھیک کئے دیتا ہوں۔ آپ گھبرائیے نہیں"

یہ کہہ کر اس نے اس کمرے کا رخ کیا جس میں ہربنس تقریباً سات بجے سے ایک لڑکی کے ساتھ جانے کیا کر رہا تھا۔ چونی لال نے ایک دم بہت سی باتیں سوچیں۔ ڈاکٹر — نہیں۔ بات باہر نکل جائے گی۔ ایک بہت بڑے آدمی کی عزت کا سوال ہے، اور یہ سوچتے ہوئے اسے عجیب و غریب قسم کی مسرت محسوس ہوئی کہ وہ ایک بہت بڑے آدمی کے ننگ و ناموس کا محافظ ہے۔

رہا ہے؟.... کرفیو کے باعث وہ کئی دنوں سے نہیں آ رہا تھا.... برف؟..... ہاں برف ٹھیک ہے۔ ریفریجریٹر موجود تھا.... لیکن سب سے بڑی پریشانی چوتی لال کو یہ تھی کہ وہ لڑکیوں اور عورتوں کے ایسے معاملوں سے بالکل بے خبر تھا لیکن اس نے سوچا۔ کچھ بھی ہو کوئی نہ کوئی اوپائے نکالنا ہی پڑے گا۔

چوتی لال نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ ساگوان کے اس پرنگوں والے پلنگ پر ایک لڑکی لیٹی تھی۔ اور سفید چادر خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔ چوتی لال کو بہت الجھن آئی لیکن وہ آگے بڑھا۔ لڑکی نے کروٹ بدلی اور ایک چیخ اس کے منہ سے نکلی "بھیا!"

چوتی لال نے بھینچی ہوئی آواز میں کہا "روپا" اور اس کے دماغ میں اوپر تلے سینکڑوں باتوں کا انبار سا لگ گیا۔ ان میں سب سے ضروری بات یہ تھی کہ ہربنس کو پتہ نہ چلے کہ روپا اس کی بہن ہے چنانچہ اس نے منہ پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اور باہر نکل کر معاملے پر غور کرنے کے لئے دروازے کی طرف بڑھا۔

دہلیز ہی پر ہربنس کھڑا تھا۔ اس کا رنگ اب پہلے سے بھی زرد تھا ہونٹ بالکل بے جان ہو گئے تھے۔ آنکھوں میں وحشت تھی چوتی لال کو دو بدو دیکھ کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔

چوتی لال نے دروازہ بھیڑ دیا۔ ہربنس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

چوتی لال خاموش تھا۔ اس کے چہرے کا کوئی خط بگڑا ہوا نہیں تھا۔ اصل میں وہ سارے معاملے پر غور کر رہا تھا۔ اس قدر انہماک سے غور کر رہا تھا۔ کہ وہ ہربنس کی موجودگی سے بھی غافل تھا مگر ہربنس کو چوتی لال کی غیر معمولی خاموشی میں اپنی موت دکھائی دے رہی تھی۔ چوتی لال اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو ہربنس زور سے چیخا اور مڑ کر چوتی لال کو ایک طرف دھکا دے کر خود اس میں داخل ہو گیا۔ بہت ہی زور سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ریل گاڑی کی سیٹ والے دیوان سے پستول اٹھایا اور باہر نکل کر چوتی لال کی طرف تان دیا۔

چوتی لال پھر بھی کچھ نہ بولا۔ وہ ابھی تک معاملہ سلجھانے میں مستغرق تھا۔ سوال ایک بہت بڑے آدمی کی عزت کا تھا۔

پستول ہربنس کے ہاتھ میں کپکپانے لگا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ جلد فیصلہ ہو جائے لیکن وہ اپنی پوزیشن صاف کرنا چاہتا تھا۔ چوتی لال اور ہربنس دونوں کچھ دیر خاموش رہے.... لیکن ہربنس زیادہ دیر تک چپ نہ رہ سکا۔ اس کے دل و دماغ میں بڑی ہلچل مچی ہوئی تھی چنانچہ ایک دم اس نے بولنا شروع کیا "میں...... میں..... مجھے کچھ معلوم نہیں..... مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ یہ...... کہ یہ تمہاری بہن ہے......... یہ ساری شرارت اس مسلمان کی ہے........ اس مسلمان سب انسپکٹر کی..... کیا نام ہے اس کا..... کیا نام ہے اس کا...... محمد طفیل... ہاں ہاں محمد طفیل.... نہیں نہیں.... بشیر احمد... نہیں نہیں.... بشیر احمد.... نہیں نہیں محمد طفیل..... وہی محمد طفیل جس کی ترقی تم نے رکوائی تھی...... اس نے مجھے یہ لڑکی لا کر دی اور کہا مسلمان ہے.... مجھے معلوم ہوتا تمہاری بہن ہے تو کیا میں اسے یہاں لے کر آتا.... تم.... تم.... تم بولتے کیوں نہیں.... تم بولتے کیوں نہیں.... اور اس نے چلانا شروع کر دیا

تم بولتے کیوں نہیں...... تم مجھ سے بدلہ لینا چاہتے ہو...... تم مجھ سے بدلہ لینا چاہتے ہو...... لیکن میں کہتا ہوں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا...... مجھے کچھ معلوم نہیں تھا...... مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔"

چونی لال نے ہولے سے کہا: "گھبرائیے نہیں...... آپ کے پتا جی کی عزت کا سوال ہے۔" لیکن ہربنس چیخ چلا رہا تھا۔ اس نے کچھ نہ سنا۔ اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پستول داغ دیا۔

تیسرے روز کرفیو آرڈر ہٹنے پر چونی لال کے دو نوکروں نے موڈرن نیوز ایجنسی کا اسٹال کھولا۔ تازہ اخبار اپنی اپنی جگہ پر رکھے۔ چونی لال کے لئے اخباروں اور رسالوں کا ایک بنڈل باندھ کر الگ رکھ دیا مگر وہ نہ آیا۔

کئی راہ چلتے آدمیوں نے تازہ اخباروں کی سرخیوں پر نظر ڈالتے ہوئے معلوم کیا کہ موڈرن نیوز ایجنسی کے مالک چونی لال نے اپنی سگی بہن کے ساتھ منہ کالا کیا اور بعد میں گولی مار کر خودکشی کر لی ✦

کالی پیلی ٹیڑھی اور خشک ٹانگیں کچھ میلی پھٹی دھوتیوں میں الجھی ہوئی مرگھلی ٹانگیں کیچڑ اور میل میں لتھڑی ہوئی کمزور ٹانگیں اور کبھی بھاری توند کے وزن سے کراہتی ہوئی مجروح ٹانگیں اس کی کھڑکی کے نیچے سے گذرا کرتیں۔ کبھی کبھی چکنے پتلون اور اُجلے موزوں میں لپٹی ہوئی لمبی ٹانگوں کی ایک آدھ جوڑی گزر جاتی۔ مگر بہت کم بیٹھے بیٹھے وہ اکتا جاتی۔ دنیا مجسم ٹانگیں بن کر اس کھڑکی کے نیچے چلتی رہتی۔ اسے ان پر ترس آتا۔ تھک نہیں جاتیں یہ۔ کب سے چل رہی ہیں اور نہ جانے کتنے دن اور چلیں گی۔ انہیں ٹھنڈ میں بھی کوئی نہیں ڈھکتا۔ پالے سے کوئی نہیں بچاتا۔ دھوپ کی آنچ سے کوئی نہیں ہٹاتا ... یورپ میں تو شوقین مزاجوں نے ننگے کلب نکالے ہیں اور یہاں تین چوتھائی مخلوق جنم سے ہی برہنہ رہنے کا بندوبست کر کے آتی ہے۔ ایسے بھی ملک ہیں جہاں مفید خوراک مہیا کرنے والے محکمے قائم ہیں۔ پنیر، مکھن، دودھ اور گھی نے جو انسانوں کو چربی کی پوٹلیوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس کا کچھ تو علاج ہونا چاہیے۔ دولت کا جتنا حصہ گوشت اور چربی بڑھانے میں صرف ہوتا ہے۔ کم از کم اس کا نصف تو ایسی مشین ایجاد کرنے میں صرف ہونا چاہیے جو موٹاپے سے عاجز بے چاروں کو ذرا ہلکا کر دیں۔ کتنے مزے کی بات ہے۔ جبکہ دنیا کے ایک حصے میں گوشت اور پوست کی اس قدر قلت ہے۔ دوسرے حصوں میں ذہنی عناصر کی زیادتی پر کو کل پرزوں سے چھیل چھیل کر دور کیا جاتا ہے۔ کاش ان خوش نصیب انسانوں کے جسم کی چھیلن ہی ان انسانی ڈھانچوں پر منڈھ دی جائے جو یہاں گھوم رہے ہیں۔ تو ترازو کے دو پلڑوں میں کچھ تو توازن پیدا ہو جائے ✦

(عصمت از ٹیڑھی لکیر)

سیف الدین سیف

میکدہ

(ایک غنائیہ)

پہلا شرابی:-

قلقل کی صدا کچھ اور کہتی ہے مجھے
مستانہ ہوا کچھ اور کہتی ہے مجھے
بے وقت کی راگنی نہ چھیڑ اے واعظ
موسم کی ادا کچھ اور کہتی ہے مجھے

دوسرا شرابی:-

دشوار ہے غم کی تاب لانا — ساغر دینا شراب لانا
وہ بادۂ مشکبو کدھر ہے — ساقی! ساقی! سبو کدھر ہے
مٹتا ہوا داغ ہے جوانی — تربت کا چراغ ہے جوانی
جس دن سے امید کھو گئی ہے — شب کتنی دراز ہو گئی ہے
محفل کی شگفتگی کہاں ہے — وہ رنج کہاں خوشی کہاں ہے
اب بزم کا رنگ اور کچھ ہے — دل اور امنگ اور کچھ ہے
غم کتنے بدل گئے ہیں ساقی — ہم کتنے بدل گئے ہیں ساقی

اک صرصرِ حادثات بن کر   موت آئی غمِ حیات بن کر
پامال کیا ہے زندگی نے   کیا حال کیا ہے زندگی نے
یہ جلوۂ مہر و ماہ پیارے   ہے ایک نفس کی راہ پیارے
پھر سن نہ سکو گے یہ کہانی
بجھتی ہوئی جوت ہے جوانی

تیسرا شرابی:- سب کچھ مری بے بسی سہے گی ساقی
دنیا اسی عالم میں رہے گی ساقی
ہر قطرۂ بحر کو شکایت ہو مگر
یہ موج اسی طرح بہے گی ساقی

دوسرا شرابی:- اے مطربانِ زندگی
شاید حقیقت اور ہو   میں نے تو سمجھا ہے یہی
راحت فریبِ آرزو   حسرت مآلِ زندگی
اب چاہتا ہے دل یہی
دیوارِ حسرت پھاند کر   روپوش ہو جاؤں کہیں
تاریکیوں کی گود میں،   چپ چاپ سو جاؤں کہیں
اے مطربانِ زندگی

اس محفلِ دیرینہ میں کوئی نہیں غم آشنا
اے حسن، اے غم، اے خدا انجام کیا ہوگا مرا!

ویرانۂ دل سے مجھے
اکثر یہ آتی ہے صدا
اے مطربانِ زندگی

تیسرا شرابی :-

پھر آیا ترا خیال چلتے چلتے
پھر چلنا ہوا محال چلتے چلتے
تقدیر نے آکے ایسا مہرہ پھینکا
پھر بھول گیا ہوں چال چلتے چلتے

چوتھا شرابی :-

کل کا انداز کچھ تھا اب کچھ ہے
دوست اس زندگی میں سب کچھ ہے
ہر خوشی میں ہے غم کا ہاتھ یہاں
رنج و راحت ہے ساتھ ساتھ یہاں
درد و غم کی حقیقتیں مت پوچھ
زندگی کی مسرتیں مت پوچھ
محفلِ عیش میں دھواں کیوں ہو
جو دیا بجھ چکا یہاں کیوں ہو
لطفِ امروز پر نظر ڈالو
کل کے سائے نہ آج پر ڈالو
در حقیقت خزاں ہے خوفِ خزاں
اس طرح زندگی گذار یہاں
دل فریبِ حیات کھا جائے
غم نہ کھائے یہ مات کھا جائے

پہلا شرابی:- اب دیدۂ پرنم کی حقیقت کیا ہے
تو ہے تو مرے غم کی حقیقت کیا ہے
اک جام اگر حسنِ ادا سے مل جائے
افکارِ دو عالم کی حقیقت کیا ہے

پانچواں شرابی:- نازک و مرمریں صراحی سے اپنا ماضی انڈیلتا ہوں میں
خواب سے تیرتے ہیں ساغر میں عمرِ رفتہ سے کھیلتا ہوں میں

چھٹا شرابی:- طوفاں پہ سفینے کا گماں ہے اب ناچ
اب عمرِ رواں موج رواں ہے اب ناچ
اے عشقِ جنوں سوز کدھر ہے کچھ گا!
اے حسنِ جنوں ساز کہاں ہے اب ناچ

(رقاصہ کا رقص)

ساتواں شرابی:- ناچ ناچ سروِ نوبہار ناچ
دیکھ اشک و آہ سے نظر بچا زندگی کو اپنی تال پر نچا
زلف کی طرح نگاہ پر بکھر جھوم جھوم ناچ ناچ اِدھر اُدھر
فرصتِ حیات رات بھر کی ہے ناچ ناچ رات رات بھر کی ہے
رات بھر تو کیفِ مستعار ناچ
ناچ ناچ سروِ نوبہار ناچ

بازوؤں کے رس بھرے لبھاؤ میں
لوچ ہو لچک ہو اور کچھ نہ ہو　　چھن چھنا چھنک ہو اور کچھ نہ ہو
ساز کی لپک ہو اور کچھ نہ ہو　　گونج ہو گمک ہو اور کچھ نہ ہو
پنڈلیوں کے مرمریں تناؤ میں
بازوؤں کے رس بھرے لبھاؤ میں

گاہ گاہ دیکھ اور مسکرا!
بھول جا کہ زندگی میں غم بھی ہے　　بھول جا کہ فکرِ بیش و کم بھی ہے
تلخیِ حیات آج بھول جا　　دیکھ چاند رات آج بھول جا
یوں تھرک ہوا میں رنگ ناچ اٹھے　　پور پور انگ انگ ناچ اٹھے
دیکھ آہ دیکھ اور مسکرا
گاہ گاہ دیکھ اور مسکرا

کائنات بھی تو ایک رقص ہے
اک عجیب رقص جس کے دائرے　　اک مہیب رقص جس کے دائرے
زندگی پہ دام پھینکتے ہوئے　　رنگ صبح و شام پھینکتے ہوئے

ہونکتے ہیں کروٹیں بدلتے ہیں — زندگی نگلتے ہیں اگلتے ہیں
خود حیات بھی تو ایک رقص ہے — کائنات بھی تو ایک رقص ہے

پہلا شرابی:-
برہم نظر آتے ہیں نظارے کچھ گاؤ
پھر نشۂ صہبا کے سہارے کچھ گاؤ
خاموش ہوئی جاتی ہے دل کی دھڑکن
روپوش ہوئے جاتے ہیں تارے کچھ گاؤ

رقاصہ:-
وہ گریزاں نگاہ بھی نہ رہی — دل کی حالت تباہ بھی نہ رہی
کیا ہوا تیرا جلوۂ صد رنگ — حیرت یک نگاہ بھی نہ رہی
آرزو دل سے آہ بن کے اٹھی — لب تک آئی تو آہ بھی نہ رہی
کیسے چکر میں آئے ہیں دن رات — گردش مہر و ماہ بھی نہ رہی
اے غم زندگی دہائی ہے — خلش گاہ گاہ بھی نہ رہی
ہائے بے کیفیٔ حیات کہ سیفؔ
آرزوئے گناہ بھی نہ رہی

محمد حسن عسکری

آخری سلام

کرسٹفر اشروڈ پچھلے بیس سال کا سب سے نمایاں ناول نگار ہے اور یہ اس کی بہترین تصنیف ہے۔ اشروڈ کی ساری انسانی ہمدردی، طنز، تمسخر، انسانیت، ترحم، افسردگی، انسان کے متعلق غم آمیز تفکر سب اس کتاب میں کھنچ آیا ہے۔ اس کے کردار مضحکہ خیز بھی ہیں اور المناک بھی —

"آخری سلام کا انگریز مصنف اس دور کے افسانہ نگاروں میں بہت مقتدر حیثیت رکھتا ہے، پچھلے بیس برس میں شاید ہی کوئی ایسی افسانوی کتاب شائع ہوئی ہو جو حقائق نگاری میں آخری سلام پر فوقیت رکھتی ہو۔ اصل کے تاثر کو حسن عسکری نے بڑی خوبی سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ آخری سلام موجودہ زمانے کا سب سے اچھا ترجمہ ہے۔"

(ڈاکٹر تاثیر)

قیمت ساڑھے چار روپے ۴/۸

بلونت سنگھ

سنہرا دیس

خامکاری بلونت سنگھ کا وصف ہے۔ اس کا فن سکھ جاٹ کی چھوی ہے۔ کہنے کو تو بہت ہی پرانے فیشن کا ہتھیار ہے لیکن اس کا وار بہت ہی بھرپور ہوتا ہے۔ نئے افسانہ نگاروں میں بلونت سنگھ کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے پہلی بار پنجاب کے دیہاتوں کی زندگی کو اس کے تمام اکھڑ اور اکھڑپن کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بلونت سنگھ کی موٹے برش سے بڑے بڑے اور چوڑے چوڑے خطوط سے کھینچی ہوئی دیہاتی تصویریں احمد ندیم قاسمی کی نرم و نازک خطوط و الوان میں بنائی ہوئی تصویروں کا ایک نہایت ہی فکر افروز تقابل ہیں۔

قیمت چار روپے -/۴

تار و پود

تار و پود کے ہر افسانے میں زندگی ابلتی اور چھلکتی ہوئی نظر آتی ہے مخصوص طور پر پنجاب کی وہ قوی، صحت مند اور توانا دیہاتی زندگی جس کو شاید ہی کوئی افسانہ نگار بلونت سنگھ سے بہتر انداز میں پیش کر سکا ہے، ہر افسانہ کسی نہ کسی ندرت اور نفسیاتی پہلو کا حامل ہے اس کے افسانے اردو کے شاہکار افسانوں میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ "ہماری زبان" -/۳

حسین کتابیں شائع کرنے والا ادارہ

مکتبہ جدید لاہور

عزیز احمد

ایسی بلندی ایسی پستی

"ایسی بلندی ایسی پستی" صرف چند افراد کی داستان نہیں، بلکہ ساتھ ساتھ ایک مخصوص طبقے کی کہانی بھی ہے۔ غالباً یہ اُردو کا پہلا اجتماعی ناول ہے، اور اردو میں نیا تجربہ ہے۔ حیدرآباد کے امیر طبقے کی تصویر اس سے پہلے کبھی اتنی کامیابی سے پیش نہیں کی گئی۔ مگر عزیز احمد صاحب نری اجتماعیت میں بھی پھنس کے نہیں رہ گئے۔ انہوں نے انفرادی کرداروں کا بھی لحاظ رکھا ہے اور انہیں پوری طرح نمایاں ہونے کا موقع دیا ہے۔ پھر یہ کردار اور یہ ساری تصویریں جس دھیمی دھیمی طنز کی فضا میں لپٹی ہوئی ہیں اُس کا لطف بالکل ہی الگ ہے۔"

(محمد حسن عسکری)

قیمت -/۴

گریز

"ٹکنیک، پلاٹ اور کردار سازی کے اعتبار سے بہت کم جدید اردو ناول گریز سے ٹکر لے سکتے ہیں۔ گریز کا تار و پود نہایت چابکدستی سے تیار کیا گیا ہے۔ واقعات کا ربط و تسلسل اس امر پر دال ہے کہ عزیز احمد کو ناول کی ٹکنیک پر قابلِ رشک عبور حاصل ہے۔"

"کنہیا لال کپور"

"اردو میں تعداد کے لحاظ سے ناول بہت ہیں، خصوصیت کے لحاظ سے بہت کم — گریز اُن ناولوں میں سے ہے جو خصوصیت کے لحاظ سے اہم قرار پائیگا۔ گریز ایک بہت کامیاب ناول ہے" احتشام حسین

رقصِ ناتمام

"افسانوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عزیز احمد کو ناول نگاری کی طرح افسانہ نگاری میں بھی ید طولیٰ حاصل ہے۔ رقصِ ناتمام کے افسانے زبان، بیان اور ٹکنیک کے لحاظ سے ایک خاص معیار پر پورے اترتے ہیں اور اُن تمام اوصاف سے متصف ہیں جنہیں صحیح ترقی پسندی کا طرۂ امتیاز کہا جاتا ہے۔

"کتاب"

——— دو اڑھائی سال کے قلیل عرصہ میں اور صرف بارہ پندرہ افسانوں کے ساتھ عزیز احمد افسانہ نگاری کے میدان میں بھی ایک خاص اہمیت کے مالک ہیں۔ اور ایک خاص جگہ کے مستحق۔ انہوں نے جدید اردو افسانے میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے۔ اس میں کئی نئے عناصر لے آئے ہیں۔ کئی نئے انوکھے اور اہم تجربوں کے وہ خالق ہیں۔"

ممتاز شیریں "نیا دور"

قیمت ۳/۸

ہوس

"اردو میں بہت حد تک ناول نگاری کی طرف توجہ نہیں دی گئی چنانچہ ایسے ناول جو صحیح معنوں میں کامیاب سمجھے گئے ہوں انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ پونے دو سو صفحات کے اس ناول میں وہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں جو ایک اچھے ناول میں ہونی چاہئیں۔"

"ہمایوں"

قیمت -/۲

ریڈیو کورس ـــــ پانچ حصّے ـــــ قیمت فی حصہ ۳/-

رہنمائے صحت

تندرستی ہزار نعمت ہے

چھ سو صفحات کی اس ضخیم کتاب میں تندرست اور مضبوط بنانے والی ورزشیں عام بیماریاں اور ان کے علاج حسن و شباب کے پوشیدہ راز، عمر بڑھانے اور سو سال تک جینے کے قدرتی طریقے، صحت و تندرستی کے متعلق مشاہیر عالم کے ذاتی تجربات اور صحت کو قائم رکھنے والے گر جناب "مہانند" نے بڑی کوشش اور محنت سے اکٹھے کئے ہیں۔

ساتواں ایڈیشن اور بے شمار تصویریں — قیمت چھ روپے آٹھ آنے ۶/۸

صنعت و حرفت کے قیمتی راز

تعلیم یافتہ طبقہ کی خوفناک بے روزگاری کو دور کر کے ملک کو صنعت و حرفت کی دولت سے مالا مال کر دینے والی ایک بے نظیر کتاب ـــ یورپ، امریکہ، جاپان، ہندوستان اور پاکستان کے مشہور تجارتی فارمولے۔

ساتواں ایڈیشن قیمت ۳/۱۲

مخزن صنعت و تجارت

یورپ و امریکہ کی صنعت و حرفت کی کتابوں کا نچوڑ۔

کوئی شخص ترقی و کامیابی حاصل کرنا چاہے تو کسی ایک کام کو پکڑ کر تھوڑے ہی عرصہ میں خوشحال ہو سکتا ہے۔ ہر کام کے متعلق مکمل ہدایات ہیں۔ مثلاً ـــ صابون سازی، خوشبودار تیل بنانا، آئینہ سازی، خضاب سازی، روشنائیاں بنانا وغیرہ

قیمت چار روپے بارہ آنے ۴/۱۲



موت کا جنم

پروفیسر محمود ہاشمی

محبت شاعری اور وقت کی ابتدا ـــ سات جزیروں کی جگمگ جگمگ کرتی بستی میں دو نفس رات بھر جاگتے رہے۔ انہیں گذرتے ہوئے لمحوں کا احساس ہوا۔ ذہن کے مرغزاروں میں تخیل کے ہیولے لہرائے۔ لیکن بستی کا کہن سالہ بزرگ نت نئے سپنے بننے والی لڑکی سے آخری دم تک یہ نہ کہہ سکا کہ "خود فریبی کا یہ جال بڑا کمزور ہوتا ہے"

دیو مالا نہیں سچی کہانی! ـــ
ـــ سچی کہانی نہیں دیو مالا!! ـــ
خدا معلوم آپ کیا سمجھیں!!!

قیمت ۱/۸

مکتبہ جدید لاہور دو ماہی سلسلہ "اردو ادب" کے اجرا کا اعلان کرتا ہے
جس کے اوراق لکھنے اور پڑھنے والوں کیلئے صحت مند اور فکر خیز فضا مہیا کریں گے،

آپ

مکتبہ جدید لاہور سے تعاون کیجئے

آپ کی فرمائش پر اردو ادب کی ہر ایک کتاب
مہیا کی جائے گی



دو ماہی سلسلہ "اردو ادب" کی خریداری اور کتابوں
کی فرمائش کے لئے منسلکہ کارڈ استعمال کریں۔
اس پر ٹکٹ لگانے کی ضرورت نہیں۔

نیا اشاعتی پروگرام

نئے مجموعے

نفسانے	قدرت اللہ شہاب
؟	سعادت حسن منٹو
شگفتگی	ابوالفضل صدیقی
بیکار دن بیکار راتیں	عزیز احمد
شیشے کے گھر	قرۃ العین حیدر
خدا کی وصیت	بلونت سنگھ
منزل	شفیق الرحمٰن
زوال کے بعد	ریاض الرحمٰن
پناہ گزین	رہبر

ناول

مادام بواری	مترجمہ محمد حسن عسکری
کنوارے کھیت	شولوخوف
طلسم ہوشربا	مرتبہ محمد حسن عسکری
لچیلے پھول	(گیتوں کا مجموعہ)

نئے ایڈیشن

شیشہ و تیشہ	کنہیا لال کپور
گریز	عزیز احمد